افسانہ نمبر
ادب لطیف

افسانہ نمبر

ادبِ لطیف

چوہدری برکت علی، میرزا ادیب، اور قتیل شفائی نے مرتب کیا

مکتبہ — اُردو — لاہور

فہرست

شُمارہ ۱ جِلد ۲۹

حرفِ اوّل

موجودہ دَور ـــــ اُردو ادب کا افسانوی دَور ہے!

اس دور میں نظمیں بھی لکھی گئی ہیں، بہت زیادہ لکھی گئی ہیں۔ اُردو زبان میں اچھی نظموں کی بھی کمی نہیں، ناول بھی معرضِ وجود میں آ رہے ہیں، تنقیدی کتابوں کی بھی کمی نہیں مگر بعض نقادوں کے تنقیدی مقالات دیکھ کر مایوس ہونے کی وجہ نظر نہیں آتی ـــ یہ سب کچھ لکھا جا رہا ہے۔ ادب کی ہر صنف آگے بڑھ رہی ہے لیکن مجموعی لحاظ سے یہ دور اردو ادب کا افسانوی دور ہی کہلاتا ہے۔ کیونکہ آج کل ادب کی یہ صنف باقی اصناف کے مقابلے میں زیادہ صحت مند، زیادہ ترقی یافتہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ ایک قوم کی حیاتِ ذہنی کا ایک خاص دَور ادب کی خاص صنف کیلئے کیوں زیادہ موزوں ہوتا ہے۔ اور اس دَور میں اس صنفِ ادب کے علاوہ باقی اصناف اس قدر ترقی کیوں نہیں کر سکتیں؟

اس کا کوئی نہ کوئی سبب تو ہونا ہی چاہیئے۔ کیونکہ ادب خلا میں پیدا ہوتا نہیں، اور نہ یہ کوئی ایسی چیز ہے جسے خودرو کہا جا سکے۔ ادب کیا زندگی کی کوئی چیز بھی خودرو نہیں ہے۔ اور نہ ہو سکتی ہے۔ ہر چیز ذہنی تخلیق کیلئے مخصوص مادی حالات کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ جب یہ مادی حالات ختم ہو جاتے ہیں تو اس کی تخلیق بھی رک جاتی ہے یا اس میں کوئی نمایاں اور بنیادی تبدیلی رونما ہو جاتی ہے۔

جس طرح ایک قوم کا مخصوص سماجی نظام بنیادی معاشی تبدیلیوں اور ان معاشی تبدیلیوں کے پیدا کردہ حالات کا نتیجہ ہوتا ہے اس طرح ادب کی ایک خاص صنف بھی مخصوص سماجی حالات ہی میں زندہ رہ سکتی ہے، آگے بڑھ سکتی ہے اور نشوونما حاصل کر سکتی ہے!

سامنتی دَور میں دُور از حقائق اور تخیلی قصے فروغ پا سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جاگیرداروں کا ذہن زندگی کی کسی پیچیدگی سے آشنا نہیں تھا۔ بغیر کسی تکلیف کے زندگی کی تمام نعمتیں حاصل ہو جاتی تھیں اس لئے انہیں دل بہلانے کیلئے دلچسپ قصوں اور کہانیوں کی ضرورت تھی چنانچہ اس عہد میں جتنے قصے لکھے گئے وہ پُر از تصنع تشبیہات و استعارات سے مرصع ہیں اور انہیں زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ تخیلی قصے سامنتی دَور کے ساتھ ختم ہو گئے!

ادب وقت کے ساتھ ساتھ قدم اُٹھاتا ہے۔ جیسا ماحول ہوگا ویسا ادب ہوگا۔ جاگیرداری دور ختم ہو چکا ہے، آج کا ادب وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ اب ہمارے یہاں ان طویل اکتا دینے والی فسوں ساز کہانیوں کی ضرورت نہیں جن کا مقصد صرف تفریح تھا اور جنہیں جاگیردار دل بہلاوے کیلئے پڑھتے تھے یا سنتے تھے۔ ان کہانیوں کی تخلیق بھی اسی نقطۂ نظر سے ہوتی تھی۔ آج زمانہ بدل چکا ہے، آج زمانے کے تقاضے کچھ اور ہیں، آج ادب کا نظریہ بالکل بدل چکا ہے۔ آج کے ادب کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ انسانی ذہن کو زندگی کے حقائق کے قریب لائے، پڑھنے والوں کے دلوں میں قنوطیت زدہ تصورات کی جگہ نئے ولولے اور امنگیں پیدا کرے اور زندگی کی ہر اس قدر کی حفاظت کرے جو حسین ہی نہیں صداقت سے لبریز ہے اور جو انسان کو اندھیرے سے روشنی کی طرف لے جاتی ہے۔ آج زندگی بے شمار تلخ اور پیچیدہ الجھنوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ آج انسان کے سامنے لاتعداد اور گوناگوں مسائل منہ پھاڑے کھڑے ہیں آج ہر شخص بے حد مصروف زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ ان حالات میں ضخیم ناولوں کے مطالعے کیلئے وقت نہیں ہے۔ مختصر ترین پاروں کی ضرورت ہے جو مختصر ہوتے ہوئے بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے مکمل اور جامع ہوں۔ اور یہ ضرورت افسانے کے سوا ادب کی کوئی اور صنف پوری نہیں کر سکتی۔ اور یہی سبب ہے جب سے ہمارے ذہن ـــ ادب کی سب سے زیادہ صحت مند تحریک ترقی پسندی سے متاثر ہوئے ہیں، ہمارے افکار کا رُخ یاس انگیز اور بیمار ماحول پرستی سے ہٹ کر زندگی کے تلخ حقائق کی طرف پھر گیا ہے۔ مگر ہمارا افسانہ اس تحریک سے خاص طور پر متاثر ہوا ہے ہیئت کے لحاظ سے بھی اور مواد کے لحاظ سے بھی۔ آج کا افسانہ دُور از کار تخیلات کے چکر سے نکل کر عوامی زندگی کے اس قدر قریب ہو گیا ہے کہ ہم جب کسی صحت مند افسانے کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے نچلے طبقے کا دکھ سکھ بالکل بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اور ہم محسوس کرنے لگتے ہیں کہ یہ خلاکت

اردو مرد اور دل انسان جو اب تک استحصال کی چکی میں بُری طرح پستے رہے ہیں، اب بیدار ہو رہے ہیں۔ اب ان کی آنکھوں میں رحم طلبی کا رنگ یکسر احساس نہیں ہے، بلکہ ان میں قہر و غضب کی بجلیاں کڑک رہی ہیں۔ آج کا افسانہ کچلے طبقوں کی نمائندگی کر رہا ہے۔ اور جب بالائی طبقوں کی طرف دیکھتا بھی ہے تو محض اس مقصد کے لئے کہ اس گرتے ہوئے بوسیدہ نظام کا کھوکھلا پن ظاہر کرے جسے اوپر کے طبقوں نے قائم رکھا ہے۔ مگر جن کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ !

تقسیم ملک کے بعد ہمارے سامنے بے شمار پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے ہیں، اور جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان میں اُردو کا مسئلہ اس وقت بڑی اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ اُردو کیلئے خاص توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل اُردو ادب کی نشو و نما اور ترقی و فروغ کے راستے میں ایسے موانع اور ایسی مشکلات حائل ہو گئی ہیں، کہ ان کے تصور سے ایک خوش فہم سے خوش فہم شخص بھی مایوس ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ظاہر ہے اُردو کا وطن یعنی برصغیر کی سرزمین ہے اور ہندو اور مسلمان کے مشترکہ کلچر کا ایک ایسا اثاثہ ہے جو قطعی طور پر ناقابل تقسیم ہے۔ مگر اس وقت ہندوستانی حکومت کا اُردو کی طرف معاندانہ رویہ اُردو کو اس طرح کچلنے کی کوشش کر رہا ہے جیسے اس زبان کے کچل دینے ہی میں اس کے کلچر کا راز پوشیدہ ہے۔ آج تک کسی حکومت نے بھی ہندوستان کی موجودہ حکومت کی طرح آمرانہ تشدد کے ساتھ اپنے ملک کی عوامی زبان کو کچلنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔ حد یہ ہے کہ بعض مرکزی اور صوبائی دفاتر میں ملازموں کو حکم دے دیا گیا ہے، کہ اگر وہ تین ماہ کے اندر اندر ہندی زبان دیوناگری رسم الخط کے ساتھ نہیں سیکھ سکیں گے تو ان کی ملازمت خطرے میں پڑ جائے گی! یہ تو ہے ہندوستانی حکومت کا مشترکہ کلچر کے ناقابل تقسیم اثاثے کے ساتھ رویہ، ہمیں فی الحال اس رویے کے بارے میں کچھ نہیں کہنا، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اس وقت ہندوستان کے سیاسی کارپردازوں کے پیش نظر کس قسم کی ذہنیت کارفرما ہے؟ اس سے کسی معاملے میں بھی خوشگوار توقعات قائم رکھنا اپنے آپ کو دھوکا دینے کے مترادف ہے! ہمیں آج جو کچھ کہنا ہے وہ سرزمین پاکستان میں اُردو کی حالت کے بارے میں ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہو کہ ابھی تک ہمارے عوام معاشی الجھنوں کے ایسے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں کہ وہ انتہائی خواہش کے باوجود زندگی کی ان قدروں کی طرف توجہ نہیں کر سکتے جو زندگی میں حسن، ترتیب اور توازن پیدا کرتی ہیں۔ یہ حقیقت زندگی کی ایک اٹل حقیقت ہے کہ جب تک شکم کے تقاضے پورے نہ ہو جائیں انسان فنون لطیفہ میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں لے سکتا۔ دو سال گزر چکے ہیں مگر بے روزگاری کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہو سکا۔ اقتصادی پیچیدگیاں لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی ہیں۔ روزمرہ کی ضروریات کی قیمتوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے ادب ملک کی اقتصادی حالت کے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتا ہے۔ جیسی اقتصادی کیفیت ہوگی ویسی ادب کی حالت ہوگی۔ اور ہمارے نوزائیدہ ملک کی معاشی حالت جیسی ہے ظاہر ہے۔ ایسی حالت میں لوگوں سے یہ امید رکھنا کہ وہ ادبی کتابیں اور رسائل خریدیں ۔۔۔ بڑی غیر منطقی بات معلوم ہوتی ہے!

یہ تو ہے عوام کی معاشی کیفیت اب دوسرے امور کی طرف توجہ کیجئے! کاغذ کی گرانی بھی ایک پریشان کن مسئلہ بن گیا ہے۔ دوسرے ملکوں کی نسبت پاکستان میں کاغذ مہنگا بک رہا ہے۔ ڈاک خرچ کے لحاظ سے بھی ہمارے ملک کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ شاید کسی جمہوری ملک میں بھی کتابوں کی برآمد پر اتنی ڈیوٹی نہیں ہے جس قدر ہمارے ہاں ہے۔

پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں رسائل و جرائد کی فروخت کے لئے ابھی تک ایجنسیاں ہی قائم نہیں ہو سکیں۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے پاکستان کے ایک شہر میں رہنے والے پاکستان کے کسی دوسرے شہر سے شائع ہونے والے ادبی رسالے کو بھی نہیں خرید سکتے کیونکہ عام طور پر ہمارے ایجنسیوں کا انتظام سخت ناقص ہے اور جو لوگ بک سٹالوں سے پرچے خریدنا پسند کرتے ہیں، بعض اوقات انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہو سکتا کہ فلاں ادبی رسالہ شائع بھی ہوا ہے یا نہیں! ۔۔۔ ادب کے فروغ کے سلسلہ میں یہ کیفیت کس قدر افسوسناک اور الم انگیز ہے۔

حکومت بارہا اعلان کر چکی ہے کہ اُردو کو پاکستان کی قومی زبان بنایا جائے گا، اور یہی زبان ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال کی جائے گی مگر اس سلسلے میں ابھی تک حکومت نے کوئی قابل ذکر اور امید افزا قدم نہیں اٹھایا! صرف اعلانات سے تو اُردو زبان اور اُردو ادب وہ حیثیت حاصل نہیں کر سکتی جو اسے پاکستان میں حاصل ہونی چاہئے۔

علاوہ ازیں وہ رکاوٹیں جن کا ذکر بارہا ادب لطیف کے صفحات میں کیا جا چکا ہے، اہل نظر ان سے ناآشنا نہیں ہیں ۔۔۔ آج ہمیں ایک اور معاملے کی طرف بھی توجہ دلانا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے ہم ایک خاص اصول کی خاطر اس معاملے کی طرف توجہ کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

دنیا کی ہر جمہوری حکومت کام کرنے والے پبلک اداروں کی ہر ممکن طریقے سے ہمت افزائی کرتی ہے مگر ادبی رسائل کے بارے خاص میں ہماری حکومت نے جو رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ عجیب قسم کا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ حکومت نے وزارت اطلاعات کراچی سے ماہِ نو کے نام سے جو رسالہ شائع کر رکھا ہے، وہ قدم قدم پر ملک کے ادبی رسائل کا مقابلہ کر رہا ہے اور انہیں نقصان پہنچا رہا ہے۔ اگر حکومت ملکی امور یا اپنی خاص تجاویز و عزائم کی نشر و اشاعت کیلئے کسی رسالے کا اجرا کرتی تو کسی کو بھی اعتراض کرنے کا موقع نہ تھا۔ حکومت بخوشی اپنا پراپیگنڈا کر سکتی ہے، مگر ماہِ نو اپنی پالیسی کے لحاظ سے ایک ادبی رسالہ ہے جس کے ہر شمارے میں ادبی موضوعات سے متعلق مضامین کی تعداد پراپیگنڈائی مضامین کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتی ہے، اسلئے ہم اسے ادبی رسالہ ہی کہیں گے اور لوگ بھی اسے ادبی رسالہ ہی سمجھتے ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ اس کی گٹ اپ نہایت شاندار اور دیدہ زیب ہوتی ہے۔ کاغذ نہایت اعلیٰ استعمال کیا جاتا ہے اور رسالے میں تصویریں بھی شائع کی جاتی ہیں۔ اور ان تمام خوبیوں کے باوجود اس کی قیمت آٹھ آنے فی شمارہ ہے اس کی ہر کاپی پر غالباً ڈیڑھ دو روپیہ خرچ آ جاتا ہے۔ حکومت اس کی ہر کاپی آنے میں بھی بیچ سکتی ہے کیونکہ اس پر جتنا خرچ ہوتا ہے وہ پبلک کے خزانے سے لیا جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ملک کے دوسرے ادبی رسائل کیا کریں اگر حکومت بھی اپنے لامحدود ذرائع اور بے پناہ اختیارات سے فائدہ اٹھا کر پبلک کی امداد سے ان کا مقابلہ شروع کر دے تو انجام کیا ہوگا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ حکومت یہ بھی تو ظاہر نہیں کرتی کہ ماہِ نو حکومت کا پرچہ ہے یعنی سرکاری پرچہ ہے۔ اس کے سرورق پر اس کے متعلق کوئی اشارہ بھی نہیں ہوتا۔

سید احتشام حسین

مختصر افسانہ میں نفسیات کا عنصر

تخلیقی اور تنقیدی ادب میں نفسیات کا عمل حیرت خیز شکل میں داخل ہوتا ہے۔ ایک طرف ادب میں خود ادیب کی نفسیاتی زندگی اور طبعی رجحان کا داخل ہو جانا ضروری ہوتا ہے، دوسری طرف لکھنے والا اپنے کرداروں کی نفسیات سے کام لیکر اپنے مقصد کو واضح کرنے کی جو کوشش کرتا ہے اس سے پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن اس مختصر مضمون نویسی میں مصنف یا افسانہ نگار کے نفسیاتی عوامل سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ مختصر افسانہ میں کرداروں کی نفسیاتی کیفیت کے اظہار کے طریقوں اور امکانات پر نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ بات پیش نظر ہے کہ افسانہ نگار کی نفسیات کو کرداروں کی نفسیات سے مکمل طور پر الگ کرکے دیکھنا ممکن نہیں ہے لیکن سوال زور دینے کا ہے یہاں افسانے میں نفسیات کے عمل پر زور دیا جائیگا۔ افسانہ نگار پر نہیں۔

مختصر افسانہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو اپنی گیرائی اور حد بندی کے لحاظ سے زندگی کے چند ہی عناصر پر مبنی اور چند ہی پہلوؤں تک ہو سکتا ہے۔ اس کے مختصر خاکے میں چند کردار، چند واقعات اور چند مناظر سے زیادہ نہیں سما سکتے۔ پھر چاہے کسی مخصوص تکنیک کی پابندی نہ بھی کی جائے تو وحدتِ زمان و مکان اور وحدتِ تاثر کا کسی نہ کسی حد تک خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔ اسلئے افسانہ نویس کو کبھی کبھی بہت دشوار گزار راستوں سے گزرنا پڑتا ہے وہ اپنے مقصد کے اظہار کے لئے کرداروں کی گفتگو اور عمل کے ایک نقطہ یا ایک پہلو کو بھی بیکار جانے کا موقع نہیں دے سکتا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مختصر افسانے میں عمل کے مواقع کم ہی آتے ہیں، اُن چند مواقع سے کبھی کبھی تو مقصد کی بے پایاں وضاحت ہو جاتی ہے لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے ذرائع سے کام لینا پڑتا ہے۔ تاکہ جو کچھ کہنا ہے اس میں تشنگی کا احساس باقی نہ رہ جائے۔ ایسی صورت میں افسانہ نگار اپنی طرف سے کرداروں کی نفسیاتی کیفیات کا تجزیہ کرتا ہے۔ یوں تو مکالمہ اور عمل میں ہر جگہ نفسیاتی کیفیات کے اظہار کے مواقع آتے رہتے ہیں۔ لیکن عمل کی کمی کو نفسیاتی اظہار سے پورا کرنے کی کوشش ایک خاص شکل اختیار کر لیتی ہے۔ عمل کیلئے زمان و مکان دونوں کی ضرورت ہوتی ہے، کیفیات کے ذہنی بیان کے لئے ان کی طنابیں کھینچ کر چھوٹی کی جا سکتی ہیں۔ بلکہ ایک ہی جگہ لائی جا سکتی ہیں چنانچہ وقت کے پھیلاؤ کو سمیٹنے کیلئے کردار کا نفسیاتی تجزیہ ایک عام تکنیک کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ افسانہ نگار کردار کے خیالوں کے ساتھ ماضی، حال اور مستقبل سب کی سیر کرتا ہے۔ اور اس کی بہت سی خصوصیات کو اس طرح نمایاں کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جس منزل تک پڑھنے والوں کو لے جانا چاہتا ہے۔ یا جس مقصد کو پیش کرنا مد نظر ہے۔ اس میں مدد ملے۔ فنی حیثیت سے یقیناً یہ بہت مشکل مقام ہے۔ کیونکہ مقصد کے بغیر کوئی اعلیٰ تخلیق ناممکن ہے اور مقصد کے بھدّے اظہار سے فن کا خون ہو جاتا ہے تمام دنیا کے قدیم اور جدید اعلیٰ ادب کی یہی خصوصیت رہی ہے۔ کہ لکھنے والے کا پورا نقطہ نظر پوری طاقت اور پوری ادبی لطافت کے ساتھ ادب کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

اس موقعہ پر جیمس جوائس کا خیال آتا ہے جس نے آرٹ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے "آرٹ اس فنی تعبیریت کا نام ہے۔ جس کی مدد سے آرٹسٹ کسی چیز کو کسی چیز پر ترجیح یا زور دیئے بغیر سب کچھ ایک ہی لمحہ میں ظاہر کر دیتا ہے" جہاں جوائس اپنی مفروضہ عدم مقصدیت کا اظہار کرنا چاہتا ہے ـــ کسی چیز کو کسی چیز پر ترجیح دینا یا کسی بات پر زور دینا ـــ یہ دونوں باتیں گویا ادیب کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ زندگی کے اہم مسائل اور مخالف یا متضاد تصورات میں سے بعض کو رد کرے اور بعض کو قبول کرے۔ جوائس اس بات سے گھبراتا ہے، اسی لئے وہ ایک ہی لمحہ میں ہر چیز کے اظہار پر زور دیتا ہے اور اسی کو آرٹ قرار دیتا ہے۔ حالانکہ اگر منطقی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ خود ایک طرح کی یک طرفہ راستہ ہے۔ جو آرٹ کے معاملہ میں کسی خاص نقطہ نظر کو قبول کرتی ہے۔ اور کسی دوسرے کو غلط قرار دیتی ہے یہاں

جیمس جوائس کے فلسفۂ خیال کی تنقید مقصود نہیں لیکن یہ ضرور ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ عدم مقصدیت ایک طرح کا فریب ہے۔ ادیب کا مقصد کسی نہ کسی طرح اُس کے تخلیقی یا توضیحی کارناموں میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس لئے جب کوئی مثبت یا منفی مقصد خیال کا جزو لازم ہے۔ تو مختصر افسانے کی بناوٹ، کرداروں کے بننے بگڑنے اور افسانے کے اختتام تک پہونچنے پر بھی اس کا اثر ہونا لازمی ہے۔ یہیں نفسیات کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ افسانہ کے کردار کیا سوچتے ہیں، اُن کے ذہن میں خیالات کس طرح آتے ہیں، کہاں سے آتے ہیں، اور کس طرح افسانے کا جزو بن جاتے ہیں؟ افسانہ نگار اپنے کرداروں کے ذہن کو کھول کر پڑھنے والوں کے سامنے اس لئے رکھ دینا ضروری سمجھتا ہے کہ اُن کے اعمال اور حرکات اُن خیالوں کی روشنی میں پرکھے جاسکیں۔ افسانہ نگار اس طرح ذہین قاری اور ناقد کے ہاتھ میں ایک پیمانہ بھی دے دیتا ہے جس کی مدد سے وہ اُس کے کرداروں کے عمل اور ذہن میں تطابق کی جستجو کرتی ہے۔ اور عمل اور خیال کے تعلق کو ناپ سکتا ہے۔

افسانوں کے کردار عام طور سے ایسے انسان ہوتے ہیں، جن کی ذہنی کیفیت سے ہم جلد واقف ہو سکتے ہیں، کبھی کبھی وہ غیر معتدل اور مریض ذہن رکھنے والے کردار بھی ہو سکتے ہیں، جن کے خیالوں کا بہاؤ عام انداز معتدل یا نارمل افسانوں سے مختلف ہوگا۔ ان کا سمجھ لینا بھی کچھ ایسا دشوار نہ ہوگا۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار اپنے کردار کے ذہن میں جو خیالات دکھاتا ہے، اُس کی جو نفسی کیفیت بیان کرتا ہے۔ وہ اُس کردار کے مادی وجود سے مطابقت رکھتی ہے یا نہیں۔ تقریباً پندرہ سال سے اردو میں لوگوں کو فرائڈ اور تحلیل نفسی سے واقفیت ہوئی ہے۔ یہ واقفیت عالمانہ یا ناقدانہ نہیں ہے۔ بلکہ محض چند موٹے موٹے اشاروں کی معلومات تک محدود ہے۔ جنس اور لاشعور کی خصوصیت کے ساتھ افسانوی ادب میں جگہ ملی ہے اور اُن کے جا و بے جا اظہار نے بہت سے افسانوں کو گورکھ دھندا بنا دیا ہے۔ میرے پیش نظر ادب میں تجزیہ نفس سے کام لینے یا فرائڈ کی نفسیات کو پرکھنا نہیں ہے۔ بلکہ مختصر افسانے میں لاشعور سے کام لینے کا مسئلہ ہے۔ جس نے شعر و ادب میں بہت سی الجھنیں بڑھا دی ہیں۔ انسان خاص قسم کے مادی اور سماجی حالات میں جس طرح سوچتا ہے۔ اُس کا سمجھنا مشکل نہیں۔ لیکن جو کچھ اُس کے لاشعوری ذہن میں گھر کر رہا ہے اُس کا باہر نکالنا افسانہ نگار اپنے ذمہ لیتا ہے۔ اور اُس کے ذہن میں وہ باتیں بھر دیتا ہے۔ جن کا بظاہر کوئی سبب معلوم نہیں ہوتا۔ لاشعور کے نام پر افسانہ نگار بہت سی غیر متعلق باتوں کو متعلق کر دیتا ہے اور چونکہ اس کی بنیاد مادی یا سماجی شعور پر نہیں ہوتی۔ اس لئے جدھر چاہتا ہے، خیالوں کی باگ موڑ دیتا ہے اور اُس کے جانچنے یا پرکھنے کا کوئی خاص ذریعہ نہ ہونے کی وجہ سے ایک معتدل ذہن اور جذبات رکھنے والا اُس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ تجزیہ نفس سے دلچسپی رکھنے والے ناقد اسے بھی حقیقت نگاری کہتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو لاشعور ہی کے تجزیہ کو حقیقت میں شمار کرتے ہیں۔ کیونکہ شعور اور لاشعور میں ایک اور دس کی نسبت ہے۔ حقیقت کے جانچنے کا طریقہ سائنس اور فلسفہ دونوں میں یہی ہے کہ وہ تجربہ میں آسکے۔ اور اُس کا وجود مادی حیثیت رکھتا ہو۔ لاشعور کا وجود مادی اور سماجی نہیں، جبلی اور وجدانی رہ جاتا ہے۔ جہاں انسان اپنے افعال اور خیالات کے معاملہ میں مجبور اور بے بس ہو جاتا ہے۔ سائنٹیفک نفسیاتی مطالعہ کی مدد سے اُن چیزوں کا مطالعہ بھی مادی اور سماجی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ جنہیں لاشعوری کہا جاتا ہے۔ مگر تحلیل نفسی کی زلفوں میں اسیر ہو جانے والے اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے وہ کوشش کر کے ذہنی کیفیات اور سماجی پس منظر کو بے تعلق کر دیتے ہیں۔

"شعور کا بہاؤ" خیالات کی رفتار میں ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اس بہاؤ کو روک کر فن کار یا افسانہ نگار کو اپنے کام کی چیزیں لے لینا اور انہیں اپنے مقصد کے سانچے میں ڈھال لینا چاہیئے۔ ورنہ کردار کے عمل اور خیال میں مطابقت باقی نہ رہے گی۔ اور وہ مقصد بھی حاصل نہ ہو سکے گا۔ جس کے لئے ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ تخلیق ہی کے وقت افسانہ نگار اپنی قوت فیصلہ کا اظہار کر سکتا ہے

خیال کا وجود انسانی وجود سے باہر کوئی چیز نہیں اور وہ خیال جو کرداروں کے ذہن میں گزرتا ہے۔ افسانے کے عمل سے ماورا نہیں ہو سکتا۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ کردار کا ذہن اپنے مادی وجود اور ماحول کے مطابق ہی عمل کر سکتا ہے۔ اگر افسانہ نگار وہ خارجی پس منظر فراہم نہیں کرتا جس سے کردار کا ماحول متعین ہو سکے اور اُس کی ایسی نفسیاتی کیفیتیں پیش کرتا ہے جن کے لئے مخصوص ماحول اور ترتیب واقعات کی ضرورت ہے وہاں اُس کا فن پڑھنے والوں کے دل میں شکوک اور سوالات پیدا کرے گا جن کے واضح جواب فراہم نہ ہو سکیں گے۔ خارجی اور داخلی ماحول اس مطابقت کی کمی رومانی اور تخیلی انداز نظر رکھنے والوں کی نگاہ میں عیب نہ ہو لیکن اسباب اور اُن کے نتائج پر غور کرنے والے کبھی آسودہ نہ ہو سکیں گے۔ یہ ایک طویل بحث ہے۔ کہ خیالات کس طرح پیدا ہوتے ہیں۔ اور مختلف الخیال فلسفیوں نے اس کا جواب مختلف طریقوں سے دیا ہے لیکن آج جس تصور کو اہمیت حاصل ہے وہ یہی ہے کہ انسان کے خیالات اُس کی زندگی کی حقیقتوں سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ حالات سے بے نیاز ہو کر محض خیالات کی دنیا میں چلا جاتا ہے اُس وقت بھی وہ منفی صورت میں حقائق کے قریب ہوتا ہے۔ خارجی پس منظر کے بغیر نفسیات کا تصور بے حقیقت ہے۔ اس لئے جس افسانے میں خارجی حالات کی طرف واضح اشارے نہیں پائے جاتے۔ وہاں نفسیات کے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ اگر خارجی حالات اور ماحول کا صحیح نقشہ پیش کر دیا جائے تو متضاد جذبات اور متصادم خیالات بھی پیش کر کے نبھائے جا سکتے ہیں۔ اور تلازمۂ ذہنی کی مدد سے خیالات کو کہیں سے کہیں پہونچایا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ افسانہ نگار اپنے موضوع اور مقصد سے دور نہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ خیالوں کی دنیا بہت وسیع ہے اور افسانہ نگار اُن سے بڑا کام لیا اور لے سکتا ہے، سوال یہ ہے کہ افسانہ نگار جب نفسیات کا استعمال کرتا ہے اور اپنے کرداروں کے ذہن میں چند باتیں ٹھہراتا ہے۔ تو وہ محض کرداروں کے جدلان کا خیال رکھتا ہے یا اُس ذہنی رابطہ کا جو خیالوں کا محرک ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ فرد کی نفسیات کو محض فرد کے خیالات کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ یا ان خیالوں کے سماجی اور ماحولی پس منظر کو بھی سامنے رکھتا ہے، خیالوں کی انفرادی بنیاد اتنی کھوکھلی اور بے معنی ہوتی ہے۔ کہ وہ کچھ دور تک افسانہ نگار کے مقصد کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ چند عضویاتی نفسی کیفیات کے سوا ہر نفسی کیفیت سماجی حیثیت رکھتی ہے۔ محض جبلت کے سہارے کرداروں کو عمل کا پتلا بنانا ایک بے سود کوشش سے زیادہ نہیں کیونکہ جدید تجرباتی نفسیات میں جبلی اور وجدانی حرکات کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے۔ یہ بات ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح انسان کا عمل امکانات سے متعین ہوتا ہے۔ اُسی طرح اُس کے خیالوں کو بھی امکانات کا پابند ہونا چاہیئے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ عمل کے مقابلہ میں خیال زیادہ آزادی سے امکانات کی حدوں کے اندر وہ فضا پیدا کر سکتا ہے۔ جو وہ چاہتا ہے۔ لیکن خیال کو بھی ناممکن الوقوع نہیں ہونا چاہیئے۔ افسانہ میں نفسیات کے عنصر کو جس پہلو سے بھی دیکھا جائے۔ نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ کرداروں کی نفسیاتی کیفیت اُن خارجی حالات کی پابند ہوتی ہے۔ جن میں وہ گھرے ہوئے ہوتے ہیں یا جو اُن کو عمل پر اکساتے ہیں۔ معمولی اعصابی حرکات کی بنیادوں کا پتہ نہ چل سکے۔ لیکن انسان کے اعمال اور افعال کا مسلسل غیر شعوری حرکات کا نتیجہ ہونا سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ کسی پاگل بیمار یا غیر معتدل کردار کی ذہنی کیفیت دکھانے میں سماجی بنیادوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن معتدل انسان کی نفسیات کا بھی معتدل ہونا ضروری ہے اور ہیجانی مواقع پر بھی اُسکے عمل کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔

طبقاتی سماج میں جس طرح ادب، فلسفہ، قانون، سیاست اور اخلاق کی نوعیت طبقاتی ہوتی ہے۔ اُسی طرح نفسیات کا طبقاتی رنگ میں رنگ جانا ضروری ہے۔ یہاں معتدل اور معتدل انسانوں میں اپنی نفسیاتی کیفیت کے لحاظ سے فرق ہو جاتا ہے۔

لاشعوری اور رسمی نفسیات کا دلدادہ کہتا ہے کہ بنیادی طور پر تو سب کی نفسیاتی کیفیت یکساں ہوتی ہے لیکن جب وہ مادی اور خارجی حالات کی روشنی میں دو یکساں واقعات کو دیکھے گا تو طبقاتی فرق واقعات کے اثر میں اور اُن کے ردِ عمل میں زبردست اختلاف ظاہر کرے گا۔ اعلیٰ طبقہ کا ذہن اپنے سماجی وجود سے متعین ہوتا ہے۔ اور متوسط طبقہ کا ذہن اپنے سماجی وجود سے، مزدور اور کسان کا دماغ اپنے معاشی رابطہ کی وجہ سے دوسری طرح کام کرتا ہے۔ مخصوص حالات میں اُن کا مخصوص شکل میں سوچنا ہی ممکن ہے۔ وہ اپنی مادی زندگی کی حدوں میں خیال آرائی کرتا ہے اور خیالات کی انتہائی پرواز میں بھی امکانات کے منطقی حدود ہی میں رہتا ہے۔

لفظ اور معنی میں جو تعلق ہے، لفظوں سے جو معنوی علامتیں وابستہ ہیں، مناظر کے بیان میں جو جذباتی تہیں ہوتی ہیں۔ تھوڑا بہت اُن سے بھی کام لیا جا سکتا ہے (حالانکہ اُن کی زیادہ ضرورت شاعری میں پڑتی ہے)، لیکن یہ بھی شعوری ہوتی ہیں اور افسانہ نگار انتخاب کی قوت سے کام لے کر ہی وہ فضا پیدا کر سکتا ہے جو اُس کے کرداروں کی حقیقی مادی اور ذہنی زندگی سے ہم آہنگ ہو لفظ اور معنی میں کوئی ایسا انوکھا تعلق پیدا کرنا، ایسی علامتیں بنانا یا لفظوں سے ایسی مصوری کرنا جو سماجی حیثیت نہ رکھے افسانہ نگار کے لئے مناسب نہیں۔ کیونکہ اس طرح بھی وہ اپنے مقصد سے دور جا پڑے گا۔ اور وہ تخلیقی ادب کے بجائے ایک معمہ دے جائے گا۔ جسے پڑھنے والے حل کرتے رہیں گے۔

آج نفسیات کا مقصد کیا ہے؟ تاریخ، جغرافیہ، بشریات، اقتصادیات اور حیاتیات سے مسالہ لے کر ایک ایسی سماجی نفسیات کی تشکیل کرنا جس میں فرد کا عمل مرکب اور پیچیدہ تہذیبی اور طبقاتی زندگی سے اُس کے تعلق کا اظہار کرے۔ یہاں فرد فرد بھی رہتا ہے اور سماج کا ایک حصہ بھی، اُس کی نفسیاتی کیفیت انفرادی ہوتے ہوئے بھی اُس طبقاتی اور سماجی تعلق کا اظہار کرے گی جس سے باہر رہنا یا کم سے کم مکمل علیحدگی ناممکن ہے۔ یوں افسانوں میں جہاں فرد کا رشتہ سماج سے کٹ جاتا ہے اُس کی نفسیاتی کیفیت کا محض میکانکی اظہار رہتا ہے، اُس کی زندگی کے مادی معاشی اور ذہنی روابط نمایاں نہیں ہوتے یا لاشعور کے متعلق قیاس آرائیاں ہوتی ہیں۔ وہاں افسانے میں حقیقت اور صداقت کے عناصر بہت کم ہوتے ہیں اور نفسیات انسانی وجود سے باہر کی چیز معلوم ہونے لگتی ہے۔

• • •

ممتاز حسین

افسانوی ادب کے بنیادی رجحانات

یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ اُردو کے نئے افسانوی ادب کی ابتدا ترقی پسند تحریک کے جلو میں ہوئی۔ سالِ رواں اس تحریک کی زندگی کا چودھواں سال ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس بارہ نیم ماہ میں کتنی چمک اور کتنے دھبے ہیں۔ اس میں کتنی حقیقت اور کتنا رومان ہے۔ کتنا انحطاط اور کتنی ترقی پسندی ہے۔ چونکہ ایک مختصر سے مضمون میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ہر ایک افسانہ نگار کی تحریروں کا جائزہ لیا جائے۔ ہم صرف ان بنیادی رجحانات کو پیش کریں گے جن سے کہ ہمارا افسانوی ادب اب تک گھومتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں جو نام بھی آئینگے۔ وہ صرف رجحانات کی ترجمانی کرینگے۔

ترقی پسند تحریک اس وقت وجود میں آتی ہے جبکہ مزدور اور کسان کی تحریک ہمارے ملک میں کافی اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس تحریک کا انقلابی دباؤ بورژوا طبقے کو بدیسی سامراج کے خلاف آگے بڑھنے میں مدد کرتا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے ۱۹۳۵ء کا نیا قانون انقلابی قوتوں کے دباؤ ہی سے حاصل کیا گیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء میں جب نئے قانون کے ماتحت وزارتیں بنیں تو ساری قوم میں ایک نئی بیداری کا احساس پیدا ہوا۔ اگر ایک طرف بورژوا طبقہ اپنے استقلال کی کوشش کرتا ہے تو دوسری طرف مزدور بڑے پیمانے پر ہڑتالیں کرتے ہیں۔ بورژوا طبقہ کے استقلال کے حق میں اس تحریک کا کچلنا ضروری تھا۔ چنانچہ کانگریسی وزارتوں نے کانپور اور بمبئی میں مزدوروں پر .... گولیاں چلائیں۔ متوسط طبقے کے ادیبوں اور دانشوروں میں اس تشدد کے خلاف ایک شدید قسم کا ردِ عمل پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس ردِ عمل کی تصویر گنجلک رہتی ہے۔ وہ کبھی کانگریس کو برا کہتے ہیں۔ تو کبھی بدیسی سامراج کو۔ وہ کانگریس، بورژوا طبقہ اور بدیسی سامراج کے باہمی رشتوں کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

یہ گنجلک تصویر آپ کو اس دور کی تمام کہانیوں میں ملے گی۔ ان کہانیوں میں بدیسی سامراج کے خلاف شدید قسم کی نفرت کا اظہار ہے۔ سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف بغاوت ہے۔ لیکن سرمایہ داری مغرب کی شہنشاہیت کے ہم معنی ہو جاتی ہے۔ اس وقت کے افسانہ نگار اپنے ملک کے بورژوا طبقے کے کردار اور کانگریس کے طبقاتی کردار کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اور یہی وہ سبب ہے کہ چھوٹے پیٹ قسم کے مزدوروں کی زندگی کو تو پیش کیا گیا ہے۔ لیکن منظم مزدور طبقے کی زندگی کو پیش نہیں کیا گیا ہے۔ اگر قومی زندگی کے طبقاتی شعور کا احساس ملتا ہے تو وہ صرف ان کہانیوں میں ہے جن میں کسانوں کو زمینداروں اور مہاجنوں کے خلاف اکسایا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ بورژوا طبقہ جب بھی آگے بڑھتا ہے تو وہ کسانوں ہی کے رسالوں سے اپنی فوج تیار کرتا ہے کیونکہ کسان طبقہ بنیادی اعتبار سے ادنیٰ ملکیت کا حامی ہوتا ہے۔ لیکن اس فوج میں بھرتی کرنے سے پہلے انہیں جاگیردارانہ نظام کے زمینی رشتوں سے آزاد کرنے کی ضرورت بھی پڑتی ہے

کانگریس نے خواہ زبانی ہی سہی ایسے پروگرام ضرور رکھے جن سے پرانے زمینی رشتے ختم کئے جا سکتے تھے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ بورژوا طبقے نے مزدوروں کی انقلابی جنگ کو اپنی لڑائی میں استعمال نہیں کیا۔ لیکن یہ کہنا چاہتا ہے کہ بڑی احتیاط اور روک تھام کے ساتھ۔ کیونکہ قومی آزادی کی جنگ میں اسے اپنے طبقے کی قیادت کو برقرار رکھنے کا سوال تھا۔ ہمارے ملک کی ترقی پسند تحریک چونکہ اس چال کا تدارک نہ کر سکی

وہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہیں کہ بورژوا طبقہ اس ملک میں بھی جمہوری انقلاب لائیگا۔ چنانچہ وہ بورژوا طبقے کی قیادت میں ہی قومی آزادی کی جنگ کو آگے بڑھاتے رہے۔ ایسی صورت میں طبقاتی شعور کا دبنا لازمی تھا۔ اور جس حد تک ترقی پسندوں کے متحدہ محاذ میں اس شعور کی کمی رہی وہ اپنے ملک کی استحصالی طاقتوں کو بے نقاب نہ کر سکے۔ اسکے پروگرام میں ازالۂ جاگیرداری اور سرمایہ داری تو ضرور رہی لیکن اس کی حیثیت نعروں سے زیادہ نہیں تھی۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی پسند ادب میں مزدور تحریک ہمگیر نہ بنی اور جب نہ بنی تو پھر تو انقلاب کے تصور کا رومانوی ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ ہمارے فسانہ نگاروں نے جب بھی انقلاب کا خواب دیکھا تو انہیں معنوں میں کہ انسان کب آزاد ہوگا۔ محبت کب آزاد ہوگی۔ انہیں اس سے سروکار نہ تھا کہ انسانیت کو آزاد کرنے والا طبقہ کونسا ہے اور آزاد محبت کا تصور کس نظام کا دیا ہوا ہے۔

ان کے اس خواب میں اس ادھورے بورژوا انقلاب کی پرچھائیاں بھی تھیں جو بدیسی سامراج کے آنے اور مشینی پیداوار کے باعث ظہور پذیر ہو چکا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ دیسی بورژوا طبقہ اس انقلاب کو اور بھی آگے لیجاتا۔ اگر بدیسی سامراج پرانے جاگیردارانہ نظام کو اپنے سامراجی استحکام کیلئے زندہ رکھنے کی کوشش نہ کرتا تاہم یہ کہنا صحیح ہے کہ بہت بڑی حد تک بورژوا نظام کے تصورات جاگیردارانہ نظام کے تصورات پر فتح پا چکے تھے۔ خاندانوں کی اکائیوں کی جگہ افراد کی اکائیوں نے لے لی تھی۔ انفرادی زندگی کی آزادی، محبت کی آزادی، شادی بیاہ کی آزادی، خیال اور عقیدے کی آزادی۔ اور ملکی آزادی کا جذبہ۔ یہ تمام چیزیں ہمارے معاشرے میں آچکی تھیں، لیکن جس حد تک بورژوا انقلاب ادھورا اور دبا دبا سا رہا۔ اس کی آزادیاں بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی رہیں۔ ان آزادیوں کا تصور عام نہ ہو سکا۔ بالخصوص آزادی اور غلامی کی اس کشمکش کو متوسط طبقے نے بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے

ایسا کیوں ہے کہ ان تمام آزادیوں میں محبت کی آزادی کو ہمارے افسانوی ادب میں ایک غیر معمولی جگہ ملی ہے۔ اس کا بھی سبب وہی ادھورا بورژوا انقلاب ہے۔ ملوں اور کارخانوں کے کھلنے سے جو ذرائع پیداوار اور پیداوار کے رشتوں میں تبدیلی ہوئی۔ اس نے نئے سماجی رشتوں کو بھی جنم دیا۔ لیکن چونکہ بہت حد تک ذرائع پیداوار پر بدیسی سامراج کا تصرف رہا۔ اور اس نے جاگیردارانہ نظام سے رشتوں کو قائم رکھ کر صنعتی پیداوار کو بڑھنے سے روکے رکھا۔ یہ پابندی، یہ رکاوٹ، بورژوا نظام کے سماجی رشتوں پر بھی اثر انداز نہ ہوتی — ہماری زندگی میں بورژوا نظام کی لائی ہوئی آزادیاں جگہ نہ پا سکیں۔ زندگی کی اس کشمکش کو دور کرنے میں بدیسی سامراج سے ٹکر لینے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ہمارے متوسط طبقے کے وہ ادیب جو اس جنگ میں سیاسی شعور کے ساتھ آگے بڑھنا نہیں چاہتے تھے، محبت کے موضوع کو منتخب کر کے اگر ایک طرف اپنی غیر سیاسی زندگی کا ثبوت دیتے ہیں تو دوسری طرف انقلابی بنے رہتے ہیں۔ جاگیردارانہ نظام کے ازدواجی اور جنسی رشتوں کے خلاف سرمایہ دارانہ نظام کے ازدواجی اور جنسی رشتوں کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اس میں عورت مرد دونوں ہی بڑھتے ہیں۔ دونوں ہی محبت کے جذبات کی پوجا یا پرستش کرتے ہیں۔ دونوں ہی ایک تیر میں پیوند ہو کر کہیں دور کسی پہاڑی کے نیچے چلے جاتے ہیں۔ یہ تو ہوا اس موضوع کا رومانوی پہلو جو حقیقت میں ترقی پسندی کے دور سے پہلے کی چیز ہے۔

ترقی پسندی کے دور میں تو ہمارے متوسط طبقے کے مصنفوں نے روح کی کسک سے عاجز آ کر جسمانی تقاضوں ہی کو کبھی اصلی رنگ میں تو کبھی فرائیڈ کی عینک سے پیش کیا ہے۔ روحانی لذت کے تعاقب کے بعد اس قدر جلدی سے جسم کے تقاضوں کی طرف جھک پڑنا اس بات کو بتاتا ہے کہ ہمارا معاشرہ نہ صرف مغرب کے خطوطی سرمایہ دارانہ نظام کی قدروں سے متاثر ہو رہا ہے بلکہ بورژوا نظام کی ترقی پسند قدروں کو بھی ذہنی زندگی میں عملی محسوس کرنے لگا تھا۔ کیونکہ قدروں کے خارجی اور داخلی اظہار کیلئے مادی وسائل نہ تھے۔ محبت کی آزادی کے ردعمل میں آزاد جنسی زندگی کا رجحان اس حقیقت کو واضح کرتا ہے۔ لیکن یہ رجحان کسی فلسفے کے ناممکن تھا۔ لامحالہ جنس نگاروں کو فرائیڈ کا سہارا لینا پڑا۔ ایک ایسے

دور میں جبکہ مزدور کسان تحریک سماجی انقلاب کیلئے ہمارے سماجی شعور کو بیدار اور منظم کر رہی تھی۔ اس فلسفے کی تبلیغ قطعی رجعت پسند تھی۔ یورپ میں اس فلسفے کو فروغ ہی اسی لئے دیا گیا تھا کہ عام محنت کش انسانوں کا سماجی شعور کمزور رہے۔ سماجی انسان کی نفسیات کو ایک ہی جذبے میں مقید کر دینا اور اس جذبے کو سماجی رشتوں سے تبدیل ہونے سے لاتعلق بنا دینا انتہا سے زیادہ رجعت پسند فلسفہ ہے۔

اگر اس زمانے میں بھی کرشن چندر اس فلسفے سے متاثر نہیں ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی بورژوا انسان دوستی سماجی رشتوں کو سمجھنے پر مجبور کرتی ہے۔ خواہ وہ اس زمانے میں بورژوا جمہوری انقلاب کی قدروں ہی کا نقیب کیوں نہ رہا ہو۔ اس کی انسان دوستی گہری سنگھری ہوئی ماورائی فضا میں بھی انسانیت کی آزادی کے پرچم کو بلند رکھتی ہے۔ وہ اپنے رومانوی انداز میں انسانیت کی آزادی اور محبت کی آزادی کو ہم معنی قرار دیتا ہے۔ جب محبت کا قیدی محبت کے جرم پر تازیانے کھاتا ہے تو وہ اپنی نگاہ افق پر گاڑ کر یہ نہیں کہتا ہے کہ محبت کب آزاد ہوگی۔ بلکہ یہ کہتا ہے کہ انسان کب آزاد ہوگا۔ اس دور میں بیدی اور کرشن چندر کے فن کا موازنہ بڑا دلچسپ ہے۔ دونوں ہی کے سامنے حقیقت ایک ہے۔ لیکن دونوں دو مختلف راستوں سے اس حقیقت پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کرشن چندر استحصال، عفونت اور غلاظت کی ضربیں حسن کے چہرے پر محسوس کرتا ہے۔ اس کے لئے زندگی اور حسن دو مترادف الفاظ بن جاتے ہیں، وہ عاشق کی آزادی اور انسان کی آزادی کو ہم معنی کر دیتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ سماجی رشتوں کا تجزیہ کرتا ہے تو حقیقت کی تہوں میں نہیں اترتا ہے، خود اپنے ملک کے طبقاتی رشتوں کی کھوج نہیں کرتا ہے۔ بلکہ اس بڑی طاقت کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ جس نے زندگی اور فطرت دونوں ہی کے حسن پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔

بیدی کا فن مختلف ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام کی لائی ہوئی قدروں کے تضاد کو پیش کرتا ہے اور اس نتیجے پر پہونچتا ہے کہ اس کی تمام قدریں ناجائز اور بے معنی ہیں۔ اس نظام کے انسانوں کے درمیان کوئی انسانی رشتہ نہیں ہے۔ بلکہ صرف سکوں کا واسطہ ہے۔ بیدی نے پہلی دفعہ سرمایہ دارانہ نظام کے رشتوں کو بے نقاب کیا۔ یہ اس کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام کو ایک ایسا **avalanche** بتاتا ہے۔ جس کے بوجھ کے نیچے ساری انسانیت کے فنا ہو جانے کے امکان ہیں۔ اگر کوئی نجات دہندہ جماعت نہ آئی۔ وہ نجات دہندہ جماعت کون ہوگی۔ بیدی کا ذہن اس معاملے میں زیادہ صاف نہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ نجات دہندہ پارٹی کے بارے میں اس کا نظریہ تصوراتی ہے۔ وہ اس پارٹی کے فولاد کے کردار کو جانچنے لگتا ہے۔ اور جب ان میں خامیاں نظر آتی ہیں۔ تو وہ کچھ مایوس سا ہو جاتا ہے۔ یہاں بیدی یہ بھول جاتا ہے کہ اس نظام کے رشتے سے کسی بھی کامریڈ کا مکمل طور پر آزاد ہونا بہت مشکل ہے۔ بہر حال بیدی کی خاموشی کا بھی یہی راز رہا کہ نجات دہندہ پارٹی کو ڈھونڈتا رہا۔ اس طبقے کو تلاش نہ کر سکا۔ جو انسانیت کو بچا سکتا ہے۔

دونوں کے فن میں یہ دوری، یہ تضاد اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ حقیقت کی تصویر خود ہمارے ذہن میں گنجلک تھی۔ ایک طرف تو ہمیں اس بات کا علم تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام اپنے انحطاط کی صورت میں ہے اور دوسری طرف ہم بورژوا نظام کی ترقی پسند قدروں کو آورش بنائے ہوئے تھے۔

اپنے ملک کے بورژوا طبقے سے مکمل طور پر مایوس ہونے کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ کیونکہ وہ بدیسی سامراج کے خلاف عوامی قوتوں کیساتھ جنگ کر رہا تھا۔ اور ہم اپنی جگہ پہ یہ سمجھتے تھے کہ عوامی طاقتوں کا دباؤ سرمایہ دارانہ نظام کے رشتوں اور بورژوازی کی قیادت پر اثر انداز ہو کر رہے گا۔ ہم نے اس قیادت کو مزدوروں کی قیادت میں تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ شعور اس وقت کیوں نہیں پیدا ہوا۔ میں اس کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس شعور کو بیدار کرنے میں تاریخ

کو کافی دخل رہا ہے۔ ایسی صورت میں یہ کہنا کہ کرشن چندر رومانوی ہونے کی وجہ اس وقت رجعت پسند تھا۔ بالکل غلط ہے۔ بلکہ حقیقت اسکے برعکس ہے۔ کرشن چندر کی انسان دوستی اور غلامی کے خلاف شدید نفرت کے اظہار نے اسے انحطاطی جنس نگاروں کے خیمے میں جانے سے روکے رکھا۔ وہ انسان کی آزادی اور ہندوستان کی آزادی کا پرچم ہمیشہ بلند کئے رہا۔

ایسا کیوں ہے کہ کرشن چندر کی تنقید زیادہ ہوئی اور بیدی اپنے میدان میں تنہا رہ گیا، اور اس کا سبب دوسری جنگ عظیم کے وہ طبقاتی رشتے تھے جو عارضی طور پر ایک نئی صورت میں نظر آرہے تھے۔ بورژوا جمہوریتیں اشتراکی اور عوامی طاقتوں کے ساتھ فسطائیت کے خلاف جنگ کر رہی تھیں۔ اس زمانے میں طبقاتی جنگ کا شعور ایک مشترکہ خطرے کے مقابلے میں مدھم پڑ گیا تھا۔ اور جس حد تک یہ شعور مدھم ہو گیا سامراجی اور سرمایہ دارانہ نظام کے رشتوں کا تجزیہ بھی کمزور ہو گیا۔ اور اگر اس موقعے پر کسی کا قلم آگے بڑھا ہے تو وہ کرشن چندر ہی کا قلم تھا کرشن چندر نے جس شدت کے ساتھ انسانیت کے حق میں فسطائیت کے خطرے کو محسوس کیا ہے کسی بھی ادیب نے نہیں کیا ہے۔ کرشن چندر کی یہی انسان دوستی، بنگال کے قحط زدہ انسانوں کا ہاتھ بھی پکڑتی ہے۔ لیکن اب اس کی انسان دوستی ایک نئے دور میں قدم رکھتی ہے۔ اب اسے اپنے ملک کے اقتصادی طبقوں کا احساس بھی ہوتا ہے وہ بدیسی سامراج کے ایجنٹ اور ملکی بورژوا دونوں ہی کی سازش کو قحط کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے لیکن چونکہ بین الاقوامی رشتے کچھ گڈمڈ سے تھے وہ یہاں کی بورژوازی کی سیاست کو بے نقاب نہیں کر پاتا ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ جنگ کے زمانے میں ادبی تخلیق میں ایک زبردست تعطل اور جمود ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ ایک طرف تو ہماری خود اپنی زندگی میں ایک نئی حقیقت کی طرف جا رہی تھی۔ یعنی مقامی بورژوا طبقے کی لوٹ کھسوٹ کا احساس شدید ہوتا جا رہا تھا۔ اور دوسری طرف بین الاقوامی رشتے اس طبقاتی شعور پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ لیکن اسے مکمل جمود کا زمانہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں جنسیات اور لاشعور نگاری سے فنکاروں کی دلچسپی بڑھی ہے۔

جنگ کے زمانے میں جس حد تک ہمارے ملک میں مزدور تحریک اور طبقاتی شعور کمزور رہا ہے۔ اسی حد تک مزدوروں کا فلسفہ بھی کمزور ہوا ہے۔ ایک غلام ملک میں رہنے کے باعث ہم نئے بین الاقوامی رشتوں کی جدلیات سمجھنے سے قاصر رہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ عوام کا ذہن زیادہ صاف نہیں ہو سکا۔ کبھی انگریز دشمنی کا جذبہ بین الاقوامی رشتوں پر غالب آگیا تو کبھی بین الاقوامی رشتے سامراجی اور سرمایہ دارانہ نظام کے سماجی رشتوں پر غالب آ گئے۔ دوسرے یہ کہ سرمایہ دارانہ ممالک کی فوجی زندگی کا اخلاق بہت ہی پست تھا۔ انکے لئے یہ جنگ اقتصادی بحران اور بیروزگاری ٹالنے کا ایک بہانہ تھی۔ انکے سپاہیوں کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کیوں اور کس لئے لڑ رہے ہیں۔ اور جب بھی ان ملکوں نے فسطائیت کے خلاف پروپیگنڈا کیا تو فسطائیت تحریک کے فلسفے کو بے نقاب نہیں کیا۔ انہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ فسطائیت بہیمانہ جذبات کو ابھار کر سماجی شعور کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ یہ زندگی کو غارتگری اور جسم کی لذت سے آمیز کرنا چاہتی ہے۔ یہ کام سرمایہ دارانہ ممالک کیلئے ناممکن تھا کیونکہ وہ در پردہ خود اسی فلسفے کے ماتحت سپاہیوں کو لڑانا چاہتے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے روزگار اور فلاکت زدہ انسان جو جسم و جان کی لذتوں سے محروم ہو چکے تھے۔ فوجی زندگی میں پہونچکر لذت جسم اور لذت مرگ سے آشنا ہوئے۔ اس کا اندازہ اس وقت کے امریکی ادب اور فلموں سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ سپاہیوں کی جسمانی لذت کیلئے باقاعدہ پروگرام بنائے گئے انہیں مدہوشی اور زنا کی آزادی دی گئی۔ اس فوجی زندگی کا اثر ہمارے معاشرے پر بھی پڑا ہندوستان کے اونچے اور متوسط طبقے کی لڑکیاں دیہاتی WACI میں بھرتی ہوئیں، کرسچین لڑکیاں، انگریز اور امریکی سپاہیوں کی جسمانی لذت کیلئے وقف ہو گئیں۔ یہ جنسیاتی ہنگامہ خیزی، ناکامی، ہندوستان کی ٹوٹتی گھریلو زندگی کا انتشار، ان ادیبوں کو اپنی طرف خاص طور سے متوجہ کرتا ہے۔ جو جنگ کے زمانے میں جنگ کے مقصد کے بارے میں تشکک سے تھے۔ جو انسانیت کے مستقبل سے آگاہ نہ تھے۔ حسن عسکری نے عیسائی لڑکیوں کے لاشعور کو پیش کرنا شروع کیا اور ممتاز مفتی

نے فرائیڈ کے مقدمات سامنے رکھ کر کہانیاں مرتب کرنی شروع کر دیں۔ اگر اس وقت ہمارا طبقاتی شعور استوار ہوتا، تیز اور تند ہوتا تو ہم بہت جلدی اس انحطاطی فلسفے کو بے نقاب کر سکتے۔ چنانچہ اس کمزوری کے باعث ہمارے ترقی پسند ادیب بھی اس سیلاب میں بہہ گئے۔ اور اس کی مخالفت اس وقت سے پہلے شروع نہیں کی۔ جب کہ انحطاطی ادیبوں نے سماجی شعور اور مزدوروں کے فلسفے کی باقاعدہ مخالفت شروع نہیں کر دی۔

اسی زمانے میں عصمت نے چوٹیں کی بیشتر کہانیاں اور "ٹیڑھی لکیر" لکھی ہے اسی زمانے میں منٹو نے "دھواں" لکھا، اور اس قسم کی دوسری کہانیاں لکھی ہیں۔ اس قسم کے تمام افسانوی ادب میں اگر جزوی اختلافات کو نظرانداز کر دیا جاسکے تو ایک چیز مشترک ملے گی وہ ہے جنسی جذبے کی اولیت۔ اندھیرے اجالے چڑھتے اترتے، ہر جگہ ہاتھ پیر بیگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ جذبہ عجیب عجیب عنوان سے چھپ چھپ کر اپنی گوناگوں کیفیات کا مظاہرہ کرتا ہے کبھی بیلون، کرسیٹ سے لٹکتا ہے تو کبھی "بغل" سونگھتا ہے کبھی پاریک، دھوتی پر نظر ڈالتا ہے تو کبھی "بلاوز" کا ناپ لیتا ہے کبھی یہ جذبہ "بیل" بنکر پھوٹتا ہے تو کبھی "دھواں" بن کر چیک جاتا ہے۔ بہرحال کسی بھی عنوان سے اس جذبے کی "ٹیڑھی لکیر" سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ کیونکہ اس کی کجروی میں فرائیڈ کے مجرب مرکبات کام کرتے رہتے ہیں۔ اسکے اظہار میں احساس کمتری، جنسی جذبے کی آسودگی، ہم جنسی جذبے کا دباؤ، اذیت دہی، اذیت پسندی، آزاد محبت کا تصور، سفید و سیاہ کے نسلی امتیازات کام کرتے رہتے ہیں اور اگر وہ کبھی باہر کی دنیا کو بھی جھانک کر دیکھنا چاہتا ہے تو بدلے ہوئے بین الاقوامی رشتے قومی سیاست کو سمجھنے میں مدد ہی نہیں کرتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ تمام کوششیں بیکار ہیں۔ ان میں بجز رجعت پسند طبقے کے کچھ ادب ہے ہی نہیں؟ اگر جنسی جذبے کی اولیت غلط ہے تو جنسی جذبے کی کارستانیاں تو باقی رہتی ہیں، کیا اس میں سرمایہ دارانہ نظام کے انحطاط اور ہندوستانی سماج کی دبی کچلی ہوئی زندگی کی تصویر نہیں ہے۔ کیا یہ تصویریں ہمیں گلے سڑے ہوئے سماج کو سمجھنے میں آسانیاں بہم نہیں پہونچاتی ہیں؟

یہ سوالات بہت ہی برحق ہیں۔ لیکن قبل اسکے کہ میں ان کا جواب دوں میں اپنے سوالات کو پیش کر رہا ہوں۔

کیا یہ تصویریں سماجی رشتوں اور سماجی ارتقا کے محرکات کے دریافت کرنے میں مدد کرتی ہیں۔ کیونکہ ادب نہ صرف خارجی حقائق کا عکس ہے بلکہ حقیقت کو دریافت کر کے سماجی زندگی کو آگے بھی بڑھاتا ہے۔ ادب ایک خلاقانہ قوت ہے۔ جو سماجی رشتوں پر اثرانداز ہوتا ہے جو زندگی کی اقتصادی اور مادی بنیادوں پر اثرانداز ہوتا ہے۔

ایسی صورت میں اگر وہ تصویریں حقیقت کے عکس کو گنجلک کر دیتی ہیں۔ عوام کے ذہن کو سماجی شعور سے ہٹاکر جنسی جذبے کی گھتیوں میں لیجاتی ہیں۔ عورت اور مرد کی آزادی کو جنسی جذبے کی غیر اختیاری آسودگی میں اسیر کرنا چاہتی ہیں تو مجھے یہ کہنے میں جھجک نہیں ہے کہ یہ کوششیں رجعت پسند ہیں۔ ان تصویروں سے سماجی زندگی کے صحیح محرکات اور شخصیت کے راز کے سمجھنے میں آسانی نہیں ہوتی ہے۔

لیکن جس حد تک ان تصویروں میں سماجی ماحول کے پیش کرنے میں معروضیت سے کام لیا گیا ہے۔ وہ ہمارے لئے معنی بھی رکھتی ہیں۔ لیکن آپ خود سوچئے کہ ان میں ایسی کہانیاں کتنی ہیں۔ جو سماجی رشتوں کو نظرانداز نہیں کرتی ہیں۔ جو موجودہ جنسی دباؤ اور اس کی بے راہ روی اور کجروی کو ایک مخصوص نظام کے متعین کئے ہوئے جنسی تعلقات کا نتیجہ بتاتی ہیں۔

اس سماج دشمن نظریئے کے خلاف ردعمل کرنے میں آج خود عصمت ہی پیش پیش ہے۔ وہ فرائیڈ کے مفروضات سے نکل گئی ہیں۔ وہ دبی ہوئی جبلتوں کی آزمائشوں سے ہٹ کر اس وسیع زندگی کا مشاہدہ کر رہی ہیں، جہاں جنسی جذبہ ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں روح صرف جنس میں اسیر نہیں ہے۔ جہاں زندگی کی بے شمار خصوصیتیں جنسی دباؤ پر بھاری ہیں، اس

نئے مشاہدے نے ان میں ایک نئی بصیرت پیدا کر دی ہے۔ اب وہ سماجی زندگی کو متضاد طبقوں میں بٹا ہوا دیکھ رہی ہیں، اور بین الاقوامی سیاست کے دو خیموں کو پہچان چکی ہیں۔ ہمیں عصمت کے فن اور قلم سے بڑی توقعات ہیں۔ وہ دن دور نہیں ہے۔ جب وہ اپنے اس سماجی اور طبقاتی شعور کو اپنے فن پاروں میں منتقل کر دیں گی۔

اس نئے شعور تک پہونچنے میں فساد کے خارجی تجزیے نے بھی مدد کی ہے۔ اگر عصمت اس دور میں بھی بورژوا سیاست کا شکار ہوتیں تو خواجہ احمد عباس کی طرح اسی نتیجے پر پہنچتیں کہ یہ سب کچھ عوام کے بہیمانہ جذبات کا نتیجہ ہے۔ لیکن انہوں نے اس بات کا خود مشاہدہ کیا کہ اس فساد کے پیچھے جو خارجی طاقتیں کام کر رہی تھیں وہ خود بہیمانہ ہیں، وہ بہیمانہ جذبات کو جنم دیتی ہیں۔ اور چونکہ ان کا تصرف پر ملکیت پر ہوتا ہے وہ عوامی نفسیات کو بھی ان جذبات میں رنگنے کی کوشش کرتی ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کو قائم رکھنے، ہندو بورژوا طبقہ اور مسلمان بورژوا طبقہ کو اپنا الگ الگ حلقہ اثر متعین کرنے اور جاگیردارانہ نظام کو عوامی طاقت کے خلاف استعمال کرنے کیلئے یہ ضروری تھا کہ بورژوا طبقہ انقلابی طاقتوں کو پیچھے ہٹائے، ان کی یکجہتی، انقلابی اخوت اور پرولتاری اخلاق کی قوت کو صدمہ پہونچائے۔ فساد اسی کوشش کا نتیجہ تھا۔ اس فساد نے ہماری بورژوازی کو بہت بری طرح بے نقاب کیا ہے۔ اس کی عوام دشمنی اور انقلاب شکن طاقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔ اس سے نہ صرف ہمارے طبقاتی شعور کی بنیادیں مضبوط ہو رہی ہیں، بلکہ ملکی سرمایہ داروں اور رجواڑوں کے خلاف شدید نفرت کا جذبہ بھی پیدا ہوا ہے۔ اس کی کلچر شکن اور انسانیت کش سازشوں کا علم ہوا ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ شعور فساد کے زمانے میں اتنا واضح نہ تھا۔ فساد کی بنیادوں کے سمجھنے میں کچھ دیر لگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کرشن چندر نے اپنے افسانوں میں پرانے ڈھرّے پر انسانیت دوستی کی اپیل قائم رکھی۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، فساد کا تسلسل عوام دشمنی میں ظاہر ہوتا گیا۔ کرشن چندر کی بورژوا انسانیت دوستی کو صدمہ پہونچتا گیا۔ وہ اب اس نتیجے پر پچھلے دو سے پہونچ چکا ہے کہ یہ جھوٹی آزادی بورژوا طبقے کی غارتگری کی آزادی ہے، یہ ہندوستانی عوام کو لوٹنے اور انقلابی طاقتوں کو کچلنے کی آزادی ہے۔ اس چیز کا اندازہ کرشن چندر کو اس وقت ہوتا ہے۔ جب کہ آزادی کی پہلی گولی اس مجاہد وطن کے سینے پر پڑتی ہے۔ جس نے اپنی ساری زندگی ہندوستان کی آزادی میں صرف کر دی تھی وہ اس گولی کو جھیلتے ہوئے تلک کے پاس پہونچا، گاندھی جی کے پاس پہونچا اور جب ہر ایک نے اس سے منہ موڑ لیا تو وہ اسے یقین ہو گیا کہ یہ گولی انگریز کی نہیں ہے بلکہ جواہر کی ہے۔ ان پرانے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر ہی وہ پہلا شخص ہے۔ جس نے اپنی طبقاتی طرفداری کا اعلان کیا، جس نے اشتراکیت کا صاف مسلک اپنے سامنے رکھا اور جس نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ آج دنیا دو خیموں میں تقسیم ہو چکی ہے ایک طرف سوویٹ روس، عوامی جمہوریتیں اور عوام کی انقلابی طاقتیں ہیں تو دوسری طرف سامراجی طاقتیں، اور ہر ایک ملک کی بورژوازی اور رجعت پسند طاقتیں ہیں۔ اور ان دو خیموں کے علاوہ کوئی تیسرا خیمہ نہیں ہوتا ہے۔ انسانیت کی اس آخری جنگ میں غیر جانبداری عوام دشمنی ہے۔ سامراجی خیمے کی طرفداری ہے۔ کرشن چندر کا یہ ذہنی ارتقاء، اسکے فن، اس کی رومانیت اس کی انسان دوستی کو سمجھنے کا موقعہ دیتا ہے۔ پاکستان کے رجعت پسند ادیبوں نے بارہا اس کی پابندی کے مضبوط اور سڈول مینارے کو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے ڈھانے کی کوشش کی لیکن ہر بار ان کا ہاتھ پھسل گیا۔

یہ ہاتھ پھسلتے ہی رہیں گے۔ کیونکہ کرشن چندر کی رومانیت میں انسان دوستی کا جذبہ اتنا غالب ہے کہ وہ زندگی سے دور نہیں ہوتا ہے۔ اس کا مخاطب ہمیشہ انسان رہا ہے۔ دکھی اور مظلوم انسان۔ وہ انسان کے مستقبل سے بیزار نہیں ہوپاتا ہے۔ اور آج جبکہ اسے اس بات کا علم ہو گیا ہے کہ انسان دوستی کے جذبے کو اس وقت تک بچایا نہیں جا سکتا ہے۔ جب تک کہ عوامی

طاقتوں کے ساتھ مل کر انسانیت کش طاقتوں کو ختم نہ کیا جائے۔ وہ اپنی بورژوا انسان دوستی سے نکل کر اشتراکی انسان دوستی میں قدم رکھ رہا ہے۔ یہ چیز اسکے یہاں نہیں مل سکتی ہے جو فوٹوگرافی کو فن سمجھتے ہیں، جو فن کو جزئیات نگاری میں محدود کرنا چاہتے ہیں، جو ادب سے تخیل کو خارج کرنا چاہتے ہیں۔ جو آج بھی غلاظت کی مصوری میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ایسا کیوں ہے کہ وہ اپنے اس گڑھے سے نکل نہیں پاتے ہیں۔ اسکے جہاں اور اسباب ہیں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا مخاطب انسان نہیں بلکہ فن رہا ہے۔ وہ فن کو زندگی سے الگ کر کے مصوری کا ایک حربہ بنانا چاہتے ہیں۔ منٹو صحیح حقیقت نگاری کی طرف اسی وجہ سے نہیں آسکا۔ کبھی کبھی منٹو ایک آدھ اچھا طنز لکھ کر لاتا ہے۔ وہ بورژوا نظام کو بے نقاب بھی کرتا ہے۔ لیکن کہیں بھی عوامی زندگی سے ہمدردی کا اظہار نہیں کرتا ہے۔ کبھی کبھی اس کا طنز دو رویہ بھی ہوتا ہے۔ مثلاً "کبیرا رویا" میں وہ ترقی پسند ادب اور ادب برائے ادب دونوں ہی پر طنز کرتا ہے۔ آج کی تاریخ میں اس قسم کا طنز کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔ کیونکہ بورژوا طبقہ ناقابل اصلاح ہے۔ پھر یہ کہ اصلاح پسندی ایک رجعتی کام ہے وہ تاریخ کے نقارہ کو آگے بڑھنے سے روکتی ہے۔ منٹو اپنی کسی بھی کہانی میں استحصال کی بنیادوں تک نہیں پہنچتا ہے۔ آج کا ترقی پسند ادب طرفدار ہے۔ بغیر اس طرفداری کے ترقی پسندی کا کوئی مفہوم نہیں ہے

یہی حال قرۃ العین حیدر کا ہے۔ وہ اوپری طبقے کی زندگی میں ایک کھوکھلا پن محسوس کرتی ہیں۔ لیکن اس خلا کو بھرنے کے بجائے بورژوا نظام کا رجعتی فلسفہ بھر دیتی ہیں۔ وہ اس طبقے کے کھوکھلے پن اور اس کی قدروں کی بے مائیگی کو پوری انسانیت کی زندگی پر منطبق کر کے ایک فضول زندگی اور لذت مرگ کے قریب پہونچتی ہیں۔ وہ یہ دیکھنے سے قاصر رہتی ہیں کہ زندگی "یم بہ یم" اور "دجلہ بہ دجلہ" بہتی چلی جارہی ہے۔ اسکے بہاؤ میں سماج کی کتنی گندگی بہہ چکی ہے اور کتنی بہتی جارہی ہے۔ اور کتنی آگے چل کر بہہ جائیگی۔

اوپری طبقے کی لڑکیوں میں سرد مہری، جسم فروشی اور اداس شامیں اس لئے ہیں کہ اب طبقے کے پاس نہ تو آگے بڑھنے کا کوئی فلسفہ ہے اور نہ ذریعہ۔ اس طبقے نے اپنے گرد ایک جال سا بن رکھا ہے۔ جس میں وہ روز بروز خود اپنے کو جکڑتا جا رہا ہے۔ مشینیں، کارخانے، دولت اور محنت سب کچھ موجود ہے۔ پھر بھی وہ پیداوار کو عام استعمال کے لئے بڑھا نہیں پاتا ہے۔ وہ نفع خوری کا اتنا عادی ہو چکا ہے کہ پوری انسانیت کو فاقے اور جنگ کی بلا میں مار سکتا ہے۔ لیکن اپنے نفع کو ضایع کرنا نہیں چاہتا۔ ایسا نہیں ہے کہ اس طبقے کی لڑکیوں کو شوہر ملتے ہی نہیں ہوں۔ معاملہ صرف دام کے سوال پر آکر رک جاتا ہے۔ اس جھک جھک اور عشق بازی کا سلسلہ اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک کہ دام کے گرنے کا خوف نہ پیدا ہو جائے۔ چنانچہ ان کی زندگی کی تمام اداسی، خلائے بسیط کا وہم، اور موت کا اندیشہ، اصل میں سر کے بالوں کے سفید ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ جبکہ وہ جنسی زندگی کی مہم پروازی سے محروم ہو جائیگی کبھی کبھی انہیں یہ احساس جرم بھی آدبوچتا ہے کہ وہ جسے آزاد تجارت سمجھ رہی ہیں۔ ایک قسم کی جسم فروشی ہے۔ اشتراکی نظام کی تو بات ہی دور ہے۔ یہ پریشانی تو جاگیردارانہ نظام کے ایسے مقید ماحول میں بھی نہ تھی۔ اس وقت گھریلو صنعتیں تھیں، کم از کم نفاست اور حسن کی قیمت تو لگتی ہی تھی۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام میں چونکہ نفاست اور حسن بھی وسیع پیمانے پر عام ہو گئے ہیں۔ اب چیزوں کو جھاڑ پھونک کر رکھنے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اب تو حسین سے حسین چیز کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہے آج پہنا اور کل اتار دیا۔ آپ خود ہی سوچئے حسن کی کون سی چیز ہے۔ جو بازار میں نہیں بکتی ہے غازہ، پوڈر، لپ سٹک، بالوں کا خم، ابرو کی کمان، ناک کا پلاسٹر، جسم کے خطوط، یہاں تک کہ آواز کا لوچ، نازک مزاجی، جذباتی سانچے سب کچھ بنے بنائے بکتے ہیں۔ اب عورتیں ان تاجروں کی منڈی میں کتنی تگ و دو کریں۔ اوپری طبقے کی عورتوں کی ٹریجیڈی کا یہی راز ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ وہ اپنی قیمت کو کیونکر بڑھائیں۔ اور فرض کر لیجئے کہ وہ قیمت بھی لیں تو عمر کی رفتار کو کیونکر روکیں اور کب تک روکیں، اور اگر اس کا

کوئی مداوا نہیں ہے تو پھر تو جنسی زندگی کو مشکلاتی ہونا چاہیئے۔ اُسے بوطلیوس کی اقلیدس بنانا چاہیئے۔ تاکہ انسان کے فرائض انجام دینے ہی سے قاصر رہے۔

یہاں تک اور نئی جنسیات نگاری کا بھی فرق ہے۔ اب ترقی پسند افسانہ نگار ان رجعتی رجحانات سے متاثر ہونے کے نہیں ہیں۔ کیونکہ اب ترقی پسندی نے اپنی طبقاتی اساس کو پہچان لیا ہے۔ وہ عوامی زندگی اور مزدور فلسفے سے دور ہونا نہیں چاہتی ہے۔ وہ اپنے طبقاتی شعور کو گڈمڈ نہیں کرنا چاہتی ہے۔ وہ اپنے انقلابی راستے کو چھوڑنا نہیں چاہتی ہے۔ چنانچہ آج بہت ہی واضح طور سے متوسط طبقے کے افسانہ نگار دو قسم کے طبقاتی طرفداری میں بٹ رہے ہیں۔ ایک طرف ان افسانہ نگاروں کا گروہ ہے۔ جو قومی حکومت اور بورژوا طبقے کے مفاد کی خدمت کر رہے ہیں۔ اور دوسری طرف وہ افسانہ نگار ہیں جو محنت کش انسانوں کے طبقاتی مفاد کے حامل ہیں۔ کیونکہ انہیں یہ معلوم ہے کہ صرف یہی وہ طبقہ ہے جو کسی دوسرے طبقے کو لوٹتا نہیں اور جو استحصال کی تمام بنیادوں کو جڑ سے اکھیڑ پھینکنے کے لئے جد و جہد کر رہا ہے۔ چنانچہ آج ان کی قدیم انسان دوستی کا تصور بھی بدل چکا ہے۔ اب انسان دوستی، اہنسا، طبقاتی بیچ بچاؤ، طبقاتی جنگ میں مصلح آشتی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ طبقاتی جنگ کے ذریعے استحصالی طبقے کو ختم کرنے کا نام ہے۔

جمیل ملک

ہرجائی

— اُس نے جاتے ہوئے یہ بات کہی تھی مجھ سے

"تو مری جان ہے، میں تجھ کو بھلا سکتا ہوں؟"

لیکن افسوس وہ جاتے ہی مجھے بھول گیا —

— اب وہ ہرجائی کسی اور سے کہتا ہوگا

"تو مری جان ہے، میں تجھ کو بھلا سکتا ہوں؟"

جگن ناتھ آزاد

روکلا سے پیرس تک .....

روکلا سے چلا جگمگاتا ہُوا
پرچمِ زندگی
اپنے ماحول سے نور لیتا ہُوا، اپنے ماحول کو نور دیتا ہُوا۔
مہر و مہ کی جبینیں جھکاتا ہُوا۔
اور ذرّوں کو افلاک کی رفعتوں سے ملاتا ہُوا
(راہ میں بزم اپنوں کی ہو یا ہو اغیار کی، بادۂ مہر و اُلفت لٹاتا ہُوا)
روکلا سے چلا جگمگاتا ہُوا ———!

روکلا سے چلا پرچمِ عظمتِ زندگی جگمگاتا ہُوا
مُسکراتا ہُوا
امن کے، آشتی کے دلآویز نغمات گاتا ہُوا

اہلِ دانش کے ہاتھوں نے تھاما اسے
علم والوں نے اس کو سہارا دیا۔
امن کے حامیوں، جنگ کے دشمنوں کی حفاظت میں پرچم یہ بڑھتا گیا
روکلا سے چلا وہ بڈاپسٹ کو
وہ بڈاپسٹ مظہر ہے جو نازیوں کی ستم رانیوں کا
آمریت کے احکام پہ مٹنے والوں کی سفاکیوں کا
اور شخصی حکومت پہ جاں دینے والوں کی بے باکیوں کا
وہ اجڑا ہُوا شہر، کھنڈروں کی بستی وہ تاریک بلدہ

اسی ضو فشاں پرچم عظمتِ زندگی سے
پھر اک بار یوں جگمگایا
کہ اس پہ مہروجہر اور کہکشاں کی تجلّی کو بھی رشک آنے لگا

پرچم عظمتِ زندگی
اس کھنڈر شہر کے اجڑے اجڑے سے ماحول کو زندگی بخشتا۔
تازگی بخشتا، سرخوشی بخشتا
ارضِ ڈالر کی جانب روانہ ہُوا ——————
ارضِ ڈالر کہ تاباں بنی ڈالر کی ضو سے
چمک اُٹھی کچھ اور بھی پرچم عظمتِ زندگی کی سکوں ریز لَو سے۔
ارضِ ڈالر میں پہنچا تو یہ پرچم عظمتِ زندگی۔
پھڑ پھڑا کر فضا میں دکھانے لگا
زندگی کی تڑپ
زندگی —————— جس کے سینے میں اُمید ہے۔
زندگی —————— جس کے دل میں عزائم ہیں اور درد ہے
زندگی —————— جس کے ہاتھوں میں قوت ہے۔ اور بازوؤں میں توانائی ہے
زندگی —————— جس میں ڈالر سے بڑھ کر ہے تابندگی
زندگی —————— جو کبھی ڈالروں کے عوض
آج تک بک سکی ہے نہ بک ہی سکے گی

ارضِ ڈالر سے پیرس کی جانب چلا
پرچم عظمتِ زندگی
قہقہے ڈالروں پر لگاتا ہُوا
زندگی کے ترانے سُناتا ہُوا
کہنہ عالم کی بنیاد پر عالم نو کی محفل سجاتا ہُوا
عقل کے دوستوں، ہوش کے ساتھیوں کا سہارا لئے

علم کے حامیوں، جہل کے دشمنوں کی حفاظت میں بڑھتا ہُوا
جاکے یورپ کے اک میکدے میں رُکا۔
اور گویا ہُوا :-
"میکدہ زندگانی کا ویران ہے
ایک صحرا کی مانند سنسان ہے
میکشو!
خواب سے جاگ اُٹھو!
لاؤ گردش میں پیمانۂ زندگی
چھوڑ کر لغو و مہمل فسانوں کو اب
آؤ دہرائیں افسانۂ زندگی"

زندگی کا یہ پیغام دیتا ہُوا
پرچمِ عظمتِ زندگی رنگ و نکہت کی دنیا سے رخصت ہُوا
رنگ و نکہت کی دنیا سے چلنے کے بعد اب کہاں جائے گا
اہلِ عالم —— کہو اب کہاں جائے گا
یہ مرا پرچمِ زندگی
یہ تمہارا یہ ہم سب کی عظمت کا پرچم کہاں جائے گا —!
یہ خرد کا، یہ دانش کا، یہ امنِ عالم کا پرچم کہاں جائے گا!
اب اسے روئے گیتی پہ لے کر چلو ہر طرف
تاکہ یہ روئے گیتی کی تاریکیوں کو ہٹائے
تاکہ اس کی ضیا سے ہر اک ذرّۂ خاک تاروں سے بھی کچھ فزوں جگمگائے۔
اس کو پورب میں پچھم میں لے کر چلو
اس کو اُتر میں دکھن میں لے کر چلو
تاکہ پورب میں پچھم میں اُتر میں دکھن میں یہ مہر و الفت کا پیغام دے۔
تاکہ تشنہ لبوں کو مئے زندگی کا چھلکتا ہوا جام دے
یہ ہمارا، تمہارا، یہ ہم سب کی عظمت کا پرچم ——!

بلونت سنگھ

بوسیدہ صوفے میں دھنسے دھنسے اس نے سگرٹ کا ایک طویل کش لینے کے بعد منہ کھولا تو گہرے سرمئی رنگ کے دھوئیں کا کلبلاتا اور بل کھاتا ہوا بادل باہر نکل کر فضا میں پھیلنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کی مندی ہوئی آنکھوں کے آگے سے دھوئیں کا پردہ ہٹ گیا۔ اور دیوار پر لٹکی ہوئی بڑے سائز اور پرانے ڈھنگ کی رنگین تصویر صاف نظر آنے لگی۔

آج کل اس قسم کی تصویروں کا رواج نہیں تھا۔ لیکن لالہ جی کے گمنام ہوٹل کے سنسان کمرے میں اور کس چیز کی توقع کی جا سکتی تھی؟ تصویر میں پرانے زمانے کے کسی مہاراجہ کے رنگ محل کا اندرونی منظر دکھایا گیا تھا۔ نوجوان رانی سکھیوں کے ہمراہ نیلے پانی کے تالاب کے کنارے کھڑی تھی۔

ہائے کس قدر دل گداز، منظر تھا یہ!

وہ مہوش رانی جس پر بھولے سے نگاہ ڈالنے والے شخص کی آنکھیں نکلوا دی جاتی ہوں گی ۔۔۔ اور پھر اس دل رُبا کے محل کا یہ حصّہ خاص جہاں بلا اجازت شاید کوئی پرندہ بھی پر مارنے کی جرأت تک نہیں کرتا ہوگا ۔۔۔ ان سب پر طرّہ یہ کہ عین غسل کا سماں...... ایک سے ایک بڑھ کر مہ جبین ...... ان میں سے مکمل طور پر عریاں کوئی بھی نہیں تھی۔ کپڑے کے سارے مراحل ابھی طے نہیں ہونے پائے تھے ....

آ گئی؟

وہ چونکا ۔۔۔ نہیں یونہیں کھٹکا ہوا تھا۔

کوئی نہیں، کوئی نہیں ۔۔۔ دلِ زار اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔

صاف چاندنی رات تھی۔ انہیں اس وقت تک پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ خیر! شراب کا خمار کا ابھی باقی تھا اس لئے وہ اپنے ذہن کو بے خیالی کے عالم میں ڈگمگانے کی اجازت دے سکتا تھا۔

تصویر والے تالاب میں گہرے سبز رنگ کی کائی کے تودے پانی میں ہچکولے لے رہے تھے۔ ان تودوں میں سے گذرتے ہوئے ہنس اِدھر اُدھر تیرنے پھرتے تھے۔ عورتیں چکنے اور ہموار فرش پر اس انداز سے کھڑی تھیں۔ جیسے لمحہ بھر میں وہ اپنے بچے کھچے کپڑے اتار پھینکیں گی۔ اور پھر خوشرنگ نیلے پانی کی نہروں میں سے کودتے ہوئے ان کے جگمگاتے بدن کیا ہی حسین سماں پیدا کریں گے

آ گئی؟؟

اس نے پھر گھوم کر دیکھا۔

"جی ہاں"

ملازم کی زبانی یہ جواب سن کر اس نے خاص بے چینی کا اظہار نہیں کیا، البتہ سگرٹ کا کش لیتے ہوئے نگاہ دروازے پر گاڑ دی۔

لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اس کا لباس بھڑکدار ضرور تھا۔ لیکن اس میں کوئی کشش نہیں تھی نہ اس کی وجہ سے لڑکی کے حسن میں اضافہ ہوا تھا۔ لڑکی کا رنگ سانولا، خد و خال معمولی، لیکن بحیثیت مجموعی صورت دل کش اور بدن نوخیز دعوت آمیز تھا۔

لودار چھوکری دیدہ دانستہ اس انداز سے کھڑی ہو گئی۔ کہ سر سے پاؤں تک بخوبی اس کو دیکھا جا سکے گاہک نے بظاہر نیم وا آنکھوں لیکن حقیقتاً متجسس نگاہوں سے لڑکی کی صورت کا جائزہ لیا۔ سنولاتے ہوئے رنگ پر نوخیز خون نے عجب نکھار پیدا کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی ہموار اور تنی ہوئی جلد دیکھ کر وہ بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔ کہ وہ اندر سے کیسی ہو گی۔

چناں چہ اس نے لڑکی سے نگاہ ہٹا کر اس کے ہمراہ کھڑے ہوئے مرد کی جانب دیکھا، پھر اس سے بھی نگاہیں پھیر لیں اور کھڑکی میں سے نظر آنے والے آسمان میں روئی کے گالوں کے مانند بادلوں کی ٹکڑیوں پر نظر جما دی۔ وہ ٹکڑیاں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے بے کنار سمندر میں برف کے تودے اٹھکیلیاں کر رہے ہوں۔

قدرے تامل کے بعد اس نے سگرٹ کی راکھ جھاڑی اور لڑکی کے ساتھی سے مخاطب ہو کر بولا "رات بھر رہنا ہو گا"

لڑکی کے ساتھی کی مونچھیں گھوم کر اس کے بھنچے ہوئے لبوں میں گھسی ہوئی تھیں۔ اس نے بات کا جواب دینے کے لئے منہ کھولا تو مونچھیں ہوا کے زور سے متحرک ہو گئیں۔ جیسے کنکھجورا رینگنے کو ہو۔ لیکن گاہک نے یہ تماشہ نہیں دیکھا۔ اس کی نظریں آسمان پر جمی تھیں اثبات میں جواب پا کر اس نے گردن گھمائے بغیر دریافت کیا "ریٹ کیا ہے؟"

"ریٹ تو ——— خیر پچاس روپلے پر معاملہ طے ہو جائے گا"

"پچیس"

اس نے قدرے تامل کیا ——— "یہ بہت کم ہے ......"

"نہیں ——— بس ٹھیک ہے ——— تم زیادہ طلب کرتے ہو"

"اجی واہ ...... لوگ رات بھر کا دو دو سو بھی خرچ کر ڈالتے ہیں"

"مال مال کی قیمت ہے"

لڑکی نڈھال سی ہو گئی تھی ——— اس نے لڑکھڑا کر دیوار کا سہارا لیا۔

"تم بیٹھ جاؤ" ساتھی بولا

"چاہو تو جا سکتے ہو تم لوگ" گاہک نے کہا۔

لڑکی کرسی پر بیٹھ چکی تھی لیکن اٹھنے کے لئے پر بھی تول رہی تھی۔

اس کا ساتھی عجب کشمکش و پیچ میں پڑ گیا تھا۔ دیر تک بے تکی سی خاموشی طاری رہی آخر اس نے غیر مستحکم آواز میں کہا "آپ ہمیں کچھ زیادہ دے دیجئے، ہم لوگ شریف ہیں ...... لیکن رفیوجی ہیں ...... کیا کریں کیا نہ کریں"

"میں بھی رفیوجی ہوں"

اب لڑکی کا ساتھی بالکل "دم بخود" ہو کر رہ گیا۔

ادھر سگرٹ کے تیز تیز کش لگائے گئے پھر اس کی ڈبی پھینک دی گئی۔ آواز گونجی "تیس دے سکوں گا۔ بس۔ اب تم ——— یا تم دونوں جا سکتے ہو"

گومگو کی فیصلہ کن بات سن کر مرد نے لڑکی کی جانب دیکھا لیکن دونوں کی نظریں مل نہیں سکیں۔ کیونکہ لڑکی کے چہرے بلکہ سارے بدن پر بے حسی طاری تھی۔ اس کے ہونٹ جھکے ہوئے تھے یوں ظاہر ہوتا تھا۔ جیسے وہ اپنی خوش وضع چھوٹی چھاتیوں کے اُبھار بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہی ہے۔

بالآخر ساتھی نے بے کیف آواز میں کہا۔ "اچھا میں چلا جاتا ہوں"۔

دس دس کے تین نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیئے گئے اور وہ اپنے پیچھے دروازے کو بھیڑتا ہوا سست قدموں سے روانہ ہوگیا۔

وہاں اب وہ دونوں رہ گئے تھے۔

مرد نے نیا سگرٹ سلگایا اور لڑکی کی جانب متوجہ ہوئے بغیر بڑے انہماک سے کش پر کش لینے لگا۔ سودے بازی کے معاملوں سے اسے خاص کوفت محسوس ہوتی تھی۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ اس کوفت کا غبار اس کے دل سے دُور ہو جائے تو وہ لڑکی کی جانب متوجہ ہو۔

کمرے میں مکمل سناٹا تھا۔

دفعتاً عجیب شور بلند ہوا —— مہرِ سکوت ٹوٹ گئی —— اور چند لمحوں کے بعد اسے اس بات کا احساس ہوا کہ لڑکی نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت تک وہ کسی نہ دب سکنے والے درد کو بزور دبائے بیٹھی رہی تھی۔ لیکن بالآخر لاوا بہہ نکلا۔

لونڈیا کی اس حرکت سے، اسے سخت کوفت ہوئی۔ لیکن وہ منہ سے کچھ نہیں بولا بلکہ اطمینان سے سگرٹ پیتا رہا ایک ختم ہوتا تو وہ اسی سے دوسرا سلگا لیتا۔

جھرجھری پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی جیسے وہ اپنا کلیجہ پگھلا کر آنسوؤں کے ذریعے سے بہا دے گی۔ بالآخر رونے کی شدت میں کمی ہونے لگی . . . . . . اور پھر —— رفتہ رفتہ رونا دھونا ختم ہوگیا۔ اب صرف ہچکیاں باقی رہ گئی تھیں۔

وہ کرسی سے اٹھا۔ اس اثنا میں لڑکی کمرے کے ایک گوشے میں کھڑی ہو گئی تھی۔ اور اپنی ہچکیوں میں دبی ہوئی تھی۔ مرد ٹانگیں لٹکا کر پلنگ پہ نیم دراز ہوگیا۔ سر کے نیچے پر دل والا تکیہ دبا لیا۔ دھنواں کبھی منہ سے اور کبھی نتھنوں سے نکالنے میں مشغول رہا۔ . . . . . . اور خوابناک نظروں سے سانولی سلونی لونڈیا کو دیکھتا رہا۔ اب وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ہچکیاں لیتی تھی۔ لیکن بس قدر گہری اور جھنجوڑ دینے والی کہ ہر ہچکی پر وہ سر سے پاؤں تک لرز جاتی تھی۔

اس نے لونڈیا کی دھلی دھلائی آنکھوں، نمی سے بوجھل پلکوں، اور کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کی جانب دیکھا —— ان دونوں کو یوں محسوس ہوا کہ اس سکوت میں گفتگو کئے بغیر بھی وہ ایک دوسرے سے واقف اور مانوس ہوگئے ہیں۔ . . . . . . لڑکی کے گالوں پہ آنسوؤں کی چوڑی اور بھدی لکیریں اسے قطعاً پسند نہیں آئیں۔ . . . . . . اور آنسو ٹپ ٹپ کرکے اس کے لباس پر بھی گرتے رہے تھے

مرد نے بستر میں پڑے پڑے ایک تولیئے کی گیند بنا کر لڑکی کی جانب پھینکی اور غیر جذباتی آواز میں کہا۔ "لو آنسو پونچھ ڈالو . . . . . . لباس بھی خراب کر لیا ہے۔ تم نے . . . . . . گالوں پر پھیلے ہوئے آنسوؤں کو تھپتھپا کر خشک کر ڈالو۔ پوڈر بالکل صاف نہ ہو جائے . . . . . . یقیناً یہ دیکھ کر مجھے بے حد مسرت حاصل ہوئی ہے کہ تم نے منہ پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی اس سے تمہارے ذوق کی پاکیزگی کا ثبوت ملتا ہے"۔

حالانکہ اس کی آواز قطعاً غیر جذباتی تھی۔ لیکن نہ معلوم اس میں کیا کشش تھی کہ لڑکی نے چپ چاپ اس کی ہدایت کے

مطابق چہرہ صاف کر ڈالا۔

آنسو پونچھ لینے کے بعد اس نے مرد کی جانب یوں دیکھا جیسے جاننا چاہتی ہو کہ اب میں کیسی دکھائی دیتی ہوں۔ لیکن مرد بے حس و حرکت اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بھڑکدار اور بے ہودہ لباس کے باوجود اس کے بدن کی رعنائی عیاں تھی۔ ہاتھ پاؤں مضبوط، کشیدہ قامت، لمبی اور لچکدار گردن اور پھر سانولا رنگ عجیب بہار دکھا رہا تھا۔

"تمہاری عمر کیا ہے؟" مرد نے بات شروع کی۔

"سترہ برس۔"

"کیا تم گاؤں کی رہنے والی ہو؟"

"جی ہاں لیکن شہر میں پڑھتی رہی ہوں۔"

"اچھا تو تم پڑھی لکھی بھی ہو؟"

"جی"

"کہاں تک؟"

"دسویں میں تھی کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"فسادات شروع ہو گئے۔"

"نہیں ——— شادی ہو گئی تھی۔"

"اچھا تو پھر تم اپنے شوہر کے ساتھ رہنے لگیں۔"

"یہی تین چار مہینے ——— پھر فساد شروع ہو گئے۔"

"اور تمہارے بچے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"مارے گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سب مارے گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صرف میں بچ گئی یا بچالی گئی۔ وہاں میری عزت کئی بار خراب کی گئی بالآخر ادھر لائی گئی لیکن جن کا سہارا لیا انہوں نے پیشہ کمانے پر مجبور کر دیا۔"

قدرے سکوت کے بعد مرد نے کہنا شروع کیا۔ "میری عمر تیس برس کی ہے۔ تقسیم سے پہلے میں سیالکوٹ میں کاروبار کرتا تھا۔ میں کوئی خاندانی رئیس نہیں تھا۔ لیکن اچھا خاصہ گزارا ہو رہا تھا۔ بیوی اور دو بچے بھی تھے ——— اب کوئی نہیں اور نہ آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ ہے۔ جب کبھی بمشکل بیس تیس روپے جمع ہو جاتے ہیں۔ تو عورت کی شکل دیکھنی نصیب ہوتی ہے۔ میری صورت کی بابت تمہارا کیا خیال ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے بال بہت ملائم ہیں لیکن جب صبح برش کرتا ہوں تو کنپٹیوں سے چند بال نکل آتے ہیں۔ میرا رنگ صاف تھا لیکن اب چہرے پر سرمئی سا غبار چھایا رہتا ہے۔ آنکھیں بڑی تو نہیں تھیں لیکن ان میں وہ چمک بھی باقی نہیں رہی۔ تم جانتی ہی ہو کہ تفکرات اور بے قاعدہ رہن سہن سے انسان کی صحت پر بہت برا اثر پڑتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہاں ——— لیکن آپ اچھے آدمی ہیں" لڑکی نے طفلانہ انداز سے کہا۔

"اچھا آدمی؟ ——— بس؟ ارے دوسری عورتیں تو میری تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتی تھیں۔ اور تم مجھے محض اچھا آدمی ہی کہتی ہو؟"

اسے لڑکی اس وقت بہت بھلی دکھائی دی جب وہ اس سوال کے جواب میں اس کی جانب دیکھے بغیر دل کش انداز میں

قدرے ہنستے ہوئے سر کو جنبش دے کر صرف لمبی سی مترنم "ہوں" کر کے رہ گئی۔

مرد نے لیٹے لیٹے پوچھا "یہ دھندا کب سے کر رہی ہو اور...... میرا مطلب ہے کہ کب سے کروایا جا رہا ہے......"

اس پر لڑکی کا منہ بھوٹنے لگا پھر سے اس کے رونے کے امکانات پیدا ہونے لگے...... بولی "ایک مہینے سے" اور پھر جیسے اس کی آواز بھرا کر رہ گئی۔

مرد نے محبت سے کہا "دیکھو بھئی! باوجودیکہ تم یہاں کے دھندے کے سلسلے میں آئی ہو یا لائی گئی ہو...... اور میں حیوانی جذبے کے تحت آیا ہوں...... یا لایا گیا ہوں...... تاہم ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ ہم شریف لوگ ہیں......"

یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب ہنسی لڑکی کے لبوں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی ہے۔ وہ جھنجھلا کر بولی "لیکن اب میں بے حد تنگ آ گئی ہوں۔ ہر روز جیب میری بابت سودے بازی ہوتی ہے...... تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میں اس قدر گہری کھڈ میں گر چکی ہوں یا گرا دی گئی ہوں کہ اب میرا یہاں سے نکلنا ناممکن ہے...... آپ...... آپ پھر بھی شریف ہیں۔ لیکن عورت کی حیثیت سے......"

"نہیں...... کیا نام ہے تمہارا...... میں تم سے زیادہ شریف نہیں ہوں اگر ہوتا تو تمہیں اور تم ایسی لاکھوں لڑکیوں کو یہ پیشہ اختیار کرنا نہ پڑتا۔"

یہ کہہ کر اُس نے کمرے میں ادھر اُدھر بے چینی سے ٹہلنا شروع کر دیا۔ اس وقت لڑکی کرسی پر بیٹھی تھی۔

وہ ٹہلتا رہا—— چند منٹ کے بعد اس نے پھر لڑکی کی جانب دیکھا کہ وہ سر جھکائے نظریں فرش پر گاڑے ہے۔ اور عمیق غور و فکر میں ڈوبی ہوئی ہے۔

"تم کیا سوچ رہی ہو؟"

وہ چُپ رہی۔

"تم چپ کیوں ہو؟"

"کچھ نہیں" لڑکی نے بے کیف آواز میں جواب دیا "یونہی۔ بیتے دنوں کو یاد کر رہی ہوں۔ اپنی زندگی کا وہ آغاز اور یہ انجام دیکھ کر دل ڈوبا جاتا ہے۔"

"...... اور شاید اسی سلسلے میں تم یہ بھی سوچ رہی ہو کہ یہ سب قتل و غارت اس لئے ہوا کیوں کہ سب کے سروں پر شیطان کا سایہ مسلط تھا۔"

"جی ہاں۔"

"لیکن یہ غلط ہے۔"

لڑکی نے قدرے متعجب ہو کر اس کی جانب دیکھا۔

چندے تامل کے بعد مرد نے پھر سلسلۂ کلام جاری کیا "درحقیقت یہ سب کچھ نیکی کی خاطر پیش آیا ہے۔ مرنے والے نیکی کی راہ میں مرے ہیں، اور مارنے والوں نے اللہ ہو اکبر، بم بم بھولے اور ست سری اکال کے نعروں کے شور میں قتل کئے ہیں۔ مجھے تو اس میں ناپاکی کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ یہ درست ہے کہ قتل ہوتے وقت مرنے والوں کو تکلیف ضرور ہوئی ہوگی۔ لیکن اب...... اب تو وہ لوگ یقیناً بہشت میں حور و غلماں سے دل بہلا رہے ہوں گے۔ یا سورگ میں گوکل کے کنھیا کی بنسری کی لے پر مسرور و شاداں

ہوتے ہوں گے۔ یا ان کی روحیں ننھے منھے رنگین پرندوں کے روپ میں سورگ کے سرسبز و شاداب درختوں کے پانی کے چشموں پر جھکی ہوئی نازک شاخوں پر جھولا جھولتے ہوں گے۔ .... سمجھیں؟"

لڑکی نے انکار کے طور پر سر ہلادیا۔

مرد نے پھر تامل کیا۔ اور کہا "بات سیدھی سادی ہے۔ قاتلوں اور لٹیروں کی نیتیں صاف تھیں۔ طرفین نے ایک دوسرے کو انسان نہیں شیطان سمجھ کر قتل کیا ہے۔ یعنی کسی مسلمان نے کسی بھی ہندو یا سکھ کو خدا کا نیک بندہ سمجھ کر قتل نہیں کیا۔ کیوں کہ خدا کے کسی بھی بندے کو جان سے مارنے کے لئے برے سے برا مسلمان بھی راضی نہیں ہو سکتا۔ اور یہی بات ادھر بھی صادق آتی ہے۔ تم کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ہم لوگ ..... یعنی ہندو سکھ اور مسلمان — وحشی نہیں ہیں۔ ہم سب نیک انسان ہیں۔ روز ازل سے سچائی اور محض سچائی کے متلاشی اور پرستار ہیں۔ بلکہ نیکی اور بدی کے معاملے میں ہماری معصومیت کا یہ حال ہے کہ ہم بڑے اطمینان سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں — اے بھولی اور نادان لڑکی! سمجھ لے اور مت بھول کہ نیکی کی راہیں بے حد دشوار ہیں ...."

"میں خاک نہیں سمجھی۔"

مرد بیٹھ گیا۔ وہ ایک دوسرے کی جانب خاموش نظروں سے تکتے رہے۔ پھر لڑکی بولی۔ "اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ میں بھی نیکی کی راہ میں ...."

"ہاں" مرد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرایا۔

لڑکی لاچار ہو کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دبانے لگی۔

مرد نے اس کی دلی کیفیت کو بھانپتے ہوئے کہا "لیکن تم یہ خیال بھی تو کرو کہ اب تم ایک گھریلو عورت کی زندگی کیونکر بسر کر سکتی ہو؟" دفعتاً اسے وہ اجنبی مرد یاد آگئے جنہوں نے فسادات کے دنوں میں بار بار اس کی عزت لوٹی تھی۔ اور پھر ہم قوم مردوں کا کارواں آنکھوں تلے سے گذرنے لگا۔ جنہوں نے اس کے واپس لائے جانے پر اسے تباہ کیا تھا — اور ایک مرتبہ پھر وہ رو پڑی ...... پھوٹ پڑی۔

"یہ بات مجھے قطعاً پسند نہیں ہے ......" مرد نے نرم لہجے میں احتجاج کرتے ہوئے کہنا شروع کیا: "تم پڑھی لکھی، سمجھدار اور نیک لڑکی ہو۔ خدا اس بات کا خیال بھی تو کرو کہ میں نے مبلغ تیس روپے اس غرض سے نہیں خرچ کئے ہیں کہ تم میرے روبرو بیٹھی رات بھر روتی رہو۔"

اس پر لڑکی فوراً چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے گوشوں میں جو آنسو ابل آئے تھے۔ وہ بھی قطرے بن کر ٹپک نہیں سکے بلکہ پلکوں ہی میں الجھ اور لرز کر رہ گئے۔

مرد نے اسی لہجے میں سلسلۂ کلام جاری رکھا "تم آزاد اور آرام دہ زندگی کی عادی ہو چکی ہو۔ اب گھر کا کام کاج کرنا شاید موافق نہ آئے۔ کہاں یہ عیش و عشرت، اور کہاں کسی غریب کے جھونپڑے کی محدود چار دیواری ...... کہاں یہ رنگین بھڑکدار لباس اور کہاں ..."

مگر دونوں کی نظریں ملیں لڑکی جنگلی بلی کے مانند بپھری بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں ......

مرد چپ ہو گیا۔ دفعتاً لڑکی کے ہاتھ اٹھے اور اس نے وحشیانہ انداز سے گریبان چاک کر ڈالا اور قمیص تار تار کر ڈالی۔ اور پھر شاید اسے رونا آنے لگا۔ لیکن وہ ہٹ دھرمی سے آنسو پی کر سر کو شدید جنبش دے کے اور ہونٹ سختی سے بھینچ کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔

اس کے بدن کا اوپر کا حصہ عریاں ہو چکا تھا۔ اس نے انگیا نہیں پہن رکھی تھی۔ شاید اس کی چھاتیاں انگیا کی ضرورت سے بے نیاز تھیں جو ڈھیلا ڈھالا کپڑا اس نے سینہ پر باندھ رکھا وہ ڈھلک گیا۔

مرد نے اُٹھ کر اس کے چیتھڑوں سے ہی اس کے بدن کو ڈھانپ دیا۔ اور خود ذرا پرے ہٹ کر پوچھا "کیا اب میں تم کو چوم سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں" لڑکی نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

وہ اس کے قریب پہنچا اس نے اس کے پریشان بالوں کو سنوارا۔ اور دھیرے دھیرے دوستانہ انداز سے اس کے گرم رخساروں اور گھنے بالوں پر چمکارنے کے انداز سے ہاتھ پھیرتا رہا۔ اس کا لڑکی کے دل پر خوشگوار اثر ہوا۔ قریب کی تپائی پر دھرے ہوئے آئینے میں دونوں کی نظریں ملیں لڑکی نے آہستہ سے کہا "میری اس ٹانگ میں سندھور پڑ چکا ہے ایک مرتبہ"

"شاید پھر پڑے" مرد نے غیر جذباتی آواز میں جواب دیا۔

اس بات کا لڑکی کے دل پر اور بھی خوشگوار اثر مرتب ہوا۔ اس کے چہرے سے خشونت کے آثار زائل ہونے لگے۔ تو مرد نے اس کے بال پرے ہٹا کر شانے کی جانب گردن کے نچلے حصے کی سب سے زیادہ پھڑکتی ہوئی رگ پر ہونٹ رکھ دیئے۔

لڑکی کو لذت اور گدگدی کا احساس ہوا۔

"لویئں ذرا دروازہ بند کر دوں" یہ کہہ کر وہ دروازے کی جانب بڑھا تو لڑکی نے اس کی جانب دیکھے بغیر خوشگوار لہجے میں کہا "آج جس مقام کا آپ نے بوسہ لیا ہے اسے پہلے کبھی کسی نے نہیں چوما...... میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میرے بدن کا یہ حصہ بالکل کنوارا ہے بے عیب اور پاک ہے......"

آواز آئی "شاید اب تمہارے بدن کے کسی بھی حصے کو کوئی اور مرد نہیں چھو سکے گا" اب کے مرد کی آواز میں جذبات کی ہلکی سی لرزش موجود تھی۔

لڑکی نے دفعتاً گھوم کر اس کی جانب دیکھا لیکن وہ اس وقت چٹخنی چڑھا رہا تھا اس کے سر کے بال قدرے بڑھے ہوئے تھے اور انہوں نے بڑھ کر اس کے نکھرے رنگ کی گردن کے کچھ حصے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ دروازہ بند کر کے فوراً لوٹ آئے...... لیکن نہ معلوم مرد نے کیوں تامل کیا وہ یوں محسوس کر رہی تھی کہ خود اس کے بدن کی طاقت بھی زائل ہو چکی ہے اور وہ کرسی سے اُٹھ نہیں سکتی...... لیکن اس نے نقاہت کے عالم میں بکمال مہر و اخلاص مرد کے سر کے پچھلے حصے کو دیکھ کر اس کے دل نے سوال کیا "کیا اس ساری غلاظت اور سڑاند کے باوجود جو میرے بدن میں داخل ہو چکی ہے۔ کیا ان سب معاشیوں کے باوجود جو میرے جسم کے ساتھ کی جا چکی ہیں کیا ان......"

اب مرد نے سر گھمایا اور لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے بھرپور نظروں سے دیکھا اس کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ جیسے وہ اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہا ہو "اے بھولی اور نادان لڑکی! سمجھ لے اور مت بھول کہ ان ساری زیادتیوں، غلاظتوں، اور بدمعاشیوں سے تیری معصومیت اور نکھر آئی ہیں......"

پھر وہ اس کی جانب قدم بقدم بڑھنے لگا۔ اب کے لڑکی اپنے آنسو نہیں روک سکی۔ وہ پھر زور زور سے رونے لگی۔ مرد نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی لیکن وہ شدتِ جذبات سے لرزتے ہوئے شانوں کو ہلا کر بلند تر آواز میں روتے ہوئے چلاتی "و نہیں میں ضرور روؤں گی" مرد چپکے سے آ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس نے پھر ایک سگرٹ سلگایا اور کمال اطمینان سے ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ لڑکی بدستور روتی رہی۔ لیکن مرد کو اس کے رونے سے کوفت محسوس نہیں ہو رہی تھی کیونکہ اب وہ اس چیز کو قطعاً گھریلو نقطۂ نظر سے دیکھ رہا تھا

اکرم افگار

وہ دور بھی آنے والا ہے

گاؤں سے پورب کی سمت گھنی تاریکی ناچ رہی ہے ندی کے اُس پار مسانوں میں دہشت سی ناچ رہی ہے
ایک گوالا ٹوٹے پھوٹے پل پر بیٹھا سوچ رہا ہے بھیگے دامن سے اپنی پلکوں سے تارے نوچ رہا ہے
دُور سا افق میں ڈوبتی، رنگتی پگڈنڈی پر کون آئے گا جو میٹھے بولوں سے اس ماحول پہ امرت برسائے گا۔
جس کے دم سے شوکتی ندی کی سانسیں رک رک جائینگی جھومتی لہراتی شاخیں جس کی تعظیم کو جھک جائیں گی
نیل گگن کی اوٹ سے چندا جسکو جھانک کے شرمائے گا کون آئیگا۔ اب اس ویرانے میں آخر کون آئے گا

ایک گوالا ٹوٹے پھوٹے پل پر بیٹھا سوچ رہا ہے
بھولی بسری یادوں کے آکاش سے تارے نوچ رہا ہے
سورج ڈوب چکا تھا، دھیرے دھیرے ظلمت پھیل گئی تھی دُور، ندی کے اس جانب، مرگھٹ میں دہشت پھیل گئی تھی
دیکھتے دیکھتے دُور اسی مرگھٹ میں اک شعلہ سا بھڑکا دو لمحوں کو اُس کی آنکھیں پتھرائیں، دل زور سے دھڑکا
دہشت کا یہ عالم — اُس کا جسم الاؤ بن سا گیا تھا لیکن اپنی لاٹھی پر ٹھوڑی ٹیکے وہ تن سا گیا تھا
منت مان کے اک البیلی اسکی جانب لپک رہی تھی
دھڑکتے دل کی دہشت سہمے سہمے پلکیں جھپک رہی تھی
پھر نیلے آکاش سے چندا جھانک کے شرمایا بھی اندھیاروں نے میٹھی لَے میں پیار بھرا نغمہ گایا بھی
لیکن اُس دن اُنکے بیچ میں سونے کی دیوار کھڑی تھی اوشا کی ادھ کھلی نشیلی آنکھوں میں ساون کی جھڑی تھی
دھول اَٹے تھے بال، نگاہیں بھی مسکانا بھول گئی تھیں آشاؤں کے مندر میں جو دیپ جلانا بھول گئی تھیں
ہونٹوں کی چہکار میں لاکھوں کے بیوپار سموئے ہوئے تھے
اور گوالے کی راہوں میں اُس نے کانٹے بچھے ہوئے تھے

وہ دھرتی کا بوجھ بنا، چاندی کی جھنکاریں سنتا تھا اپنی زندہ لاش نراشا کی دیواروں میں چنتا تھا
اس کے سامنے امرت تھا لیکن اس کو پیاسا مرنا تھا یا پھر ایک کدال کے بل پر کچھ سونا پیدا کرتا تھا
ورنہ جینا تو کیا، جیون سے مرنے کے آثار نہیں تھے خالی ہاتھوں الفت کا دم بھرنے کے آثار نہیں تھے
کنگلا اور سیمیں مسکاہٹ۔ اس دنیا کی ریت نہیں ہے بھوکے ننگے انسانوں کی پریت تو کوئی پریت نہیں ہے

اس دن کیا جانے کیوں سمٹی تھی مایوسی رنگ ترنگ میں لیکن پریم جوالا بھڑک رہی تھی اس کے انگ انگ میں
جس کو نیل گگن سے تارے توڑنا کھیل نظر آتا تھا جس کا عزم پہاڑوں سے بھی ٹکرا کر اتراتا تھا،
جو آدرشا کی خاطر سونے کے سو دام بنا سکتی تھی جو دھرتی کیا، اس آکاش کو اپنا رام بنا سکتی تھی
اس نے اپنی مایوسی امیدوں کے سانچے میں ڈھالی اس نے اپنی لوہے کی باہوں میں ایک کدال سنبھالی
راتیں جاگا، نیندیں تیاگیں اور کوڑی کوڑی دھن جوڑا پیٹ پہ پتھر باندھا، دنیا کی آسائش سے منہ موڑا
جوڑ رکھے یا جسم تپایا، بس من کو ایک ہی دھیان میں پایا کھائی بھانکی، مٹی پھانکی، آشاؤں کا محل بنایا
تب اس کا دل کہتا تھا۔ "جگ میں اس کی من مانی ہوگی سونے کا انبار لگے گا، محل بنے گا، رانی ہوگی"

بھیگا ساون، ٹھٹھرتا جاڑا۔ پھر ساون پھر جاڑا آیا اور نہ جانے کتنی بار مسانوں پر شعلہ لہرایا
لیکن اس اندھیر نگر کے اندھے راجے، بہرے بھی تھے جیٹھ کٹی آدرشا کے لئے ایک ایک قدم پر پہرے بھی تھے
چیت کی پچھلی راتوں نے اس کو پھولوں کی سیج پہ تولا اور گوالے کی تقدیر میں چپکے سے زہراب سا گھولا
جس نے اس امید پہ اپنی آسائش کا خون کیا تھا راتیں جاگ کے، نیندیں تیاگ کے، مٹی پھانکی، خون پیا تھا
جس نے اس امید پہ رنج سہے، کوڑی کوڑی دھن جوڑا امرت رس کی کھوج میں دھرتی کے سینے سے زہر نچوڑا
شاید دور اسی مرگھٹ میں پھر سے کوئی شعلہ بھڑکے پھر سے اس کی امیدیں انگڑائی لیں، دل زور سے دھڑکے
شاید منت مان کے کوئی البیلی لہراتی آئے نیل گگن کی اوٹ سے چندا جس کو جھانک کے شرما جائے
وہ اس کی میٹھی باتوں میں چاندی کی جھنکار سنے گا اس کے گرد وہ ہنستے ہنستے سونے کی دیوار چنے گا

لیکن دور، افق میں ڈوبتی پگڈنڈی ویران پڑی ہے،
اور ندی کے پار مسانوں میں وحشت حیران کھڑی ہے

"ٹھُنٹھر تا جاڑا ، بھیگی برکھا — پھر جاڑا ، پھر برکھا بیتی
کھاتی بھاگی ، ہٹی بھاگی ، آشاؤں کی بازی جیتی ،

جوڑ دُکھے یا جسم تپا بس من کو ایک ہی دھیان میں پایا
لیکن دُور مسانوں پر کیوں منڈلاتی ہے غم کی چھایا

بس ساون جاڑے کے پھیر میں بیت گئے سب دُکھ سُکھ میرے
غم کی اوٹ سے جھانکنے والے ، سُکھی سویرے ، سُکھی سویرے !

لیکن دُور ، مسانوں میں دہشت کی باچھیں کھل جاتی ہیں
اور گولے کی پلکیں موتی برسا کر بل جاتی ہیں !

دیکھتے دیکھتے راتیں دن میں ، دن راتوں میں ڈھل جائیں گے
ندی کے اُس پار مسانوں میں شعلے سے لہرائیں گے

دہشت سے جب کوئی گوالا تپتی جلتی بن جائے گا
"یہ لیگلا" لوٹوں کی تھدی بھینچ بھینچ کر مُسکائے گا

"کنگلا اور سہمیں مسکاہٹ - اس دنیا کی ریت نہیں ہے
بھوکے ننگے انسانوں کی پریت تو کوئی پریت نہیں ہے

تیرا بھی انجام یہی ہے ، ٹُنا پُل ، قسمت کا رونا ،
(بس ساون جاڑے کے پھیر میں ٹوٹ گیا آشا کا کھلونا)

تو بھی لیگلا ، میں بھی لیگلا اور نہ جانے کتنے ہم سے
گھلتے جائیں گے شعلوں کی حسرت میں شعلوں کے غم سے

پھر راتیں دن اور دن راتوں کے سانچے میں ڈھل جائیں گے
سورج بچارے کے پیمانے بھی وقت کے ساتھ بدل جائیں گے

اک دُوجے کا دُکھ بانٹیں گے پھر ہم ایک ہی رنگ کے ہوں گے
پھر اس کی جھنکار میں سونے چاندی کی جھنکار نہ ہوگی

جس کے میٹھے بولوں نے ماحول پہ امرت برسایا تھا
نیل گگن کی اوٹ سے چندا جس کو جھانک کے شرمایا تھا "

خواجہ احمد عباس

میرا بیٹا میرا دشمن

"بہت اچھا! اب میں کبھی آپ کو اپنی شکل نہ دکھاؤں گا۔"

بار بار یہ الفاظ ٹھاکر کرشن سنگھ کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اس کو چڑا رہے تھے۔ اس کو غصہ دلا رہے تھے۔ اسے پریشان اور حیران کر رہے تھے۔

اس کے بیٹے کی یہ مجال کہ نہ صرف باپ کی حکم عدولی کرے بلکہ جواب دینے کی جرأت کرے اور اپنی ہٹ پر قائم رہے؛ سچ مچ گھر چھوڑ کر چلا جائے۔

وہ چلا گیا تھا۔ سنگِ مرمر کے فرش پر اس کے بے پالش کئے ٹوٹے اور کیلیں نکلے ہوئے جوتوں کی گونجتی ہوئی آواز میں قطعیت تھی، ایک عجیب خوفناک عزم تھا۔ ایک اعلانِ جنگ تھا جیسے وہ کہہ رہے ہوں "میں اب کبھی واپس نہیں آؤں گا کبھی نہیں کبھی نہیں......"

اپنی رعب دار کھچڑی مونچھوں کو حسبِ عادت غیر شعوری طور پر تاؤ دیتے ہوئے کرشن سنگھ نے سوچا "دنیا کو کیا ہو گیا ہے؟ کسان زمینداروں سے باغی ہو رہے ہیں! بیٹے باپ کی نافرمانی کر کے گھر چھوڑ رہے ہیں؟ ہزاروں سال کے رشتے ٹوٹ رہے ہیں۔ صدیوں کے سماجی اصول مٹی میں مل رہے ہیں۔ ملک کے ہی دو حصے نہیں ہوئے ہر خاندان کے ٹکڑے ہو رہے ہیں۔ بیٹا باپ سے، بیٹی ماں سے، پتی پتنی سے الگ ہو رہا ہے۔ پشتوں تک مشترکہ رہے ہوئے خاندانوں میں پھوٹ پڑ رہی ہے، بھائی بھائی سے الگ ہو رہا ہے۔ آخر کیوں؟"

یہ سوال اس کے دماغ کی دیواروں سے ٹکرا کر گونجا۔

آخر کیوں؟

اس نے یہ سوال اپنے دیوان خانے کی دیواروں سے کیا۔ اپنے باپ دادا پرداداؤں سے کیا جن کی بے جان روغنی تصویریں دیواروں پر لگی ہوئی اپنی بے جان آنکھوں سے اسے گھور رہی تھیں۔ شری کرشن مہاراج اور ان کی پیاری رادھا سے کیا۔ جن کی مورتیاں اس کے اور دنیا کے مسائل سے بے خبر اپنے امر پریم میں کھوئی ہوئی تھیں۔ مہاتما بدھ اور مہاتما گاندھی کے سنگین مجسموں سے کیا جو طاقوں میں رکھے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ کھدر کے ترنگے جھنڈے سے کیا جو دیوار پر آویزاں تھا۔ بھارت ماتا سے کیا جو سنہری تاج پہنے تصویر کے فریم میں سے جھانک رہی تھی۔ اونچے نقشین پتھر کے ستونوں سے کیا جو چھت کو سر پہ اٹھائے کھڑے تھے۔ قانون کی مجلد کتابوں سے کیا جو شیشے کی الماریوں میں سجی ہوئی تھیں۔ دیوار پر لگے ہوئے کیلنڈر سے کیا جو وقت کے پرندے کی طرح ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ ٹک ٹک کرتے ہوئے گھنٹے سے کیا جو نہ جانے کیا پیغام دے رہا تھا۔ لوہے کی تجوری سے کیا جو کونے میں رکھی ہوئی تھی۔ اور جس میں کئی لاکھ کے نوٹ جواہرات اور ملکیات اور جائداد کے کاغذات بند تھے۔ اور آخر میں اپنی دودھ جیسی سفید کھدر کی گاندھی ٹوپی سے کیا جو اسی تجوری پر ایسے رکھی ہوئی تھی جیسے تخت پر تاج رکھا ہو!

یہ بے چینی! یہ افراتفری! یہ بغاوت! یہ حکم عدولی! سماج کے پرسکون پانی میں یہ تلاطم! آخر کیوں؟ —— آخر کیوں؟

اس کے ساکت لبوں سے نکلا ہوا یہ خاموش سوال ربڑ کی گیند کی طرح ہر دیوار، فرش اور چھت سے بار بار ٹکرایا۔ مگر کہیں سے کوئی جواب نہ ملا۔ تصویریں، بت، دیواریں —— ہر چیز خاموش تھی اور شاید حیران! دیوان خانہ ہی نہیں سارا مکان ویران معلوم ہوتا تھا۔ ایک بیٹے کے چلے جانے سے ہر کمرہ سنسان ہو گیا تھا۔ ہر چیز بیکار نظر آتی تھی۔ جیسے اس کا ضدی، بدتمیز، نافرمانبردار، ناخلف مگر پیارا بیٹا اس

مکان کی ساری روح نکال کر لے گیا ہو۔ یا شاید وہ خود ہی اس مکان کی روح
تھا۔ اس کی زندگی تھا۔ اور اس کے جانے کے بعد یہ عالیشان سجا ہوا مکان
مر چکا تھا۔ مصر کے بادشاہوں کے مقبروں کی طرح جن میں لاش کے ساتھ
دنیا کی ہر آسائش اور زیبائش دفن کر دی جاتی تھی۔ سوائے زندگی کے!

(۲)

اس کا بیٹا —— آنند

پچیس برس ہوئے اس نے اس کا نام آنند رکھا تھا۔ کیونکہ بیٹے کی
پیدائش پر اس کو جتنا آنند ملا تھا۔ وہ زندگی میں کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔
اس کا بیٹا اس کے جیون میں سچ مچ آنند ہی بن کر آیا تھا۔ جس دن
اس کی پیدائش ہوئی۔ اسی دن کرشن سنگھ نے ضلع مجسٹریٹ کی عدالت میں
اپنا پہلا مقدمہ جیتا تھا۔ قانونی حلقوں میں نوجوان وکیل کی اس کامیابی
کا کتنا چرچا ہوا تھا۔ اس کے بعد اسے کتنے ہی بہت سے اہم مقدمے ملے تھے۔
مگر ان سب باتوں سے زیادہ خوشی اسے یہ تھی کہ اس نے ایک بے گناہ کو جو
اتفاق سے قانون کے مہیب شکنجے میں پکڑا گیا تھا پھانسی سے بچا لیا تھا
اس غریب کسان کی آنکھوں میں اَن کہے تشکر کی چمک جو اس دن کرشن سنگھ
نے دیکھی تھی اس نے مدت تک آدرش کے راستے کو روشن رکھا۔ انصاف
اور انسانیت —— یہی اس نے اپنے پیشے کا مقصد سمجھا!

انصاف، انسانیت اور آزادی! نوجوان کرشن سنگھ نے جب ایک
لیڈر کی زبانی آزادی کا نعرہ پہلی بار سنا تھا تو اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ یہ
اُسی کے دھڑکتے ہوئے دل کی صدائے بازگشت ہے، اُسی کے جوان
خون کی پکار ہے۔

آنند چار برس کا تھا جب کرشن سنگھ پہلی بار جیل یاترا گیا۔ تین برس
مختلف قید خانوں میں کٹے مگر اس عرصے میں وہ ایک بار بھی ہراساں نہ
ہوا۔ ایک بار بھی اس نے فرض سے منہ نہ موڑا۔ آزادی کی سندر دیوی نے
رادھا بیوی کی یاد اور بچے کے پیار کو بھلا دیا۔ مگر رہائی سے چند مہینے پہلے
اسے بچکانے ہاتھ کا غلط املا میں لکھا ہوا ایک خط ملا: "لے رہے پی یا
رسے پی تا جی نا مس تے" اور سوچ کی آزاد کرنوں کی طرح جیل کی سنگین
دیواروں پر سے ہوتی ہوئی ایک خوشگوار یاد اس کی کال کوٹھری کو منور کر گئی۔ ایک بھولے
بھالے گھونگھر والے بالوں والے چہرے کی یاد —— ایک چہرہ جو اسکی اپنی تصویر تھا
اس کی معصومیت کی تصویر —— اس کی اور رادھا کی محبت کی یادگار کاغذ
پر پیارے اور بھولے انداز میں ٹیڑھے میڑھے مکوڑوں کی طرح پھیلے ہوئے الفاظ
میں سے وہ ننھا سا چہرہ مسکرا رہا تھا۔ اسے بلا رہا تھا۔ اتنے دنوں تک نہ
آنے کی شکایت کر رہا تھا۔ چند لمحوں کے لئے کرشن سنگھ کا آدرش متزلزل
ہو گیا۔ آزادی کی دیوی کا روشن چہرہ مدھم پڑ گیا۔ قیدی کا جی چاہا کہ لوہے
کی سلاخیں توڑ کر بھاگتا ہوا بیوی بچے کے پاس پہنچ جائے۔ مگر بیٹے کے
خط کی چند سطریں ہی پڑھی تھیں کہ اسے اپنی وقتی کمزوری پر شرمندگی
محسوس ہونے لگی۔ ساتھ ہی بیٹے کی سپرٹ دیکھ کر اس کا دل فخر سے بھر
گیا۔ خط میں لکھا تھا "آپ ماتا جی کی طرف سے نہ گھبرائیں۔ میں جو ہوں سے
وا اور دیکھ بھال کو ہوں۔ ماتا جی کہتی ہیں تم بھی پتا جی جیسے
بننا۔ سو میں نے بھی سوچ لیا ہے۔ آپ رہی کی تو اسے میں بھی ان کی
لابی ہوں گا" اس کا بیٹا اس کے نقشِ قدم پر چلے گا۔ انقلابی بنے گا۔
یہ سوچ کر کرشن سنگھ کا دل فخر سے بھر گیا۔

اس کے چند ہفتوں بعد معلوم ہوا کہ اس کی بیوی بیمار ہے۔ بیٹے
نے لکھا "ماتا جی بہت دبلی ہو گئی ہے اور آپ کو بہت یاد کرتی
ہے" چند دوستوں نے صلاح دی کہ سرکار میں عرضی دے دو کہ بیوی کی
بیماری کی وجہ سے "پیرول" پر عارضی طور سے رہا کر دیا جائے۔ مگر رادھا
نے خود کانپتے ہاتھوں سے لکھ کر بھیجا "آپ میری وجہ سے ہرگز پریشان نہ
ہوں اور کسی حالت میں بھی سرکار سے "پیرول" کی درخواست نہ کریں۔
میں نہیں چاہتی کہ میری خاطر آپ کی گردن کسی کے سامنے جھکے۔ اگر قسمت
ہوئی تو آپ کے چھٹنے پر آپ کے درشن کر ہی لوں گی"

کرشن سنگھ نے "پیرول" کی درخواست پھاڑ کر پھینک دی۔

پھر گاندھی ارون صلح نامہ ہو گیا۔ کرشن سنگھ کو بھی دوسرے کانگریسی
قیدیوں کے ساتھ چھوڑ دیا گیا۔ اپنے شہر پہنچا تو وہاں اس کا جلوس نکالا گیا۔ مگر
گھر پہنچا تو اس کے سواگت کو رادھا موجود نہ تھی۔ آنند جو اب تین سال پہلے کے
مقابلے میں کتنا لمبا ہو گیا تھا دروازے پر چپ چاپ کھڑا تھا۔ باپ کو دیکھ
کر اس کے چہرے پر ذرا سی بھی مسکراہٹ نمودار نہ ہوئی۔ صرف خاموشی سے
آنکھیں اٹھا کر دیکھا جن میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ پھر وہ بولا "پتا جی آپ
نہیں آئے اور ماتا جی چلی گئیں"

(۳)

(۴)

اس کے بعد وہ اور اس کا بیٹا دنیا میں اکیلے رہ گئے تھے۔ وہ باپ بیٹا ہی نہیں ایک دوسرے کے دوست بھی تھے۔ کرشن سنگھ کچہری سے آکر آرام کرسی پر لیٹ جاتا اور آنند سے کہتا "کیوں آنند آج اسکول میں کیا ہوا؟" اور بیٹا اسکول کی ہر بات سناتا "آج ہمارے ماسٹر جی کی بکری نے دو ننھے ننھے بچے دیئے۔۔۔۔ آج میں جامن کے پیڑ پر سے گر پڑا۔۔۔ یہ دیکھئے ٹخنے میں چوٹ آئی ہے۔۔۔۔ آج اسکول کے سامنے سے انگریزی فوج جا رہی تھی۔ بالکل لال لال منہ والے بندروں کی طرح تھے وہ سب ہمیں ایسے گھور رہے تھے جیسے کھا جائیں گے۔ کئی لڑکے تو ڈر کر بھاگ گئے۔ پر میں بالکل نہیں ڈرا پتا جی"

اور اس نے کہا "شاباش بیٹا، تم سے یہی امید تھی"

پھر ایک دن جب آنند دس برس کا ہو گیا تھا اس نے اسکول سے آکر کہا تھا "پتا جی مجھے اسکول سے نکال دیا گیا ہے۔ میں گاندھی ٹوپی پہن کر جاتا ہوں نا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کئی بار ٹوک چکے تھے۔ آج کوئی انگریز انسپکٹر آیا تھا۔ ٹوپی دیکھ کر میرے ہی پیچھے پڑ گیا۔ کہنے لگا "انگریزی سرکار کی برکتیں بیان کرو" میں نے کہہ دیا کہ میرے پتا جی اور ہزاروں دیش بھگتوں کو کئی کئی برس کال کوٹھڑی میں قید رکھا۔ اس سے بڑی برکت اور کیا ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔ یہ سن کر وہ جل ہی تو گیا۔ دونوں ہاتھوں پر چھ چھ بید لگائے۔ یہ دیکھئے نشان پر، پتا جی، میں بالکل نہیں رویا، ۔۔۔۔ بالکل نہیں۔۔۔۔" اور یہ کہتے کہتے وہ باپ سے لپٹ کر رو پڑا تھا۔۔۔

اتنے برس بعد بھی کرشن سنگھ کو اپنے گالوں پر بیٹے کے آنسوؤں کی نمی محسوس ہو رہی تھی۔

آنند کو پڑھنے کے لئے بنارس بھیج کر وہ گھر میں اکیلا رہ گیا تھا۔ اس کا سارا وقت قانونی کتابوں کی چھان بین میں، مقدمات کی تیاری میں یا مقامی سیاست کے جھگڑوں قصوں میں کٹتا۔ اس کی وکالت کی شہرت چمک اٹھی تھی۔ ضلع کی عدالت میں اب کوئی وکیل اس کے مقابلے کا نہ تھا۔ چند سال بعد ہی ہائیکورٹ تک میں اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ ماہوار آمدنی کئی سو سے کئی ہزار روپے تک پہنچ گئی۔ اب وہ مقدمہ ہاتھ میں لینے سے پہلے یہ نہ پوچھتا تھا کہ ملزم بے قصور ہے یا قصوروار بلکہ صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ اس کی فیس دینے کے قابل ہے یا نہیں۔

ہر اعتبار سے کرشن سنگھ ترقی کر رہا تھا۔ ضلع کی عدالت سے ہائیکورٹ۔ میونسپل کمیٹی کی ممبری سے صدارت۔ اور تحصیل کانگرس کمیٹی سے ضلع کانگریس کمیٹی تک جا پہنچا تھا۔ صوبہ کمیٹی کے اگلے چناؤ میں اس کا آجانا یقینی تھا۔ آنے والے اسمبلی الیکشن میں اسے کانگریس کی طرف سے کھڑا کرنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اس نے سوچا۔ آنند چھٹیوں میں گھر آئے گا تو ان بدلے ہوئے حالات کو دیکھ کر کتنا خوش ہوگا؟

آنند جب آیا تو باپ یہ دیکھ کر بہت مطمئن ہو گیا کہ بیٹے کے سوٹ کیس ہی میں نہیں بستر میں بھی کتابیں بندھی ہوئی تھیں۔ "اس کا مطلب ہے" اس نے سوچا کہ وہ اور لڑکوں کی طرح آوارگی اور عیاشی میں وقت ضائع نہیں کرتا" مگر ان میں سے زیادہ کتابیں کالج کے کورس کی نہیں تھیں بلکہ انگریزی، ہندی کے شاعروں کے دیوان تھے۔ یا مختلف ملکوں کے انقلاب کی تاریخیں "شاباش بیٹا مجھے یقین ہے تم بھی باپ کی طرح سیاست دان ہی بنو گے" پر آنند نے کہا تھا "معاف کیجئے پتا جی میں سیاست دان نہیں انقلابی بننا چاہتا ہوں" اور کرشن سنگھ نے کسی قدر کھسیانی ہنسی ہنس کر کہا تھا "انقلاب لانا تو ہم سب ہی چاہتے ہیں" پر نہ جانے کیوں آنند کے چہرے سے کچھ ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے اسے یقین نہ آیا ہو۔

آنند کو چھٹیوں میں آئے ہوئے ابھی چند ہی روز گذرے تھے۔ کہ ایک دن کوئی کسان آیا۔ زمیندار نے اسے بیدخل کر دیا تھا۔ اور زمیندار کے لٹھ بند گرگوں نے کسان کو مار اپیا بھی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کرشن سنگھ مقدمہ لڑ کر اس کی زمین بحال کرا دے۔ "وکیل صاب" اس نے گڑ گڑا کر کہا تھا "میری زمین واپس دلوا دو میں ساری عمر تمہارے بال بچوں کو دعا دوں گا" مگر کرشن سنگھ کے منشی نے ڈانٹ کر پوچھا "ابے وکیل صاحب کی فیس ہے تیرے پاس" کسان نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی چادر کے پلو میں بندھی ہوئی گرہ میں سے پانچ روپے کا مسلا ہوا نوٹ نکالا تھا۔ ۔۔۔۔ اور منشی نے اسے دھکے مار کر کمرے کے باہر کر دیا تھا۔ اور اس وقت آنند کہیں باہر سے واپس ہوا تھا۔ اتنے برسوں کے بعد بھی وہ گفتگو کرشن سنگھ کے کانوں میں

...ونج رہی تھی۔ جیسے وہ آج کے ڈرامے کا پہلا ایکٹ ہو۔

"کیوں پتا جی آپ نے اس کسان کا مقدمہ کیوں نہیں لیا؟"

منشی نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا "چھوٹے ٹھاکر یہ ...سانے تو نہ جانے کہاں سے آجاتے ہیں۔ پلے دمڑی نہیں اور چلے ہیں ...نا بڑا وکیل کرنے۔ کر لیگا کوئی پھٹیچر مختار۔"

"میں پتا جی کا جواب سننا چاہتا ہوں۔"

"بیٹا منشی جی ٹھیک کہتے ہیں۔"

"تو آپ اس کا مقدمہ لے لیجئے۔ فیس میں دونگا۔"

چند لمحوں کے لئے کرشن سنگھ لاجواب ہو گیا۔ پھر اس نے کہا "پر بیٹا ...ں اس کا مقدمہ نہیں لے سکتا۔ جانتے ہو یہ کسان کس کا مزارعہ تھا۔"

"کس کا؟"

"تمہارے دادا کا میرے پتا جی کا۔"

"اس لئے آپ اسے انصاف سے محروم رکھنا چاہتے ہیں؟"

"اگر اس طرح کے مقدمے لے کر ہم ان کسانوں کو شہہ دیتے رہے ...یہ لوگ تو سر پر چڑھ جائیں گے۔ یہ ہمارا نجی سوال نہیں، ساری زمیندار ...ی کا سوال ہے۔ کل یہ ہم زمینداروں کی بے دخلی پر تل جائیں گے۔"

"وہ تو ایک دن ہوگی ہی۔"

"تم تو بچوں جیسی باتیں کرتے ہو۔"

"بچوں جیسی باتیں نہیں پتا جی آپ جیسی باتیں کر رہا ہوں جیسی ...یں آپ کبھی کیا کرتے تھے۔"

اور اگلے دن آنند نے کہا تھا "مجھے امتحان کی تیاری کرنی ہے ...س لئے چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے ہی بنارس واپس جانا چاہتا ہوں۔"

...باپ نے اسے روکنے کے لئے جھوٹوں بھی اصرار نہ کیا تھا۔

(۴)

اس دن سے باپ اور بیٹے کے خیالات اور محسوسات کے ...یان ایک ناقابل عبور خلیج سی حائل ہوتی گئی تھی۔ کبھی کبھی چھٹیوں میں ...ند گھر آتا اور کسی مسئلے پر بحث چھڑ جاتی تو کرشن سنگھ کو ایسا محسوس ...تا کہ اس کا بیٹا کسی اور ہی دنیا کا باشندہ ہے۔

ٹھاکر کرشن سنگھ صوبہ کانگرس کمیٹی میں لے لئے گئے اور اسمبلی کے ممبر بھی بن گئے۔ مگر آنند نے باپ کو مبارک باد نہ دی۔

آنند کو آل انڈیا ڈیبیٹ میں پہلا انعام ملا۔ مگر ٹھاکر کرشن سنگھ ایم ایل اے کو کوئی خوشی نہ ہوئی۔ کیونکہ بحث کا مضمون تھا "سوشلزم ہی میں ہندوستان کی نجات ہے۔" اور آنند نے اس کی موافقت میں دھوآں دھار تقریر کی تھی۔

ٹھاکر کرشن سنگھ ایم۔ ایل۔ اے نے زمیندار کانفرنس کی صدارت کی۔ آنند سوشلسٹ پارٹی میں شریک ہو گیا۔

آنند نے ایک سوشلسٹ پرچے میں ذات پات اور فرقہ وارانہ جماعتوں کے خلاف مضمون لکھا۔

ٹھاکر کرشن سنگھ ایک مہاراجہ کا مقدمہ پریوی کونسل میں لڑنے کے لئے ولایت گئے اور کئی لاکھ روپے فیس کے وصول کر کے لوٹے۔

آنند کو یونیورسٹی سے انقلابی ہونے کے جرم میں نکال دیا گیا۔

جب جنگ شروع ہوئی تو ٹھاکر کرشن سنگھ نے دوسرے ستیا گرہیوں کی طرح سپرنٹنڈنٹ پولیس کو اطلاع دی کہ وہ فلاں وقت ستیہ گرہ کریں گے اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نے نہایت مؤدبانہ طریقہ سے ان کو گرفتار کر کے اے۔ کلاس قیدی بنا دیا۔ تین ماہ کے بعد ٹھاکر کرشن سنگھ نے جیل سے نکل کر کھدر پرچار کا "تعمیری" کام شروع کر دیا۔ اور اپنے ایک دوست کے نام سے انگریزی فوج کو جوتے سپلائی کرنے کا ٹھیکہ لے لیا جس سے چند سال میں انہیں کئی لاکھ کا منافع ہوا۔

آنند نے جنگ کی مخالفت میں جلوس نکالا اور لاٹھی چارج کے بعد ایک نامی نے اسے اپنے فولادی جوتے سے ٹھوکر ماری۔ وہ جوتا جو شاید اس کے باپ ہی نے فوج کو سپلائی کیا تھا۔

۹ اگست سنہ ۴۲ء کو ٹھاکر کرشن سنگھ نہایت اہتمام سے دوسرے لیڈروں کے ساتھ سپیشل ٹرین میں بٹھا کر کسی نامعلوم مقام پر لے جائے گئے اور وہاں ایک پرانے مگر آرام دہ قلعہ میں انہیں "شاہی مہمان" بنا دیا گیا۔

۹ اگست سنہ ۴۲ء کو آنند نے بمبئی میں لاٹھیاں کھائیں۔ رلانے والی گیس سونگھی۔ اور قومی جھنڈا لہرانے کے جرم میں پٹا بھی اور پکڑا بھی گیا۔

نظر بندی کے دوران میں ٹھاکر کرشن سنگھ نے شریمد بھگوت گیتا

کا پاٹھ کیا۔ اور یوگا کے فلسفے کا مطالعہ کیا۔

جیل میں آنند نے کارل مارکس کی کتاب "سرمایہ" کا مطالعہ کیا۔

نظر بندی کے دوران میں سرکار نے ٹھاکر کرشن سنگھ کو اپنا باورچی بلا لینے کی اجازت دے دی جو روز ان کے لئے پوری کچوری اور مٹھائی بنانے لگا جیسے وہ ان کے گھر میں پکایا کرتا تھا۔

دوسرے سیاسی قیدیوں کے ساتھ آنند نے بھوک ہڑتال کی اور سترہ دن تک فاقے کئے۔

ٹھاکر کرشن سنگھ کا وزن نظر بندی کے دوران میں دس پونڈ بڑھ گیا۔

قید بامشقت اور بھوک ہڑتال کی وجہ سے آنند کا وزن پندرہ پونڈ گھٹ گیا۔

اور پھر آنند جیل سے بھاگ گیا۔ "انڈر گراؤنڈ" ہو گیا۔ انقلابی تحریک کا کام کرتا رہا۔ ایک بار پولیس سے "مٹھ بھیڑ" ہونے پر اس کی ٹانگ میں گولی لگی۔ مگر وہ اسے گرفتار نہ کر سکی۔

ایک گاؤں میں کئی مہینے تک آنند ایک انقلاب دوست کسان کے ہاں بیمار پڑا رہا۔ وہیں اس نے اخبار میں پڑھا کہ اس کے باپ نے جیل سے پریس کو ایک بیان بھیجا ہے کہ "میں اپنے بیٹے کی دہشت پسندانہ انقلابی کارروائی کی مذمت کرتا ہوں۔ ایسے سرپھرے نوجوان ملک کی آزادی کی راہ میں کانٹے بو رہے ہیں"

پھر حکومت اور کانگریس کے درمیان صلح کے لئے گفت و شنید شروع ہو گئی اور ٹھاکر کرشن سنگھ دوسرے لیڈروں کے ساتھ رہا کر دیئے گئے۔ چند مہینے بعد آنند کا وارنٹ بھی منسوخ ہو گیا۔ باپ سے ملنے اور چند ہفتے آرام کرنے وہ گھر آیا۔ کرشن سنگھ نے دیکھا کہ گولی کے زخم اور "انڈر گراؤنڈ" کی مصیبتوں کی وجہ سے اس کا بیٹا ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا ہے یہ دیکھ کر چند لمحوں کے لئے وہ تمام سیاسی اختلافات بھول گیا۔ اس نے بیٹے کو گلے سے لگا لیا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

تین جون کا اعلان ہو گیا۔

ہندوستان کا بٹوارہ ہو گیا۔ ہندوستان آزاد ہو گیا۔ فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گئے۔ آنند نفرت کی آگ بجھانے اور اپنے مسلمان ساتھیوں کی جان اور آبرو بچانے میں مصروف ہو گیا۔ اس کا دوست اور انڈر گراؤنڈ زمانے کا ساتھی سلیم بہار میں اپنے گاؤں میں گھر گیا تھا۔ آنند اسے اور اس کے بوڑھے ماں باپ اور بہن کو بچا کر اپنے ساتھ لے آیا۔ اس کا خیال تھا کہ باوجود تمام اختلافات کے اس کا باپ ان قوم پرست مسلمانوں کی پوری حفاظت کرے گا۔

مگر کرشن سنگھ نے بیٹے سے کہا "اپنے مسلمان دوستوں کو کہیں اور ٹھیرا دو۔ لوگ ہم پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں کہ ہم نے مسلمانوں کو پناہ دے رکھی ہے"

آنند نے کہا "وہ مسلمان ہی نہیں قوم پرست ہیں۔ آپ کے کانگریس کے ساتھی ہیں"

اور دیش بھگت کرشن سنگھ نے کہا "ٹھیک ہے مگر جانتے ہو آج پاکستان میں کیا ہو رہا ہے؟"

آنند نے جواب دیا "وہی ہو رہا ہے جو یہاں ہو رہا ہے۔ جو آپ کے دل میں ہو رہا ہے" اور اسی رات وہ اپنے دوست کے خاندان کو لے کر کہیں چلا گیا۔

کرشن سنگھ کے دماغ میں سینما کے پردے کی طرح یہ واقعات ابھرتے رہے، دھندلے ہوتے رہے۔ مٹتے رہے اور پھر ابھرتے رہے اس کے دوست کبھی کبھی اس سے کہتے "ٹھاکر صاحب۔ آپ نے بیٹے کو بہت ڈھیل دے رکھی ہے۔ وہ سرپھرا اور باغی ہوتا جا رہا ہے" تو وہ جواب دیتا "ابھی جوان ہے۔ جوانی میں سب ہی باغی اور انقلابی ہوا کرتے ہیں۔ میں بھی تو ایسا ہی تھا" اسے یقین تھا کہ جب جوانی کا وقتی جوش دھیما پڑ جائے گا۔ تو آنند جسمانی اور نفسیاتی دونوں اعتبار سے "گھر واپس آ جائے گا"

مگر وہ گھر واپس نہ آیا۔ آیا تو بیٹے کی حیثیت سے نہیں۔ دشمن بن کر۔ ٹھاکر کرشن سنگھ نے "ایثار اور قربانی" کے سلسلے میں وزارت کی کوشش نہ کی تھی۔ صوبہ کانگریس کمیٹی سے بھی علیحدہ ہو چکے تھے۔ زیادہ تر وکالت کے کام میں مصروف رہتے۔ مگر قومی حکومت بننے کے بعد انہوں نے سوچا۔ کہ قومی صنعت کو ترقی دینا ان جیسے دیش بھگت کا فرض ہے۔ خصوصاً جب کہ زمینداری ختم ہونے کے قریب تھی۔ اس نے کئی اور

دوستوں کے ساتھ مل کر "Quit India" کرنے والی ایک انگریزی کمپنی سے کانپور میں دو تین کپڑے کے کارخانے خرید لئے تھے۔ ذاتی رسوخ کی وجہ سے سرکاری ٹھیکے اور دیگر مراعات ملنے میں کافی آسانی تھی۔ جلد ہی لھاکر کرشن سنگھ وکیل سیٹھ کرشن سنگھ سرمایہ دار بن گیا۔

مگر قومی صنعت اور قومی سرمایہ داروں کی ترقی کی راہ میں یہ اشتراکی روڑے جو حائل تھے ان کا کیا کیا جائے؟ مزدوروں نے ہڑتال کر دی تھی، کام بند پڑا تھا۔ نقصان ہو رہا تھا۔

کرشن سنگھ کا مینجر کہتا تھا۔ کہ سٹرائیک توڑنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ کسی طرح مزدوروں میں پھوٹ ڈلوائی جائے۔ وفادار مزدوروں کو لالچ دیا جائے۔ اور ٹریڈ یونین کے لیڈروں کو گرفتار کرا دیا جائے مگر کرشن سنگھ ابھی پوری طرح سے سرمایہ داری رنگ میں نہیں رنگا گیا تھا۔ اس نے منع کر دیا وہ چاہتا تھا کہ مزدوروں کے لیڈر کو اپنی قانون دانی سے متاثر کر کے سمجھوتہ کر لے۔ اس نے مینجر سے کہا "مزدوروں کو کہلا دو کہ اپنے لیڈر کو میرے پاس بھیجیں۔ سمجھوتے کی بات چیت کرنے کے لئے۔"

مزدوروں کا لیڈر آیا تو کرشن سنگھ بھونچکا رہ گیا۔ وہ اس کا بیٹا آنند تھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی۔ کپڑے اور جوتے پھٹے ہوئے اور آنکھوں میں ایک عجیب ڈراؤنی چمک۔ آج وہ دشمن بن کر آیا تھا مگر پھر بھی وہ اس کا بیٹا تھا۔ باپ کے دل میں بیٹے کی محبت نے ہلکی سی چٹکی لی۔

"میں رشوت لینے نہیں آیا" اس نے آتے ہی کہا تھا "آپ میرے باپ ہیں۔ اس لئے آپ کو بیٹے کی حیثیت سے خطرے سے آگاہ کرنے آیا ہوں"

"خطرہ؟"

"جی ہاں زبردست خطرہ!"

کرشن سنگھ نے سوچا شاید مزدور اس کو قتل کرنے کی سازش کر رہے ہیں۔ اس لئے اس کا بیٹا اسے آگاہ کرنے آیا ہے۔

"جی نہیں آپ کی جان کو کوئی خطرہ نہیں" آنند نے جلدی سے اس کی غلط فہمی دور کر دی "آپ کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آپ کے ایمان، آپ کی سماج، آپ کی سرکار کو خطرہ ہے"

سوشلزم اور سرمایہ داری کی پرانی بحث پھر چھڑ گئی تھی۔ مگر اس بار کرشن سنگھ نے ایک نیا حربہ استعمال کیا۔

"آنند کیا تم نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ یہ بل جس کی تم اینٹ سے اینٹ بجانے پر تلے ہوئے ہو۔ ایک دن تمہاری ہونے والی ہے"
اور پھر کھانس کر اپنے دمے کا اعلان کرتے ہوئے . . . "میں تو تم جانتے ہی ہو۔ چند روز ہی کا مہمان ہوں"

اور آنند نے مسکرا کر جواب دیا "اور آپ کا سماج، آپ کا اقتصادی نظام، تو اب چند گھنٹے کا ہی مہمان ہے۔ مجھے اس لاش کے سڑے ہوئے گوشت کے ایک ٹکڑے کا لالچ دینے کی کوشش نہ کیجئے۔ میں تو آپ سے بھی یہی کہوں گا۔ کہ اس سسکتے ہوئے نظام کی تیمارداری چھوڑ کر زندگی کا ساتھ دیجئے۔ عوام سے رشتہ جوڑ لیجئے"

یہ تلخ طنزیہ جملے سن کر کرشن سنگھ آگ بگولا ہو گیا "یاد رکھو میں تمہیں عاق کر دوں گا۔ جائداد میں سے ایک پھوٹی کوڑی . . ."

"آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کی جائداد آپکی سماج کو پہلے ہی عاق کر چکا ہوں"

"گستاخ ناخلف کہیں کا!"

ایک بار پھر کرشن سنگھ نے غصے کو قابو میں کر کے بیٹے کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔

"آنند میں تمہارا باپ ہوں۔ کیا بیٹے کی حیثیت سے تمہارا یہ فرض نہیں کہ میرا کہنا مانو۔ یہ سوشلزم کمیونزم کی بکواس چھوڑ دو۔ میں تمہارے ہی بھلے کے لئے کہتا ہوں . . ."

مگر آنند کے پاس ہر بات کا جواب موجود تھا "آپ نے اپنے پتا جی کی بات مانی تھی؟ . . . اگر ہمیشہ بیٹوں نے باپ کی بات مانی ہوتی تو آج ہم لوگ دنیا میں جانوروں کی طرح پہاڑوں کی کھوہوں میں رہتے بھیڑ بکریوں کی کھالیں لپیٹے پھرتے۔ پتھروں کو رگڑ کر آگ جلایا کرتے دنیا کو چوکور سمجھتے۔ اور سانپوں کی پوجا کیا کرتے۔ اور پھر اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر "پتا جی بیٹوں کی حکم عدولی ہی میں ترقی کا راز ہے"

کرشن سنگھ اس فلسفیانہ بحث میں پڑنے کو تیار نہ تھا۔ وہ تو صرف یہ جانتا تھا کہ سٹرائیک کی وجہ سے اس کا نقصان ہو رہا ہے اور اس

نقصان کا باعث خود اس کا بیٹا ہے۔ جو نہ صرف باپ کی عدول حکمی کر رہا ہے بلکہ اس سے دشمنی کر رہا ہے۔

تب بیچ اس کا لہجہ سخت تر ہوتا گیا۔ "جانتے ہو یہ میری وجہ ہے کہ اب تک اس سٹرائیک کے سلسلے میں تم گرفتار نہیں ہوئے ہو میں نہیں چاہتا تھا کہ مزدوروں پر خواہ مخواہ سختی کی جائے۔ میں سمجھتا تھا کہ سہولت سے سمجھوتا ہو جائے تو اچھا ہے۔ مگر اب میں مجبور ہو لگا کہ . . . "

"کہ میری گرفتاری کا حکم جاری کرائیں؟" آنند نے باپ کے جملے کو پورا کرتے ہوئے کہا۔ "جانتا ہوں ابھی تو آپ لاٹھی چارج کرانے اور گولیاں چلوانے پر مجبور ہوں گے۔ یہ سرمایہ داری ابھی تو آپ کو نہ جانے کیا کیا کرنے پر مجبور کرے گی۔"

کیا یہ بدتمیز، منہ پھٹ، خوفناک آنکھوں والا لڑکا اس کا بیٹا ہو سکتا ہے؟ نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔

"نکل جاؤ۔ آج سے نہ میں تمہارا باپ ہوں۔ نہ تم میرے بیٹے"

"وہ تو میں اسی دن جان گیا تھا جب آپ نے ایک غریب کسان کا مقدمہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اس دن جب آپ نے سرکار کو خوش کرنے کے لئے میرے خلاف بیان شائع کیا تھا اور اس دن جب آپ نے میرے دوستوں کو فسادیوں کے ہاتھوں قتل ہونے کے لئے گھر سے نکال دیا تھا، کیونکہ وہ مسلمان تھے۔"

"نکل جاؤ۔ میں تم جیسے ناخلف کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا" کرشن سنگھ کی زوردار آواز اونچی چھت سے ٹکرا کر سارے مکان میں گونجی تھی۔

"بہت اچھا۔ اب میں آپ کو کبھی شکل نہیں دکھاؤں گا۔"

وہ چلا گیا تھا اور سنگ مرمر کے فرش پر اس کے بن پالش کئے ٹوٹے اور کیلیں نکلے ہوئے جوتوں کی دھم دھم ہوتی ہوئی آواز میں قطعیت تھی۔ ایک خوفناک عزم تھا۔ ایک اعلانِ جنگ تھا۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو۔

"میں اب کبھی واپس نہ آؤں گا . . . کبھی نہیں . . . کبھی نہیں . . ."

(۶)

سارے مکان میں سناٹا تھا اور کرشن سنگھ کی روح میں سناٹا تھا۔ دیوان خانے کی ہر چیز — ہر دیوار، ہر تصویر، ہر مورتی اسے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ اس نے ابھی ابھی گھر سے اپنے دشمن کو نہیں نکالا تھا۔ اپنے بیٹے کو نکالا تھا۔ ایک گھونگر والے بالوں والے بچے کو جس نے کبھی اپنے بچپن میں خط میں لکھا تھا۔ "پتاجی ایک دن میں بھی آپ کی طرح وکیل بنوں گا۔" ایک ذہین آنکھوں اور حساس چہرے والے لڑکے کو جس نے اسکول سے آکر اپنے ہاتھ دکھائے تھے جن پر بید کی مار کے لال لال نشان پڑے ہوئے تھے۔ اور کہا تھا۔ "پر پتاجی میں رویا نہیں۔ بالکل نہیں رویا" اور پھر رو پڑا تھا! . . . . . . اور آج اس نے اپنے بیٹے ہی کو نہیں اس کی ماں کو۔ اپنی بیوی رادھا — کو بھی نکالا تھا۔ وہی بیوی جس نے جیل میں اسے لکھ کر بھیجا تھا کہ "اگر قسمت بری تو آپ کے چھٹنے پر آپ کے درشن کر بھی لوں گی۔" جو مر گئی تھی پر یہ گوارا نہ کیا تھا کہ اس کے شوہر کی گردن ظالم سرکار کے سامنے جھکے۔

بیٹے اور بیوی کو نکال کر آج وہ اپنے گھر میں، دنیا میں، اکیلا تھا، بالکل اکیلا۔ مگر نہیں! اس کا باپ ٹھاکر ہرنام سنگھ ابھی تک زندہ تھا اپنے گاؤں کی حویلی میں رہتا تھا۔ مدت سے کرشن سنگھ نے باپ سے ملنا جلنا تقریباً بند ہی کر رکھا تھا۔ بوڑھا اب سٹھیا گیا تھا۔ اور اس کا دماغ شاید ٹھیک نہ رہا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اس کا باپ تھا۔ آج ضرور وہ اس کے پاس جائے گا۔ اس سے اپنے دل کا حال بیان کریگا۔ شاید صرف ایک باپ ہی اس درد اور دکھ کو سمجھ سکے جو آج کرشن سنگھ محسوس کر رہا تھا۔

اس نے گیراج سے موٹر نکالی۔ اور دھول اڑاتا ہوا گاؤں کی طرف چل پڑا۔

بوڑھا ٹھاکر شام کی سندھیا کر رہا تھا جب کرشن سنگھ کی موٹر وہاں پہنچی۔ ہارن کی آواز سنتے ہی بڈھا بگڑ کھڑا ہوا۔ نوکر پر چلایا۔ "ہزار بار کہا ہے کہ راکھشسوں کی رتھ میرے احاطے میں نہ آئے۔ ابھی میں شراپ دے کر بھسم کر دوں گا!"

ٹھاکر ہرنام سنگھ کی عمر سٹھ سے اوپر ہو چکی تھی۔ سر کے بال جو گرے نہیں تھے۔ وہ بالکل سفید ہو چکے تھے۔ منہ میں ایک دانت نہیں تھا۔ مگر پوپلے منہ سے جو آواز نکلتی تھی وہ جوانوں کو مات کرتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے نظر آنا بہت کم ہو گیا تھا، مگر وہ ولایتی چشمہ لگانے کو تیار نہیں تھا۔ کرشن سنگھ

سامنے آن کر کھڑا ہو گیا مگر اس کے باپ نے اسے نہ پہچانا۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں کرشن"

"کرشن مہاراج راکھشسوں کی نگری میں بیٹھ کر کیوں آنے لگے۔ تُو کوئی ڈھونگی ہے" یہ کہہ کر ہرنام سنگھ ایک پیڑھے پر بیٹھ کر مالا جپنے لگا۔

"میں کرشن مہاراج نہیں۔ کرشن سنگھ ہوں آپ کا بیٹا!"

"میرا کوئی بیٹا نہیں۔ نہ میں کسی کا باپ"

پچیس برس ہوئے جب کرشن سنگھ کانگرس کی ستیہ گرہ میں شریک ہوا تھا۔ اس دن ہرنام سنگھ نے اسے گھر سے نکالتے ہوئے یہی کہا تھا۔ "آج سے میرے کوئی بیٹا نہیں۔ نہ میں کسی کا باپ" اس کے بعد جب سے اس کا دماغ خراب ہوا تھا۔ اسے وقت اور مقام کا اندازہ بالکل جاتا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بھگوان کرشن کا زمانہ، کرشن سنگھ کا بچپن اور جوانی، ماضی اور حال سب ہی گڈمڈ ہو چکے تھے۔

"پتاجی! ہوش میں آئیے۔ میں آپ کا بیٹا کرشن سنگھ ہوں۔ آپ سے بات کرنے آیا ہوں۔ میرا بیٹا آنند ہمیشہ کے لئے گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے"

"ہاں، ہاں" بڈھے ٹھاکر کا دماغ نہ جانے کہاں تھا "کرشن گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ میں نے خود ہی اسے نکال دیا ہے"

"وہ مزدوروں کا لیڈر بن گیا ہے، میرے ہی کارخانے میں سٹرائیک کرا رہا ہے" کاش اس کا باپ اس سے ہمدردی کرنے کے قابل ہوتا۔

"ہاں یہ سب گاندھی کا کیا دھرا ہے۔ وہی نوجوانوں کو بھڑکا رہا ہے۔ باغی بنا رہا ہے۔ خود کلکٹر صاحب نے مجھ سے یہی کہا ہے"

"میں آنند کی بات کر رہا ہوں پتاجی"

"آپ فکر نہ کیجئے کلکٹر صاحب میں اسے گھر سے نکال دوں گا۔ ہم ٹھاکر سات پشتوں سے بادشاہ سلامت کے وفادار رہے ہیں۔ ایک ٹھاکر کا بیٹا باغیوں سے مل جائے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا"

کرشن سنگھ نے باپ کے دماغ کا توازن ٹھیک کرنے کی کوشش میں کہا "پتاجی یہ سن بائیس نہیں سن انچاس ہے۔ آپ کا بیٹا نہیں بلکہ پوتا گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ وہ زمینداروں، سرمایہ داروں کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے"

بڈھا اپنی ہی بڑ ہانکے جا رہا تھا "بادشاہ، راجہ بھگوان کا روپ ہوتا ہے۔ جو اس کے درودھ ہوگا اس کا لوک پرلوک دونوں میں ناش ہوگا"

کرشن سنگھ ہمدردی کے ایک لفظ کا پیاسا تھا "پتاجی کیا یہ غضب نہیں کہ میں نے اسے پالا پوسا، بڑا کیا۔ پڑھایا، لکھایا اور وہ آج میرا ہی دشمن ہو گیا ہے۔ . . ."

"بہت بُری بات ہے" بڈھا چلایا۔ اور ایک لمحے کے لئے کرشن سنگھ سمجھا کہ اس کے باپ نے اس کی بات سمجھ لی۔ مگر بڈھا وہاں نہیں کہیں اور ہی تھا "بہت بری بات ہے! انگریزی سرکار نے ہم زمینداروں کو جنم دیا۔ ہمیں پالا پوسا اور پروان چڑھایا۔ اور ہم آج اس ہی کے خلاف باغی ہو جائیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا"

کرشن سنگھ کو یاد آیا کہ یہ سب باتیں اس کے باپ نے کتنے ہی برس ہوئے خود اس سے کہی تھیں۔ دماغ کے گراموفون پر نہ جانے کیسے یہ پرانا ریکارڈ چل پڑا تھا۔

"پتاجی آپ نہ جانے کس یگ کی بات کر رہے ہیں۔ اب انگریزی سرکار نے خود ہی ہنسی خوشی ہمیں آزادی دے دی ہے۔ اب تو جھگڑا ہی دوسرا ہے . . . یہ آنند اور اس کے ساتھی . . .؟"

"یہ آگ گاندھی کی لگائی ہوئی ہے آج سارے ہندوستانیوں کو سرکار کے خلاف بھڑکا رہا ہے۔ کل کسانوں کو زمینداروں کے خلاف بھڑکائے گا۔ یہ بغاوت کی آگ بار سلگ اٹھی تو کسی کے بجھائے نہ بجھے گی . . ."

"پتاجی۔ یہ طبقاتی جنگ کی آگ لگا رہے ہیں . . ."

"آزادی مانگتے ہیں؟ پوپلا منہ چڑانے کے انداز میں سکڑ گیا۔ "انقلاب، انقلاب چلاتے ہیں — اور تو . . . ایک ٹھاکر کا بیٹا ہو کر . . . ان کمینوں باغیوں کا ساتھ دیتا ہے . . ."

"پتاجی!" کرشن سنگھ چلایا۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس کا باپ یونہی بھی اپنی باتیں دہراتا رہا تو وہ بھی پاگل ہو جائے گا۔

"یاد رکھ کرشن" بڈھے کی پوپلی مگر زوردار آواز خوفناک انداز میں گونجی "میں تجھے عاق کر دوں گا۔ جائداد میں سے ایک پھوٹی کوڑی نہیں

دوں گا"

یہ الفاظ کس نے کب کہے تھے؟ کرشن سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے باپ نے پچیس برس پہلے؟ یا خود اس نے چند گھنٹے پہلے؟ یا دونوں نے؟ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ یہ بھولا جا رہا تھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں ہے، کیوں ہے، کیا بات کر رہا ہے،

اتنے میں بڈھے ٹھاکر کی دھندلی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا "کرشن یہ کانگریس اور گاندھی کی بکواس چھوڑ دے۔ میں تیرے ہی بھلے کی کہتا ہوں، میں تیرا باپ ہوں۔ کیا بیٹے کی حیثیت سے تیرا یہ فرض نہیں کہ میرا کہنا مانے؟

" اگر ہمیشہ بیٹوں نے باپ کی بات مانی ہوتی تو آج دنیا میں ہم لوگ جانوروں کی طرح پہاڑوں کی کھوہوں میں رہتے۔ بھیڑ بکریوں کی کھالیں لپیٹے پھرتے۔ پتھروں کو رگڑ کر آگ جلایا کرتے۔ دنیا کو گول نہیں چوکور سمجھتے۔ اور سانپوں کی پوجا کیا کرتے۔ پتاجی بیٹوں کی عدول حکمی ہی میں ترقی کا راز ہے"

کرشن سنگھ اپنی ہی زبان سے یہ الفاظ سن کر ششدر رہ گیا۔ اس کا باپ کہہ رہا تھا "نکل جا یہاں سے۔ آج سے نہ میں تیرا باپ نہ تو میرا بیٹا"

اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ ڈراما اس کا دیکھا ہوا ہو۔ یہ مکالمے سُنے ہوئے ہوں۔ کیا اس کا دماغ بھی توازن کھو رہا تھا؟ اپنے باپ کو وہ اکیلا چھوڑ کر چلا آیا۔

(۷)

واپس گھر پہنچا تو دیوان خانے کی ساری روشنیاں جل رہی تھیں دروازے کھلے تھے جیسے کسی کے انتظار میں۔ اندر کمرے میں ہر چیز ویسی ہی تھی جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ جامد، ساکت، مُردہ، اس کے باپ دادا، پڑدادا کی تصویریں اپنی مردہ آنکھوں سے اُسے گھور رہی تھیں شری کرشن مہاراج اور ان کی پیاری رادھا اس کے اور دنیا کے جھگڑوں سے بےخبر اپنے امر پریم میں کھوئے ہوئے تھے۔ مہاتما بدھ اور مہاتما گاندھی کے سنگین بت طاقوں میں رکھے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ لوہے کی تجوری پر اس کی سفید کھدر کی ٹوپی بدستور رکھی ہوئی تھی۔ ہر چیز خاموش تھی بے حرکت تھی۔ بےجان تھی ــــ سوائے دیوار پر لٹکے ہوئے کیلنڈر کے جو وقت کے پنچھی کی طرح ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ اور پرانے گھنٹے کے جس کی ٹک ٹک نہ جانے اُسے کیا پیغام دے رہی تھی۔

کرشن سنگھ نے ایک ایک کر کے اپنے ہاتھ سے سب روشنیاں بُجھا دیں۔ اور مصر کے بادشاہوں جیسے مقبرے پر ابدی تاریکی چھا گئی۔

بلراج کومل

ایک یہ بھی کہانی

کہتے ہیں اک بار کہیں ساگر درپن میں،
چندا نے اک بھولی بھالی صورت دیکھی
آج سے پہلے چندا نے ساگر درپن میں
ایسی بھولی بھالی صورت کب دیکھی تھی!!

آج سے پہلے نیل گگن میں چلتے چلتے
چندا نے ساگر اور دھرتی سے پوچھا تھا
"کیوں اس جگ کے رہنے والوں کے مکھڑوں پر
رُوپ کے بدلے حسرت کی تصویر کھچی ہے
مَیں نے ایسے کتنے ہی چہرے دیکھے ہیں
جن کی بجھی ہوئی صورت نے میرے من کو
جیون بھر کی بے چینی کا روگ دیا ہے
مَیں راتوں کو اکثر رو کر سو جاتا ہوں
کتنی مدت ہوئی مجھے دنیا میں آتے
اب تک تو ان آنکھوں نے سکھ چین نہ دیکھا
گھر گھر میں چپکے چوری میں نے جھانکا ہے

شاید کہیں نظر آ جائے سُکھ کی صورت،
اک معصوم ہنسی یا سندر سا اک سُپنا،
کوئی بھولی بھٹکی آشاؤں کی ریکھا،
گیت ہی شاید سُن پاؤں کوئی پیارا،
سکھ کی صورت کے بدلے اک لاش ہی دیکھی؛
اک معصوم ہنسی کے بدلے آہیں پائیں
آشاؤں کی ریکھا موت کی رہ تکتی تھی،
گیتوں میں ارمانوں کا دکھ درد بھرا تھا
زخموں کی بوچھاروں سے بچنے کی خاطر
روتے پھرتے تھے بیچارے پاگل انساں
مُرجھائے چہروں کی سہمی سہمی آنکھیں
کبھی کبھی آکاش کی جانب اٹھ جاتی تھیں
رُک جاتی تھی اک نقطے پر آس کی ڈوری
(شاید اس دنیا میں یہ ہستی کا حد تھا
پہلے پہل جسے پایا تھا انسانوں نے
خوش فہمی کے جال بناتے، جال بچھاتے،

اور انہیں اس آس کی ڈوری نے لا پھینکا
زخموں، آہوں، چیخوں کے پُرشور بھنور میں
اُبھر اُبھر کر جس میں ڈوبے پھر بہہ جائے
آس کی ڈوری نے کیسا یہ ناچ نچایا،
پٹخا، پھینکا، نوچا، کانٹوں پہ تڑپایا
شاید یہ لازم تھا اس دنیا کے اندر،
انسانوں کو شعلوں میں جھلسایا جائے،
یا پھر خود ہی انسانوں نے سوچا ہوگا
سکھ کے بدلے، دکھ اپنا لیں، سوگ منائیں
یا پھر فطرت کا یہ ایک تقاضا ہوگا
خوش فہمی اک لازم شے ہو انسانوں کو،
اور یہی ان کو انگاروں پہ تڑپائے،

"پگ پگ پر کتنے ہی منظر دیکھ چکا ہوں
چلا ہوا ہوں جب سے میں اپنے رستے پر"

(۲)

آج سے پہلے چندا نے ساگر درپن میں
ایسی بھولی بھالی صورت کب دیکھی تھی
سیدھے سادے سُندر چہرے کی ریکھائیں
میٹھے میٹھے سپنوں میں ڈوبی جاتی تھیں
آنکھوں میں اک ٹھنڈک سی لہریں لیتی تھی
پلکوں پر آشاؤں کے موتی ہنستے تھے
گالوں سے دھیمی دھیمی آنچیں اٹھتی تھیں
ہونٹوں کی نرمی میں میٹھے گیت بسے تھے،
گردن میں کومل کلیوں کے ہار سجے تھے
باہوں کی لچکیلی لہریں بل کھاتی تھیں،
سینے کی بے چین اٹھانیں لہراتی تھیں،
پگ دھرنے سے تاروں کی آنکھیں جھکتی تھیں
روپ رنگ کی موجوں پر موجیں اٹھتی تھیں
پیاری سی یہ صورت دیکھ کے یوں لگتا تھا،
آنکھوں نے جیسے سکھ کا سپنا دیکھا ہو،

چندا نے حیرانی سے درپن میں جھانکا
پھر دھیرے دھیرے نکھرے آکاش سے پوچھا،
"کس انجانی بستی کی رہنے والی ہے
یہ معصوم ستاروں کو شرمانے والی،

دھرتی پر میں نے تو اب تک کبھی نہ دیکھی
سکھ کی اک ہلکی سی چھایا، اک کرن بھی"
سیدھا سادہ ساگر کاش بھلا کیا کہتا
اس نے بھی تو ایسی صورت کب دیکھی تھی؛
چندا نے پھر آپ ہی اس صورت سے پوچھا
"کس بستی کی رہنے والی ہو تم پیاری،
مجھ کو بھی کیا لے جاؤ گی اس بستی میں
میرا دل اب اس دھرتی سے اوب گیا ہے
سکھ کی کھوج لگانے میرا جیون بیتا
تم کس نگری میں تھیں اب تک میری پیاری؟"
چندا کی یہ باتیں سنکر ساگر کانپا!
لہروں میں دھیرے دھیرے سرگوشی جاگی،
"درپن میں نازک نازک سے دو ہونٹوں سے
لہراتی، بل کھاتی ہوئی آواز یہ نکلی
"میں اس بستی کی رہنے والی ہوں چندا
جس کا انسانوں کو اب تک بھید نہیں ہے
سورج کی پہلی کرنوں کے ساتھ ہی اٹھ کر
بیچارے چل پڑتے ہیں دکھ کے رستے پر

دن بھر اپنے جسموں سے کانٹے پٹاتے
نئے پرانے، گہرے بڑے زخموں کو لے کر
"تم تو چندا دور کھڑے دیکھا کرتے ہو
تم کیا جانو، دکھڑوں کی یہ رام کہانی
میں بھی رہا کرتی تھی پہلے اس دنیا میں
مجھ پر بھی بیتے ہیں دکھ کے ایسے لمحے،
اب تک جن کی یاد مجھے تڑپا دیتی ہے
چندا، تم سندر صورت پر ریجھ گئے ہو.
کاش کبھی تم نے یہ چہرا دیکھا ہوتا.
جب اس پر ناچا کرتے تھے غم کے سائے،
زخموں سے چھلنی تھا یہ کونپل سا جوبن
اک دن اکتا کر میں نے یہ دنیا چھوڑی
آکر بس گئی اس انجانی سی بستی میں
جس کا انسانوں کو اب تک بھید نہیں ہے"
چندا نے یہ باتیں سن کر آنکھیں جھپکائیں
دھیرے سے بولا "میں دیکھوں گا یہ بستی"
ساگر میں پھر اٹھیں دھیمی دھیمی لہریں،
درپن میں نازک نازک سے دو ہونٹوں سے

لہراتی بل کھاتی ہوئی آوازیہ نکلی ۔
"چندا میں تم کو دکھلاؤں گی یہ بستی"
ایکا ایکی ساگر میں اک شور سا اٹھا
لہروں میں بستی کے اجلے گنبد ابھرے
دھیرے دھیرے نکھر گیا پھر سارا منظر
ساری بستی پھولوں سے مہکی جاتی تھی
کھیتوں میں ہر سو ہریالی لہراتی تھی
سندر سندر مکھڑوں پر خوشیاں ہنستی تھیں
ننھے منے بچوں کی آنکھوں میں جیسے
آنے والے جیون کے دیپک جلتے تھے
چمکیلی آنکھوں میں آشاؤں کی کرنیں،
کمریں لچکاتی، بل کھاتی یوں اٹھتی تھیں۔
جیسے چاندنی راتوں میں پریوں کی ٹولی
پاؤں تھرکاتی آئے، تاروں کے اوپر
چندا نے سکھ کی اس بستی کو جب دیکھا
پھر بولا، اب مجھے بتاؤ سکھ کی رانی
کیسے یہ بستی دکھ سے آزاد ہوئی ہے
کس رستے پر چل کر تم سب آنکلے ہو
دھرتی کے دوزخ سے اپنی جان بچا کر"

پھر ساگر کانپا چندا کی باتیں سن کر
درپن میں نازک نازک سے دو ہونٹوں سے
لہراتی، بل کھاتی ہوئی آوازیہ نکلی
"پیارے چندا تم کو حیرانی ہوتی ہے
بس گئی کیسے سکھ کی یہ انجانی بستی۔
چندا! تم نے نیل گگن میں چلتے چلتے
دیکھا ہے کیا دھرتی کے ان بیٹوں کو بھی
زخموں سے چھلنی ہیں جن کے سینے لیکن
ہاتھوں سے خوشیوں کے پرچم لہراتے ہیں
ایک مسلسل تاریکی ہے جن کی قسمت
پھر بھی روشن رکھتے ہیں آشا کا دیپک
لڑتے آتے ہیں جو مستقبل کی خاطر
چندا، میں ان انسانوں کے دل کی رانی،
سپنوں کی اس بستی کے رہنے والی ہوں،
جس کو ان سب نے مل جل کر من ہی من میں
صورت بخشی ہے کلیوں کی آنکھوں ایسی
کہتے ہیں چندا یہ ساری باتیں سن کر
روتے چلاتے انسانوں سے کہتا تھا
"لے آؤ اس بستی کو دھرتی کے اوپر"

خدیجہ مستور

ستارہ ٹوٹتا ہے تیرگی کا پیٹ بھرتا ہے

بڑے کمرے میں چار جانوں کا اکلوتا سہارا دم توڑ چکا تھا — بس ذرا سی خون کی کمی کی شکایت ہوئی تھی، پھر یہ شکایت بڑھتی گئی، خون کی کمی نے دِق کی صورت اختیار کر لی، دو تین مہینے کے اندر اندر پلنگ سے لگ گیا اور آج خاموشی سے سدھار گیا۔ بہت کچھ علاج کیے۔ ساری جمع جتھا خرچ کر دی اور سینی ٹوریم کے اخراجات تو قرض کے بوتے پر پورے کیے۔ پر ہاتھ کچھ نہ آیا۔ بوڑھے والدین بیٹے کے سہارے میں زندگی کے بقیہ دن گنوانے کے خواب ہی دیکھتے رہ گئے ——— اللہ یہ چڑھتی جوانیاں اور خون کی کمی کی شکایت! — کہتے ہیں کہ ان چڑھتی عمروں میں تو خون کے دریا ٹھاٹھیں مارتے ہوتے ہیں۔ آخر آج کل کے نوجوانوں کا خون کون چوس لے جاتا ہے۔ یہ کس خون کے ذخیرے میں ان کا خون جمع کر لیا جاتا ہے، اور پھر سفید سفید جسم کچھ دن لڑکھڑانے کے بعد چپ چاپ دائمی نیند سو جاتے ہیں ——— خون کی کمی کی شکایت کتنی بری ہوتی ہے، بڑھتے تو دِق — دِق کے سدِباب کے لئے نئے نئے انجکشن دریافت کئے جا رہے ہیں۔ سینی ٹوریم کھولنے کی اسکیمیں ہیں، ڈاکٹروں کے جتھے باہر بھیجے جا رہے ہیں تاکہ وہاں سے ماہر ہو کے آئیں اور اس وبا کو جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیں — مگر دِق — یہ پھر بھی نہیں رکنے کی، لاکھ ڈاکٹر یورپ کے گوشے گوشے کے چکر کاٹیں، لاکھ سینی ٹوریم کھولنے کی اسکیمیں بنائی جائیں، کچھ بھی نہ ہو گا، موت گلیوں ہی منڈلاتی پھرے گی، "بلڈ بینک" میں خون جمع ہوتا رہے گا اور وہاں سے دِق کے جراثیم اڑ اڑ کر ہر طرف پھیلتے رہیں گے۔

روتے روتے ماں کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ پھر بھی وہ اپنی جان پیٹ پیٹ کر بین کر رہی تھی۔

"میں نے اپنے لال کو بڑی مشکل سے پالا تھا۔ بیٹا تیری ماں گیلے میں سوتی اور تجھے سوکھے میں سلاتی تھی، خود نہیں کھاتی تھی تجھے کھلاتی تھی، تیرے لئے ساری جوانی تباہ کر دی تھی — بیٹا تیری ماں لٹ گئی چھاؤں میں بھی نہ بیٹھنے پائی تھی کہ درخت گر گیا — میرے مولا ——— میرے لال کو اتنی جلدی چھین لیا؟"

ماں دری پر بیٹھی سر ٹیک رہی تھی، محلے کی چند عورتیں اس کے گرد بیٹھی تھیں۔ وہ سب اسے سنبھال بھی رہی تھیں، اور اس طرح صبر کی تلقین کر رہی تھیں کہ صبر بھی جی چھوڑ بیٹھے۔ چھوٹی بہن یوں تڑپ رہی تھی کہ کسی کو ہاتھ لگاتے نہ بن پڑ رہی تھی — کمرے کے ایک کونے میں بچھے ہوئے پلنگ پر جوان جنازہ سفید چادر سے ڈھکا پڑا تھا۔ سرہانے لوبان سلگ رہا تھا۔ دھوئیں کے لچھے ننھے ننھے سنپولیوں کی طرح بل کھا رہے تھے۔ ماں بار بار اپنے دونوں ہاتھ اُدھر پھیلا رہی تھی۔ نہ جانے وہ اپنی ویران آغوش کسے دکھا رہی تھی۔ اور پھر ایک بار جب اس نے خود کو عورتوں کی گرفت سے چھڑا لیا تو جھپٹ کر پلنگ کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے بیتابی سے لاش کے چہرے سے چادر کا کونا سرکا دیا۔

"میرے لال کی آنکھوں میں تارے بھرے ہوتے تھے، یہ بہت خوبصورت تھا، دیکھو نا یہ اب بھی کتنا خوبصورت ہے" — ماں نے بیٹے کے سرد چہرے کی بلائیں لے لیں، اس کے چہرے پر وحشت جاگ رہی تھی ——— "میں اس کی چھاؤں میں زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ مگر دیکھو اس نے ماں سے منہ موڑ لیا، اس نے کیسی بے وفائی کی" — ماں پر دیوانگی کی سی کیفیت چھا رہی تھی — "نہیں میری زبان جلے میرا بیٹا بے وفا نہیں تھا۔ وہ تو مجھے بہت چاہتا تھا۔ موت نے اسے مجھ سے چھین لیا۔ میرا بیٹا تو ایسا نہ تھا، خدا نے چھین لیا۔ خدا مرے —"

اور وہ زور زور سے چیخنے لگی۔ پھر وہیں گر کر بے ہوش ہو گئی۔ عورتوں نے اسے کھینچ کر دری پر لٹا دیا۔ کوئی پنکھا جھلنے لگی۔ کوئی اس کے بھینچے ہوئے

دانت کھول کر منہ میں پانی ڈالنے لگی۔ چھوٹی بہن جیسے سہم کر خاموش ہو گئی تھی۔

"بیمار جلدی اُٹھ جائے تو بہتر ہے" ایک عورت نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں — آں — سامنے جوان بیٹا پڑا ہو تو بھلا صبر بھی کیسے آئے نا — بیچاری بڑھیا، اپنی جان مار مار کر پڑھایا لکھایا اور جب کمانے لگانے کے لائق ہوا تو موت آ دھمکی۔ خدا کی مرضی۔"

"ہاں، خدا کی مرضی۔ موت بڑھا بچہ، جوان کچھ نہیں دیکھتی۔"

ماں جو دیر سے بے حس و حرکت پڑی تھی، کسمسائی تو سب عورتیں چپ ہو گئیں۔ ماں غفلت کے عالم میں لمبی لمبی سسکیاں بھر رہی تھی۔ عورتیں اسے رحم بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ سب بالکل خاموش تھیں۔ مگر ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ اس وقت وہ ساری دنیا کو بھول کر صرف خدا، موت اور ایک ماں کے لیے انتہا دکھ کے متعلق سوچ رہی ہیں پناہ مانگ رہی ہیں ان دکھوں سے — ان کے سر یوں جھکے تھے جیسے بارگاہِ الٰہی میں سر بسجود ہوں اور وہ اپنے بچوں، اپنے محبوبوں اور اپنے بھائیوں کی طویل زندگیوں کی دعائیں مانگ رہی ہوں۔ پر انہیں کون بتاتا کہ خدا اتنی جلدی موت نہیں بھیجتا۔ طبعی عمر پا کر مرنے والے آج کل میں نمک کے برابر رہ گئے ہیں۔ یہ موت تو انسانوں کی بخشی ہوئی ہے تمہارے جسم میں خون نہیں بنتا، تمہیں دق ہو جاتی ہے — آؤ، ہم تمہارے لئے مسیحی تو یہیں کھولے دیتے ہیں۔ مگر تمہارے لئے پھل نایاب ہیں، ابھی غذا کمیاب ہے۔ ساری زندگی الم غلم کھاؤ اور طول عمر کی دعائیں مانگتے ہوئے عین شباب کے عالم میں مر جاؤ۔ پھر خدا سے شکوہ کرو۔ کیونکہ موت بھیجنے والا وہی ہے۔ ایک بہن کو سسکتا ہوا چھوڑ جاؤ، ایک محبوبہ کو تڑپا جاؤ۔ ایک باپ کو جیتے جی مار جاؤ اور ایک ماں کے دل کو دکھا جاؤ جس سے زمین و آسمان کانپ اٹھیں۔ ایک ماں جو زمین کی طرح عظیم ہے۔ زمین جو ماں کے جنم دیئے ہوئے بچوں کا پیٹ پالتی ہے اور ماں جو دھرتی سے دانے اگانے، زمین کو بنانے سنوارنے اور رونق بخشنے کے لئے بچوں کو جنم دیتی ہے۔ مگر دھرتی پر ایٹم بم پھینکا جاتا ہے۔ اور ماؤں کی گودیں اجاڑ دی جاتی ہیں — یا — موت کتنی ظالم ہوتی ہے۔

ماں غشی کے عالم میں پڑی بڑبڑا رہی تھی — "دیکھو میرا لال اب بھی خوبصورت ہے، اس نے مجھ سے بے وفائی کی ہے، یہ مجھے چھوڑ کر جا رہا ہے مگر اسے جانے کب دونگی — میرا لال —"

عورتوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"خدا اسے صبر دے" ایک عورت آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔

"آمین!" دوسری عورت جیسے سسکی بھر رہی تھی

"مگر اسے کیا صبر آئے گا" ایک بوڑھی عورت مایوس ہو رہی تھی

"میں اپنے بیٹے کو نہیں جانے دونگی نہیں —" ماں اس طرح آہستہ آہستہ بڑبڑا رہی تھی۔ مگر ماں کو کون بتاتا کہ یہ جانے لگا گیا، یہ جا بھی چکا ہے۔ بھئی اماں بہت عرصہ گزر گیا کہ لوگ یوں ہی جاتے ہیں۔ ذرا سے طریقے الگ الگ ہوتے ہیں اور بس زمیندار کی چوکھٹ سے سر ٹکرا کر مر گئے۔ ذرا جاگیردار کے غنڈوں نے ایک سوکر سر کیا اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ روٹی مانگتے مانگتے بھوکے مر گئے گھر بار نہیں ملتے تو بارش اور سردی سے سکڑ کر ختم ہو گئے۔ جسم میں خون نہیں تو دق میں مر گئے — اور کچھ نہیں تو ایک ناٹک کی طرح ذرا فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑکا کر تماشہ دیکھ لیا، ایک ہی وار میں لاکھوں سے چھٹکارا پا لیا۔ پر انہیں کس نے گنی ہیں — وہ سب آخر اٹھ ہی جاتی ہیں اور ماں اگر نہ اٹھائی جائیں یہ لاشیں تو وہ سڑاند آئے کہ ناک چہرے سے غائب ہو جائے تو بھی، تمہارا یہ بیٹا سڑ جائے گا اور پھر تمہاری حالت اس ماں کی طرح ہو جائے گی جو ——

کہتے ہیں کہ چور کے بھائی گرہ کٹ مثل تو بڑی فضول ہے مگر ان دنوں کیسی سچی نظر آ رہی تھی۔ جب سونے اور چاندی پر مرنے والوں کے ہرکاروں نے آزادی کی کتھا رچائی۔ تو بی جمالو کی حرکت سے آخر چوک نہ سکے اور یہاں بھی ایسے گرہ کٹوں کی کوئی کمی تو تھی نہیں۔ حرف بحرف ان کا ساتھ دیا کہ بھئی موقع اچھا ہے۔ ایک ذرا فساد کی آگ کو ہوا دو پھر تو پو بارہ ہیں — اور پاکستان سے ہندوستان، ہندوستان سے پاکستان انسانوں کو ڈھونڈنے کے لئے ٹرک چلاؤ تو لاکھوں کماؤ گے۔ حفاظت کے داؤ پیچ سکھا کر ہتھیار دو اور لاکھوں کماؤ۔ اس کے علاوہ

ترپتی پھڑکتی عورتوں کی جوانیاں منٹوں میں کٹ گئیں۔ اور پھر وہ سب ہوتا رہا جو نہ ہونا چاہیے تھا۔ راتوں کا حسن لٹ گیا، دنوں کی جگمگاہٹ ختم ہو گئی۔ ویرانیوں اور سناٹوں نے ہر طرف ڈیرے ڈال دیئے۔

وہ رات بھی ایسی ہی لٹی پٹی تھی۔ شہر سے کچھ دور پناہ گزینوں کا کیمپ تھا جس میں انسان بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھنسے ہوئے تھے۔ کیمپ کے ارد گرد فوج کا پہرہ تھا۔ پھر بھی یہ معلوم پڑتا تھا کہ کیمپ تو بالکل خالی ہے بس فضا چیختی ہوئی معلوم ہو رہی تھی — ارے جیتی کوئی ہے جاندار۔ ذرا بولے، ذرا ہنسے، ذرا چہل پہل ہو، آخر یہ تمہارے فطری تقاضے کون چھین لے گیا؟ بھئی! کچھ تو بولو۔ ابھی تو رات کا ابتدائی حصہ بھی اچھی طرح نہیں گزرا ہے — لیکن بولتا بھی تو کون۔ کوئی جاندار تو تھا ہی نہیں —

پر جب رات ذرا اور بھیگی تو بھاری بھاری قدموں کی چاپ، باتوں کی آواز اور ٹارچ کی تیز روشنی کیمپ میں داخل ہوئی۔ ایک ذرا دیر کے لئے جیسے ہڑبونگ سی مچ گئی۔

"کوئی نہیں، ہمارے دشمن نہیں ہیں۔" فوج کے آدمیوں اور ایک انگریز افسر کو دیکھ کر وہ مطمئن ہو گئے۔ انگریز افسر کہہ رہا تھا — "یہاں سے قریب پناہ گزینوں کی ایک گاڑی کھڑی ہے جس کے تمام مسافروں کو ختم کر دیا گیا ہے۔ اتنی گرمی ہے، لاشیں سڑ جائیں گی، وبا پھیل جائیگی اور اس شہر کے ساتھ تم لوگ بھی محفوظ نہ رہ سکو گے۔ چل کر ان لاشوں کو ٹھکانے لگانے میں مدد دو۔" اور پھر کیمپ کے پندرہ پناہ گزین اور فوج کے تھوڑے سپاہی ساتھ لیکر وہ چل دیا۔ وہ آگے آگے چل رہا تھا اور اس کے پیچھے ٹارچ کی روشنی میں لوگ آگے بڑھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہ سب ٹرین کے قریب پہنچ گئے۔ ان گنت لاشیں جھاڑیوں اور گھاس پر بکھری پڑی تھیں۔ آس پاس فوج کا پہرہ تھا۔ فوج اب اور بھی مستعدی سے انسانوں کے بجائے لاشوں کی حفاظت کر رہی تھی۔ لمبی ٹرین اندھیرے میں اس اژدہے کی مانند معلوم ہو رہی تھی جو پیٹ بھر کر آرام سے لیٹ گیا ہو۔ پتلی پتلی شاخیں اور پتے تیز ہواؤں میں ڈرتے جھگڑتے محسوس ہو رہے تھے اور کتنے ہی الو بھیانک آواز میں چیخ رہے تھے۔ پناہ گزینوں نے اور پھر جنگل میں لمبے چوڑے گڑھے کھودنا شروع کر دیئے تھے۔ جو گڑھا کھد جاتا اس میں لاشیں اس طرح بھر دی جاتیں جیسے کباڑ ٹھونسا جا رہا ہو۔ انگریز افسر اپنی ٹارچ کی روشنی میں لاشوں کو اٹھوانے میں مدد دے رہا تھا۔

پو پھٹ چکی تھی۔ مگر ابھی کام ختم نہ ہوا تھا اور جب صبح کے جھٹپٹے میں انگریز افسر اور دو آدمی ایک درخت کے پاس پڑی ہوئی لاشوں کے قریب پہنچے تو وہ جیسے حیرت سے ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ تین لاشوں کے پاس ایک بڑھیا بیٹھی تھی جو اپنی جگہ پر یوں جمی ہوئی تھی جیسے اسے زمین پر چپکا دیا گیا ہو، یا پھر بیٹھے ہی بیٹھے مر گئی ہو لیکن اس کی تو آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور اس کے جسم کو جنبش بھی ہوتی تھی۔ انگریز افسر بالکل قریب جھک کر بڑھیا کو دیکھنے لگا۔ تو وہ بڑی مدھم آواز میں بولنے لگی۔

"میں انتظار کر رہی تھی کہ کوئی آئے اور انہیں ٹھکانے لگا دے ورنہ یہ سڑ جائیں گے اور گدھ انہیں کھا جائیں گے۔"

دونوں پناہ گزین لاشوں پر جھکے اور ان کے اوندھے جسموں کو سیدھا کر دیا۔ تینوں جوان تھے۔ تینوں کی صورتیں بری نہ ہونگی۔ مگر ان کے خون سے بھرے ہوئے چہرے بڑے بھیانک لگ رہے تھے۔

"میں ان کی ماں ہوں — وہ — میرا سب سے بڑا بیٹا ہے، یہ اس سے چھوٹا اور یہ اس سے چھوٹا۔" انگریز افسر حیرت سے ماں کو دیکھتے دیکھتے لاشوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ بڑے خوبصورت تھے، میرے تینوں بیٹوں کی آنکھیں تاروں کی طرح چمکتی تھیں تم انہیں یوں کیا دیکھتے ہو؟" ماں بڑبڑائی پھر اس کی آواز ذرا سی بلند ہوئی۔

"لے جاؤ۔ میرے بیٹوں کو لے جاؤ۔" ماں نے آنکھیں بند کر کے سر درخت کے تنے سے ٹیک دیا۔ اس کی آنکھ میں ایک بھی آنسو نہ تھا۔ اس کے لبوں پہ ایک بھی آہ نہ تھی۔

"لے جاؤ — میں تو تم ہی لوگوں کا انتظار کر رہی تھی۔ لے جاؤ، میرے بیٹوں کو لے جاؤ۔"

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے ـــــ"

ستر لاکھ انسان سرحد کو عبور کر کے اپنے نئے ملک میں داخل ہو رہے تھے ـــــ یہ ستر لاکھ آخر کیسے سما گئے، کہاں کہاں رہنے لگے؟ اور نئے ملک کے سرسبز لہلہاتے ہوئے پودوں کے بیچوں بیچ اور خشک ریت کے ذروں کے کنارے بسے ہوئے شہروں میں بے شمار خالی مکانوں نے اپنی باہیں کھول دیں اور انہی بھرے بھرے شہروں، گاؤں اور دیہاتوں میں جھلسے ہوئے ادھ جلے مکان منہ کھولے کھڑے رہے کہ شاید ان کی قسمت بھی کھلے۔

اور ایسے ہی سیاہ بخت مکانوں میں ایک مکان یہ بھی تھا جس میں عطری کے دفتر کا ایک خاموش کلرک رہتا تھا۔ اس مکان کی اینٹوں پر شعلوں کے تھپیڑوں کے نشان تھے جس سے اس کا منہ جھلس کر بدنما ہو گیا تھا۔ لکڑی کی تمام چیزیں یا جل چکی تھیں یا لوگوں نے اکھاڑ لی تھیں۔ لوگ حیران تھے کہ اس نے کسی بہتر جگہ کو اپنانے کی کیوں کوشش نہ کی تھی حالانکہ جس وقت وہ اس محلے میں آیا تھا کتنے اچھے اچھے مکان خالی تھے یا کم از کم ان پر قبضہ کیا جا سکتا تھا۔

"تمہیں آخر یہ سنسان جگہ کیوں پسند آئی؟"

پسند ناپسند کا سوال نہیں بھائی، سب کچھ تو جا رہا لٹ گیا، اب دو چیزیں پاس ہیں ان کے لئے کیا بڑے بڑے مکان تاڑتا پھروں، خواہ مخواہ کا جنجال اوٹ کے رکھنے کا فائدہ کیا؟ ایسی چیزوں نے بھی کبھی کسی کا ساتھ دیا ہے ـــــــــــــ

"تین کمروں میں سے ایک کے دروازے کھڑکیاں سلامت تھیں بس ڈیرا ڈال دیا، دھونی رما دی ـــــ مسافر آدمی ہیں"

اور جب وہ اس مکان میں داخل ہوا یا یوں کہئے کہ جب وہ اس کمرے میں داخل ہوا جو ابھی تک اس جگہ پہ مکان ہونے کی دلیل تھا تو بالکل جیسے مسافر رات کے وقت پلیٹ فارم پہ کسی سٹال کی اوٹ میں بستر ڈال دے اس کے پاس بڑا مختصر سا سامان تھا، بس ایک بستر اور ایک سوٹ کیس

صبح اٹھ کر وہ سوٹ کیس سے شیو کا سامان نکالتا، پرانے بلیڈ کو شیشے کے ٹوٹے ہوئے گلاس سے بڑی دیر تک گھستا رہتا اور انگلیوں کو تھوک لگا کر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اسے محسوس کرتا رہتا، جب وہ تیز ہو چکتا تو اسی چارپائی پر بیٹھ کر تکیے کے سہارے آئینہ رکھتا اور داڑھی بناتا ـــــ تہمد سنبھالتا تولیہ کندھے پر ڈالتا ہوا پاس کی مسجد سے نہا آتا۔ مسجد کا ایک کونہ بھی آگ کی لپیٹ میں آ چکا تھا ابھی تک وہاں مرمت نہ ہوئی تھی، شاید یہی ہم آہنگی دیکھ کر وہ اس مسجد میں جاتا، اور جس دن وہ اپنی مرضی کے باوجود وہاں نہ جا سکتا تو محض منہ ہاتھ دھونے پر اکتفا کر لیتا۔

"آج ڈرائی کلین ہی سہی!" وہ خود سے کہتا اور نہانے یا ڈرائی کلین کرنے کے بعد تکیے کے نیچے سے پتلون نکالتا اس کی کریز دیکھتا کپڑے بدلتے ہوئے کھڑکی سے باہر جھک کر ذیا باہر کھلی جگہ میں دھوپ پر نظر کرتا اور جلدی جلدی کپڑے پہنتے ہوئے گنگنانا شروع کر دیتا ـــ "چل چل رے نوجوان!" خود پہ نظر ڈالتا تو ہنسلی کی ابھری ہوئی ہڈی اور اندر کو دھنسا ہوا سینہ اس کا منہ چڑاتا اور وہ کہتا "ہوں! نوجوان! مگر" پھر وہ تسلی دینے کے انداز میں کہتا "اس میں اپنا کیا قصور" اور پھر سے گنگنانا شروع کر دیتا۔

چل رے نوجوان ـــــ بیٹا دفتر کو چل اڑھائی میل دور جانا ہے ابھی تو دراسی چھکڑے پر جسے کسی زمانے میں بائیسکل کہا جاتا ہو اور جسے اس نے بڑی مشکل سے لٹے ہوئے مال کے سرکاری سٹور سے خرید اتھا۔

دفتر میں دن بھر وہ بڑی بڑی فائلوں سے بھرے ہوئے کمرے اور طویل و عریض رجسٹروں کے درمیان گھرا رہتا۔ اسے سر کھجانے کی بھی فرصت نہ ملتی اگرچہ سر کھجانے کی ضرورت اسے کئی بار محسوس ہوتی یہ شاید صرف اسی کا ملال تھا یا اس کے سے دو ایک اور آدمیوں کا —— کیونکہ بقول اس کے افسروں کے اسے کام کرنے کی عادت تھی اور یہ عادت چونکہ کافی بُری عادت شمار کی جاتی ہے اس لئے اسے سب سے زیادہ کام دیا جاتا۔ اس کے اکثر ساتھی اپنا کام بھی اس پہ ڈال دیتے

"امجد بھئی ذرا یہ ایک کیس ہے، ذرا بنانا تو؟"

"اچھا بھئی رکھ دو، یہ اپنا کیس ختم کر لوں، پھر خود ہی ڈرافٹ لکھ دوں گا، تم پیش کر دینا"

یوں اس کی میز پر فائل پر فائل جمع ہوتی جاتی اور فائلوں کا انبار دیکھ کر سپرنٹنڈنٹ جاتے جاتے پوچھتے چلا اٹھتا،

"امجد، Clear up your table، تمہارے کیس نظر آ رہے ہیں، تمہارے Pending کیس رکھ چھوڑے ہیں ——"

اور کبھی کبھی واپسی پر سائیکل کے کیریر پر چند فائلیں بندھی ہوتیں جو وہ گھر لا کر دیکھتا۔ راستہ بھر وہ ہر چند منٹ کے بعد ان فائلوں کو ہاتھ سے محسوس کرتا رہتا، یہاں تک کہ بعض اوقات اسے خود اپنے پر تعجب ہوتا کہ وہ کیوں اس قدر متزلزل یقین کا مالک تھا۔ اسے خواہ مخواہ کے خدشے کیوں تھے۔

گھر آ کر وہ ان فائلوں کو سرہانے کے نیچے پتلون کی جگہ رکھ دیتا، کچھ دیر بیٹھا سر کھجاتا رہتا جیسے وہ گھر میں دفتر کی کسر نکال رہا ہو یا پھر بھدی طرح منہ کھول کر جمائیاں لیتا، کچھ دیر کے لئے لیٹ جاتا پھر جانے اسے کیا خیال آتا ایک دم سے اٹھتا، کپڑے بدلتا، پتلون احتیاط سے تہہ کر کے تکیے کے نیچے رکھ دیتا اور اس کی جگہ پتلون وہاں جما دیتا۔

دیکھتے دیکھتے شام ہو جاتی مٹی کے تیل کا دیا جلاتے بھی اسے ڈر محسوس ہوتا کہ کون لالٹین کے لئے بھاگتا پھرے۔ یا پھر گھنٹوں لائن میں کھڑا رہے، اس کے پاس اتنا وقت کہاں تھا اور بلیک سے حاصل کرنے کے لئے فالتو پیسے اس کے پاس کہاں سے آتے۔ اللہ جانے کیا گزری تھی اس مکان پر۔ بجلی کی فٹنگ کے نشانات کہیں کہیں اب بھی نظر آتے تھے، اس کمرے میں جیسے پوری طرح نہ جل سکا تھا لکڑی ہی اور وائرنگ کہیں کہیں تھی اور سوئچ بورڈ کے نشانات بھی قائم تھے۔

اس نے اپنا پروگرام ہی کچھ یوں بنایا ہوا تھا کہ اسے روشنی کی اتنی زیادہ ضرورت ہی نہ تھی، شام سے پہلے پہلے وہ پاس کے تنور پر کھانا کھانے کے لئے چلا جاتا جھونپڑی سے باہر وہ جھاڑو دی ہوئی صاف زمین یا بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ جاتا، چٹائی کے ارد گرد نم زدہ صاف زمین حاشیہ بناتی اور اس کے کناروں پر وہیں سے صاف کی ہوئی مٹی پڑی ہوتی ——

"موسی مجھے دو روٹیاں بھیج دینا جلدی ذرا —— مجھے ذرا دفتر کا کام ہے ——" وہاں وہ ہمیشہ دفتر کے کام ہی کا بہانہ کرتا تھا۔

اس کے قریب چٹائی پر آلتی پالتی مارے یا چٹائی سے پرے صاف زمین یا اس کی سرحد سے پرے کی گرد آلود زمین پر پاؤں کے بل بیٹھے ساتھی اس سے دنیا جہان کی باتوں کے متعلق سوال کرتے جیسے اسے سبھی کچھ معلوم تھا،

"بابو جی!" وہ اسے بابو جی ہی کہتے تھے حالانکہ اسے اس لفظ سے چڑ تھی۔

"بابو جی تم تو پڑھے لکھے ہو ذرا بتاؤ تو آج کل اخباروں میں کیا خبریں ہیں، کوئی مکانوں کے تبدیل ہونے کا بندوبست ہو رہا ہے؟"

"سنا ہے بابو جی" کوئی اور پوچھتا "کہ جہاں جہاں زمین سے بڑا بڑا کرایہ مانگا جا رہا ہے، جو کرایہ نہ دے گا اسے بے دخل کر دیں گے؟"

"اور بابو جی —— بیک جیسے ضمیمے والا چیخ رہا تھا آج ——"

بابو جی اس تھوڑے سے وقت میں ریلوے کے اوقات سے لیکر گورنمنٹ کی غیر ملکی پالیسی کے متعلق باتیں پوچھی جاتیں۔

اور کبھی موسی کو کچھ فرصت ہوتی تو وہ اس سے اس کے گھر کے متعلق باتیں پوچھتی

"اچھا تمہارے کتنے بہن بھائی ہیں ——"

"آٹھ کروڑ کے قریب موسی!" اور موسی کپڑے کی گدی پچی روٹی کو تنور کے منہ میں سے جاتی ہوئی دفعتہً رک جاتی اور اس کی طرف دیکھتی "آٹھ کروڑ!— پھر دھم سے روٹی کو تنور میں جماتے ہوئے کہتی —

"کیا کہا؟"

"ہاں موسی اپنے جو نہ رہے اب یہ سب ہمارے ہی بہن بھائی ہیں نا۔"

یہ اور ایسے سوال اگرچہ اس کے رستے تکلیف دہ تھے اور وہ انہیں چھیڑتے ہوئے ڈرتا تھا مگر اس سے بھی ٹیڑھا سوال وہ ہوتا جب موسی خود اس کے بارے میں کوئی سوال کر بیٹھتی —

"تم اب شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ تمہیں روٹی وغیرہ کا آرام ہو جائے گا۔"

"نہیں موسی! ابھی نہیں، ابھی ——" اور وہ خاموش ہو جاتا، سوچتا آخر اس ان پڑھ موسی کو کیا سمجھائے کہ وہ کیوں اس جنجال میں پھنسنا نہ چاہتا تھا، وہ کیونکر اسے سمجھاتا کہ وہ یہاں آنے سے پہلے کیا کچھ سوچا کرتا تھا اور اب، اب اس کے ذرائع اس قدر محدود تھے کہ وہ اکیلا ہی بمشکل زندگی گزار سکتا تھا، روٹی — اسے باورچن کی ضرورت نہ تھی،

"تم زندہ ہو موسی، روٹی کھلا دیتی ہو، دیکھا جائے گا" اور بات کا رخ پلٹ دیتا "کیا اچھی بندی لگائی ہو تم بھی، یہ سرخ سرخ کنارے اور سرخ پھول اٹکا کہیں سے بھی کچا نہیں رہتا، دو کی بھوک ہو تو خواہ مخواہ تین کھانے کو جی چاہتا ہے، میں تو تمہاری روٹیاں کھا کھا کر موٹا ہوتا جا رہا ہوں۔"

یوں پڑے پڑے جب کچھ وقت گزر گیا تو ایک رات کی خاموش تاریکی میں اس کی آنکھوں نے کچھ دیکھنا شروع کیا اور اس کے دل نے چپکے چپکے اسے کچھ سمجھایا "امجد یوں کب تک یہاں بیٹھے رہو گے؟ تمہارا اور کون ہے، کوئی بہتر جگہ ڈھونڈو — اس کا کیا یقین"

اور کچھ دن بعد وہ دفتر میں ہر نئے آدمی سے تعارف کے وقت بڑے جوش سے کہتا "میں نے فوج میں شامل ہونے کی درخواست دے رکھی ہے دیکھیں یہاں کتنی دیر ساتھ رہتا ہے۔"

اور سب لوگ اسے wish you good luck ایک ہی فقرہ کہتے جیسے ان سب کو اس بات کے جواب کے لئے اور کچھ سکھایا ہی نہ گیا تھا۔

اب اسے جس وقت بھی فائلوں سے فرصت ملتی وہ اسی کے متعلق سوچتا کہ وہ کیپٹننڈ افیسر ہو جائے گا تو اس مصیبت سے تو نجات ملے گی، جیسے کسی نے اس کے ذہن اور اس میں پیدا ہونے والی تمام امیدوں اور امنگوں کی کلیوں کو کھلنے سے پہلے ہی مسل دیا تھا۔

نئے دیس میں پناہ لینے والوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا، جن لوگوں نے بڑے بڑے مکانوں پر قبضہ کر رکھا تھا اب وہ کسی کو وہاں لینے کے لئے تیار نہ تھے جس مکان میں دس آدمی سما سکتے اس پر دو نے قبضہ جما کر وہاں رہنے والوں کی تعداد دس دکھا رکھی تھی، راشن کے کارڈ اس کے گواہ تھے۔ بے دخلی ناممکن ہو رہی تھی، اکیلے آدمی کسی جگہ ایک کمرہ پا لیتا اس سے بہتر سمجھتے تھے کہ کسی کو تنگ کر کے مکان پر قبضہ کر لیا جائے۔

"امجد!" اسے دفتر کے ایک ساتھی نے کہا کہ "بھئی تم تو اب کسی دن کیپٹننڈ آفیسر ہو جاؤ گے، مکان کے متعلق کیا صلاح ہے"

امجد کیپٹننڈ آفیسر کا نام سن کر چونک اٹھتا، زور سے سانس کھینچ کر چھاتی پھلاتا، اس کا اندر کو دھنسا ہوا پیٹ پسلیوں کی ہڈی سے کچھ ہی دور رہ جاتا اور کوئی بڑی سی شریان دھک دھک دھڑکنے لگتی مگر اس کی آنکھوں میں مسرت کی ایک خاص چمک آ جاتی

"ہاں مکان، تم ابھی آ جاؤ، تین چار کمرے ہیں۔ ایک میں میں ہوں، دوسرا ذرا ٹھیک کر ڈالو اور آ جاؤ۔ ایک دروازہ نہ دار دہے — اور بجلی بھی نہیں —؟ تیسرا ابھی رہنے کے قابل ہو سکتا ہے۔"

پھر اس ننھے سے مکان میں ایک اور آدمی کا اضافہ ہو گیا، اس کا سامان بھی ویسا ہی مختصر سا تھا مگر ذرا مختلف، وہی ایک چارپائی

ایک سوٹ کیس نجاست کا بڑا سا اماں اس میں شیو کا سامان بھی تھا ایک جائے نماز زیادہ تھی

ایک سے دو ساتھی ہوئے مگر مکان کی تنہائی اور اداسی کچھ کم نہ ہوئی۔

امجد سو ہی رہا ہوتا کہ اس کا نیا ساتھی بھلی ہوتی مسجد میں نماز ادا کرنے کیلئے چلا جاتا اور بڑی دیر کے بعد وہاں سے واپس آتا اس عرصہ میں امجد شیو وغیرہ سے فارغ ہو کر نہانے کیلئے چلا جاتا۔ دفتر کے وقت وہ دونوں ایک ساتھ مکان سے نکلتے اور راستہ بھر خاموشی سے پیڈل چلاتے رہتے، امجد اپنے خیالوں میں کھویا رہتا یا فلمی گیت کا ایک ادھ بول گنگناتا مگر ان باتوں سے ناصر کو کوئی دلچسپی نہ تھی اور جو باتیں ناصر کو پسند تھیں امجد کیلئے ان میں کوئی کشش نہ تھی۔ ان سے زیادہ باتیں تو شاید ان کے سائیکل ہی آپس میں کر لیتے تھے، چرخ چوں، ٹک ٹک کی سی آوازوں میں وہ جانے کیا کچھ کہتے۔ امجد اور ناصر کے لئے شاید یہی ایک موضوع بن سکتا مگر وہ ان کی زبان سے بے بہرہ تھے،

ان میں سے کوئی بھی اگر کسی دفتری ریگولیشن یا دفتری آرڈر کی بات کرتا تو دوسرا ساتھی بیزاری سے اس کی بات کاٹ دیتا۔

"کیا ہر وقت یہی دفتری بات، مجھے تو زہر لگتا ہے یہ دفتر کوئی اور بات کہو۔" اور وہ بات کہنے سے زیادہ اچھی چیز خاموشی اختیار کر لینا۔

یوں تنہا ساتھ رہتے رہتے وہ تنگ آ گئے تو انہیں ایک اور ساتھی کی تلاش ہوئی

اور اب کے ایک نہیں دو ساتھی ان کے اس چھوٹے سے مکان میں آ گئے، وہ دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے اور دونوں بے گھر، اس شہر کیلئے وہ دونوں بے گھر تھے اگرچہ ان میں سے ایک کئی گھروں کا مالک تھا،

"میں نے فلاں گاؤں میں مکان الاٹ کروائے ہیں وہاں ایک خاندان کو بٹھا دیا انہی میں سے چند آدمیوں کو ایک اور جگہ بلڈنگ لے دی ہے، ذرا تھوڑی سی جرأت اور ذرا سی رسائی ہونی چاہیے،"

"پھر تم یہاں کیا کرنے آئے ہو ——؟"

"یہی کچھ عجیب آدمی ہو تم جو یوں خاموشی سے اس مکان میں رہتے ہو، دفتر میں ملازم ہو، چیخو، چلاؤ، کسی کا سر کھاؤ، کسی کے پیٹ کو کھانے کو کچھ دو اور بدلے میں ایک آدھ مکان اور دو ایک گھروں کا سامان ہضم کر جاؤ، موقعہ ارے موقعے سے فائدہ اٹھانے ہی سے کام بنتا ہے اور میں تو بھیا سچی بات ہے، اب تم سے کیا چوری یہاں سرحد پر تجارت کے متعلق کچھ دیکھنے آیا تھا۔"

دوسرا ساتھی اگرچہ اس کا ساتھی تھا مگر اُسے ان باتوں سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ اکثر اسے آڑے ہاتھوں لیتا،

"کن سے تجارت کرو گے جنہوں نے تمہیں کالا مار کر نکال دیا تھا" اس نے اپنے ساتھی سے کہا "اور پھر غیر قانونی طور پر" "سب کرتے ہیں، کبھی جا کر دیکھو، ایک چکر میں نے لگایا ہے وہاں سب لوگ مل جل کر مزے سے پھرتے ہیں"۔

"جیسے پہلے پہ آئے ہوں؟ ہے نا؟ نیاز تیرا پیٹ نہیں بھرتا، وہ جو مکان اور زمین الاٹ کروائی ہے کیا کم ہے میں تو یہاں اپنے لئے کام ڈھونڈنے آیا تھا، مگر تو تو نے یہی کیا تھا۔"

"کہنے کو تمہیں بھی یہی کہوں گا۔"

"بے ایمان کہیں کا"

"ایمانداری سے روپیہ کس نے بنایا ہے، مجھے بتاؤ ذرا یہاں کتنے ہیں جنہوں نے دوسروں کے مال پر ہاتھ صاف نہیں کیا، کسی نے ہمت سے خود بڑھ کر ہاتھ مار لیا، کسی نے سرکاری طور پر اسے قانونی شکل دے کر کسی کے ذریعے سے، تم سے چند بے ہمت ہیں جو ایمانداری کا سہارا لے رہے ہیں۔ اب ہر کوئی تمہاری طرح تو ہے نہیں، تم تو میرا خیال ہے کاغذ کھا کر اور سیاہی پی کر بھی زندہ رہ سکتے ہو ——"

اور یہ سیاہی پی کر اور کاغذ کھا کر زندہ رہ سکنے والا شخص اختر بہت، جلد امجد کا دوست بن گیا۔

دن بھر نیاز تو اپنی مہم پر ہوتا اور اختر اکثر امجد کے ساتھ اس کے دفتر چلا جاتا، وہ اپنا گزارا ان تھوڑے سے روپیوں پر کر رہا تھا جو اسے اس کے قلم کے زور سے مل جاتے تھے

"آخر تم کیوں کوئی اور کام نہیں کرتے؟ آخر اس کا فائدہ تمہاری خون جگر سے لکھی ہوئی چیزیں چند بیکار آدمیوں کے تفنن طبع کے کام آتی ہوں گی۔ جو اپنی آرام کرسی پر بیٹھ کر کسی تلاش لکھنے والے کی کسی اچھی سی چیز پر واہ واہ کر اٹھتے ہیں اور بس۔"

"مگر میں تو ——"

"ہاں تم ان کیلئے نہیں لکھتے مگر پڑھنے والا طبقہ تو یہی ہے" "اور میں نیاز کے ساتھ مل کر کام شروع کر دوں گا طریقہ تو اچھا ہے"

ان دو نئے آدمیوں کے آنے سے گھر میں رونق سی آگئی۔ اب وہاں تنہائی کا احساس نہ ہوتا تھا اور نہ ہی اس کی فضا پر اداسی چھائی ہوئی معلوم ہوتی کوئی نہ کوئی موضوع زیر بحث آ ہی جاتا۔

"ارے میاں عجیب چیز ہو تم بھی امجد، ناصر اتنی دیر سے یہاں ہو تم دفتر سے آ کر بڑی بڑی جمائیاں لیتے رہتے ہو، ایک ایک پیالہ چائے کا پیا کرو۔ خود بنا لیا کرو ابھی تک چار پیالیاں بھی نہیں رکھیں کہ کوئی بھلا مانس دن بھر کے کام کاج سے تھک کر آئے تو دو گھونٹ چائے ہی بنا کر پی لے۔ لاؤ سب چندہ کرو، میں کل یہ سامان لے آؤں گا، شام ذرا اچھی گزرا کرے گی،

اسی طرح آہستہ آہستہ گھر میں کچھ چیزیں جمع ہو گئیں کچھ برتن، چند کرسیاں، دو ایک چھوٹی میزیں اور گھر اچھا خاصا معقول سا گھر نظر آنے لگا، سیاہی پر رنگ کر دیا گیا اور لکڑی کے چند تختے فٹ کرا دیئے گئے۔

صبح اور شام کی چائے اکٹھی شروع ہوتی اور اس کی رونق اور دلچسپی نے ان سب کو قریب تر کر دیا تو انہیں رات کی روٹی کے متعلق بھی کچھ خیال ہونے لگا،

"پھر بھئی" نیاز نے کہا "تم میں سے شادی کون کرواتا ہے یہ روٹی کا جھگڑا ابھی کم ہو ——"

"تم کیوں پہل نہیں کرتے، مکانوں زمینوں والوں میں سے ہو، بسم اللہ کرو ——"

"اپن تو بھئی ابھی سوچ رہے ہیں کر ——"

"کہ کون سب سے زیادہ بولی دیتا ہے ——" اختر نے کہا "تم تو بکاؤ ہو"

"ذرا میری بزنس سٹ ہو لینے دو، پھر بتاؤں گا کسی اچھی جگہ رہوں گا ——"

"واقعی!" اب ناصر بھی اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگا تھا، وہ بھی شاید اسی بزنس میں شریک ہونے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس نے امجد سے بھی ایک آدھ بار علیحدگی میں اس کا ذکر کیا تھا بلکہ اسے بھی شامل ہونے کی دعوت دی تھی مگر امجد نے کہا تھا کہ وہ تو فوج میں شامل ہو رہا ہے اسے ان خرافات میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔

نیاز کی شروع کی ہوئی یہ بات کبھی کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکتی ہر بار اس میں نئے نئے موضوع آ ملتے اور کبھی کبھی بات تلخی کا رنگ بھی اختیار کر لیتی، مگر شام کی روٹی ایک ایسا مسئلہ ضرور تھا جس کا انہیں کچھ حل سوچنا تھا اور آخر کار اس کا حل بھی انہوں نے سوچ ہی لیا۔ اور وہ تھا ایک نیا ساتھی۔ بڈھا حسین بخش۔

حسین بخش کہتا تھا کہ وہ بھی انہی ستر لاکھ میں سے ایک تھا جو اس طرف سے آئے تھے اسی لئے نہ اسکے پاس رہنے کے لئے کوئی جگہ تھی اور نہ کوئی اور سامان تھا، اور نہ ہی کوئی کام انہیں بھی ایسے ہی کسی آدمی کی ضرورت تھی،

بڈھا حسین بخش بقول خود اچھا باورچی تھا، انہوں نے اسے اپنے چھوٹے سے کنبے میں شامل کرنے میں کوئی ہرج نہ سمجھا،

"مگر بابا ہمارے پاس کمرہ کوئی نہیں ہے"۔

کمرہ مجھے کرنا ہی کیا ہے بابو جی' برامدے میں چارپائی بچھالیا کروں گا، دو کپڑے ہیں سو وہ جہاں آپ کے وہیں میرے"، نہیں اسمیں اعتراض ہی کیا تھا، چند چیزیں اپنے کمرے میں رکھ لیں۔

اور اپنی چند چیزوں کے بہانے بڈھا اکثر ان کے کمروں ہی میں رہنے لگا۔ کبھی ناصر کے کمرے میں، کبھی امجد کی چارپائی کے قریب اور کبھی اختر کے کمرے میں داخل ہوتا تو وہ کہہ اٹھتا ـــ "چھوڑو بابا ـــ ادھر آؤ' پرانی چیزیں کیا تلاش کرتے ہو تازہ شعر سنو ـــ!" اور حسین بخش کہتا، "ہمیں شعر سے کیا بابو جی، ہمیں تو آگ جلانے کے لئے پرانے کاغذ دیکھ رہا ہوں۔

اور نیاز کہہ دیتا "لے جا بابا' کل بھی جلانے کے کام آئیں گے۔ یہ کارِ خیر آج ہی سہی ـــ"

"اب جا تو' تجھے کیا معلوم ان کی قیمت، گدھا کیا جانے زعفران کا بھاؤ"۔

"خیر جاؤ بابا کام کرو" اور بابا چلا جاتا پھر نیاز کی بزنس کے امکان بہتر ہونے لگے تو وہ روپے وغیرہ کا بندوبست کرنے کیلئے گاؤں چلا گیا۔

"واپس آؤ گے؟"

"ہاں آؤں گا تو بہر حال مگر یہاں نہیں ٹھہروں گا، فلیٹ لوں گا کسی بہتر جگہ بزنس یوں تھوڑا ہی چلتی ہے تم لوگوں کو بھی دعوت دوں گا وہاں آنے کی چھوڑو اس ذلیل جگہ کو'

امجد تم تو کمیشنڈ افیسر ہو رہے ہو ـــ"

مگر امجد کو کمیشن نہ مل سکی میڈیکل بورڈ نے کہا اسے دل کی تکلیف تھی اور سیلکشن بورڈ نے فتویٰ دیا کہ اس کا ذہن 'موہوم بے بنیاد خدشات' کا شکار تھا' اس کی تمام سکیمیں برباد ہو گئیں تھیں ـــ

جس دن وہ یہ خبر سنکر اپنے گھر آیا کہ اختر سے بات کر کے اپنا غم ہلکا کر سکے اس نے دیکھا کہ اختر چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے اداس بیٹھا تھا گھر میں جو چند چیزیں انہوں نے اکٹھی کی تھیں غائب تھیں

"اختر یہ گھر کو کیا ہو گیا' ہماری ساری پونجی وہ چند چیزیں کہاں گئیں"

"بابا نے کہا تھا نا کہ جہاں اس کی چیزیں وہاں ہماری ـــ آج اس نے یہی کر دکھایا ہے ـــ میرے بیکار کے کاغذات بھی لے گیا ہے یہی نہیں آج ناصر بھی نیاز کے ساتھ چلا گیا ہے اس کی بزنس میں شرکت کے لئے ـــ تم بھی کسی دن سیلکٹ ہو جاؤ گے اور ـــ"

"کہاں؟ اب نہیں ـــ" اس نے چارپائی پر گرتے ہوئے کہا۔

بڑی دیر وہ وہاں اداس لیٹا جماہیاں لیتا رہا اور ایسے ہی اُسے نیند آگئی،

جس وقت اس کی آنکھ کھلی اس نے دیکھا کہ دھوپ زرد پڑ چکی تھی' فضا میں ہر طرف خاموشی اور اداسی تھی' رنگ کے پیچھے سے دیواروں کی سیاہی نے پھر سے جھانکنا شروع کر دیا تھا ـــ اختر ویسے ہی اپنی چارپائی پر بیٹھا تھا'

"چلو امجد' روٹی کھالیں تھوڑی سی ـــ"

اور تنور کے باہر چٹائی پر بادلِ ناخواستہ بیٹھتے ہوئے اس نے آواز دی۔

"موسی دو روٹیاں' ذرا جلدی مجھے دفتر کا بہت کام ہے آج ـــ!"

عبد المجید بھٹی

اہلِ قلم

ہاں تو راشن بھی آ ہی جائیگا
کھانا ہوٹل سے آج منگوا لو
اس جگہ تو حساب چلتا ہے

پڑھ رہا ہوں مشاعرہ میں بھی
کل نہیں، پرسوں، پرسوں بے لینا
ہاں تو اک پیکٹ اور سگرٹ کی

سرچڑھی آ رہی ہے بھنگن بھی
اور سقہ تو جان کو آیا!
لیکن آخر کمین ہی تو ہیں

چھاپ لینا کتاب جتنی بھی
آج گھر میں ذرا نہیں اچھے
اور دس پانچ کی عنایت ہو

میں دوپٹہ بھی لے ہی آؤنگا
دس تو اخبار والے دے دینگے
ایک افسانہ لکھ رہا ہوں میں

اک اٹھنی تو لو پڑوسن سے
مجھ کو جانا ہے ایک جلسے میں
آج میری وہاں صدارت ہے

ہاں ادھر سے، نہیں ادھر سے چلوں
یہ قصائی وہ لانڈری والا
توبہ کتنے ذلیل ہیں یہ لوگ

بزرخی رازی کوئی تو ہو گا!
آج گلریز، میں چلے جائیں
بے حیا زندگی کو بہلائیں

صدیقہ بیگم سیوہاروی

عیدو خاں

اور ریڈیو خالی بادل کی طرح گرج رہا تھا اور سرکاری اعلان فضا میں گونج رہا تھا:

"پچھلے دنوں سے رنگ پور میں جو بغاوت ہو رہی تھی اس کو حکومت نے فرو کر دیا۔ جہاں تک حکومت کو معلوم ہو سکا ہے اس بغاوت کے پیچھے کمیونسٹوں کا ہات ہے اور وہ تلنگانہ کے اصولوں پر تمام ملک میں بدامنی پھیلانا چاہتے ہیں چنانچہ حکومت نے اس کے خلاف جوابی کاروائی کی اور اس سرخ بغاوت کو فرو کرنے کے لئے گولی چلانی پڑی اور حکومت اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ مشہور باغی کمیونسٹ عیدو خاں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اور اب مکمل امن و امان ہے۔ عیدو رنگ پور کا مشہور کمیونسٹ باغی تھا اور حکومتِ وقت کا تختہ الٹنا چاہتا تھا۔ اور ساتھ ہی رنگ پور میں ہندو مسلمان فساد بھی کرانا چاہتا تھا چنانچہ قانونِ تحفظ عامہ کے تحت اس کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور اب وہاں مکمل امن و امان ہے۔"

میں رنگ پور میں اجنبی نہیں ہوں سب کو اچھی طرح جانتی ہوں اور آج سے نہیں بلکہ کئی برس سے جانتی ہوں، میں عیدو کو جانتی ہوں بھان بہادر رمضان خاں کو جانتی ہوں اس لئے کہ میں خود بھی تو رنگ پور میں پلی بڑھی ہوں میں نے اپنی اس عمر میں رنگ پور کی زندگی کے ہر دور کو دیکھا ہے اس وقت بھی دیکھا ہے جب کہتے ہیں کہ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے، جب رنگ پور میں یک جہتی تھی، جب وہاں کی زندگی میں ایک بھی ہاہا کار نہ آیا تھا، جب دریا میں کوئی طوفانی لہر نہ آئی تھی اور رنگ پور خاموش تھا مگر میں اتنا جانتی ہوں کہ اس خاموشی کے پیچھے بھی ایک بڑی ہلچل تھی جو لوگوں کے دلوں میں پرورش پا رہی تھی، یہ اور بات ہے کہ وقت کی رفتار کے ساتھ یہ ہلچل زیادہ واضح دکھائی دے رہی ہے۔ آج جب کہ رنگ پور میں دو صفیں دکھائی دے رہی ہیں ایک وہ صف جس میں ہتھیار بند سپاہی ہیں، زمینداروں کے غنڈے ہیں اور رکھتہ پوش والنٹیر — جو لفظاً والنٹیر ہیں مگر صوبائی حکومت نے کسی فوری ضرورت کے تحت اُن کی بھرتی کی تھی اور ان سب کے روح و رواں وہ زمیندار جن کی ان علاقوں میں زمینیں ہیں — اور اس صف کی بائیں جانب ذرا فاصلہ پر ایک اور صف ہے جس میں ایک ہی طبقے کے انسان ہیں، سب مزدور اور کسان ہیں جن کے کس بل پر غرور شہریار اس وقت بھی اکڑ رہا ہے جن کے کھیتوں کا رس اُن کے دشمنوں کے چہرے پر چمک رہا ہے جن کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں — مگر میں ان کی آنکھوں میں ایک عزم دیکھ رہی ہوں اور یہی وجہ ہے کہ رنگ پور کے اس علاقے میں جہاں ہر مذہب و ملت کے لوگ تھے کاندھے سے کاندھا ملائے ہوئے تھے اور انہوں نے طے کر لیا تھا کہ جب تک زمینداروں سے زمین نہ چھین لیں گے چین سے نہ بیٹھیں گے۔ ان کے سامنے سیاست کی ایسی کوئی گتھیاں نہ تھیں جن کو سلجھانے کے لئے کسی نہرو یا پٹیل کی ضرورت ہوتی وہاں تو سیدھا مسئلہ تھا۔

"یہ کھیت ہمارے ہیں، یہ دھرتی ہماری ہے جس کے سینے پر سالہا سال ہم نے ہل چلائے ہیں۔ جن کی مٹی ہمارے پسینے سے سینچی ہوئی ہے اور صرف ہمارے ہی نہیں ہمارے باپ داداؤں کے ماتھے کے پسینے کی بوندیں بھی اس میں جذب ہیں اور اس دھرتی پر ان کے قدموں کے نشان چھپے ہوئے ہیں — یہ ہماری ہیں اور انہیں ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا —"

پھر اچانک حکومت نے کہا کہ زمینداری ختم ہونے والی ہے۔ نیا قانون بننے والا ہے۔ کسانوں اور کھیت مزدوروں کی باچھیں کھل گئیں

گاؤں میاں، تیرتھ ‌رام، عیدو، رامو، کشن، شیام اور منوہر سب ہی کے چہرے چمک گئے۔ سب کے ماتھے پر خوشی کی لہریں دوڑ گئیں — مگر تا کجے۔ وہ قانون بنا اور بنتا رہا مگر گاؤں میں بے دخلی اس طرح پھیل گئی جس طرح آزادی کے بعد شہروں میں پھیل رہی تھی، بات سیدھی تھی اس کے سمجھنے کے لئے بڑے سیاست دانوں کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے کہ محنت کش اپنے حق سے محروم ہو رہے تھے۔ حکومت کہہ رہی تھی کہ غلہ کی پیداوار بڑھاؤ، زمیندار رمضان خاں کہہ رہے تھے کہ بے دخلی کرو اور عیدو کہہ رہا تھا کہ ہم اپنی زمینوں پر قبضہ کریں گے اور پولیس کہتی تھی کہ ہم امن و امان قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

چنانچہ گاؤں کے چھوٹے چھوٹے کاشتکار بے دخل ہو چکے تھے اور مجبور ہو کر اپنے زمینداروں کے یہاں بٹائی پر کام کر رہے تھے۔ اُن کے دلوں میں شعلے بھڑک اُٹھے اور یہ دھیمی دھیمی لوئیں پل پل کر تیز ہو گئیں اس لئے کہ رمضان ہوں، کلیم خاں ہوں یا مان سنگھ اور رام نرائن ہوں۔ سب کے سب زمیندار تھے اور وقت کے رخ کو پہچان رہے تھے انہوں نے آزادی سے پہلے اپنے خطاب واپس کر دیئے تھے اس لئے کہ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ خطاب بھی بیکار ہو چکے تھے۔ اب اس مکان کی چھت پرانی ہو چکی تھی۔ برساتی پانی بہنے لگا تھا اسی لئے نئی چھت ڈلوانی پڑی۔ آخر پرانی چھت نے بھی کتنے دن کام دیا۔ خان بہادر رمضان خاں نے بھی آزادی ملنے سے پہلے ہی خان بہادری کا خطاب واپس کر دیا تھا اور اب وہ سیدھے سادے رمضان خاں تھے اور اپنے دشمنوں سے مقابلے کی تیاری کر رہے تھے۔ چنانچہ جب پہلے پہل عیدو کاشتکار کو زمیندار رمضان خاں نے اس کی بابوں کہنے کہ اپنی زمین سے بے دخل کر دیا تھا، تو اس وقت کسی نے یہ بھی نہ سوچا تھا کہ بے دخلی کی گاڑی اس طرح آگے بڑھتی چلی جائے گی۔ وہ تو بس یہ سمجھے تھے کہ عیدو جو کل تک خان بہادر کی ناک کا بال تھا آج ان کی نظروں سے گر چکا ہے اور اس بے دخلی کا اس ٹوپی سے تعلق نہیں ہے جو خان بہادر نے پہن رکھی تھی وہ ٹوپی جس نے زمیندار رمضان خاں کے کردار کو بدل دیا تھا، کردار سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ پہلے خان بہادر کوئی سیدھے سادے کسان دوست انسان تھے جہاں تک میرا اندازہ ہے کہ وہ پہلے بھی خان بہادر رمضان علی خاں تھے اور آج بھی وہی تھے۔ یہ کپڑے جو در اصل رمضان خاں کے جسم پر تھے نہ کہ ان کے دماغ پر — آخر ان کپڑوں سے ان کے دماغ پر کیا اثر پڑ سکتا تھا مگر ہاں جب سے انہوں نے یہ ٹوپی پہن لی تھی سفید کپڑے پہن لئے تھے، ان کے طور طریقوں میں فرق آ گیا تھا، انہوں نے اپنی زمیندارانہ چالوں میں ان کپڑوں سے مدد لی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے آج وہ حکومت کی پولیس اور فوج سے مدد لے رہے تھے۔

اور یہی وجہ ہے کہ جب عیدو کاشتکار اپنی آبائی زمین سے بے دخل ہوا، اس کی وہ زمین چھن گئی، وہ کھیت چھن گئے جن کے بل بوتے پر اس نے قصبے کے بنئے سے اپنی بڑی لڑکی کی شادی کے لئے ایک ہزار روپیہ قرض بھی لے لیا تھا اور وہ قرض کی بات بھی بڑی عجیب ہے اس لئے کہ اس مہنگائی کے زمانے میں جب کہ ہر طرف چیزوں کے دام بڑھ رہے تھے اور جوں جوں چیزوں کے دام بڑھتے جاتے تھے۔ اور روز و شب کی گردشیں آگے کی جانب بڑھتی جاتی تھیں، عیدو کاشتکار کی لڑکیاں بھی بڑھتی جاتی تھیں اور عیدو کی بیوی نے جب سنا کہ اب بیلوں کی جوڑی کے دام بڑھتے بڑھتے چھ سو تک پہنچ چکے ہیں تو اس وقت اس کی نظر اپنی بڑی لڑکی پر پڑی جو خود بھی اسی طرح جوان ہوتی جا رہی تھی اور ہر صبح جب رانی برتن مانجھتی ہوتی اور اس کا آنچل ڈھلکتا تو بس کچھ نہ پوچھو عیدو کی بیوی کا کیا حال ہوتا اس کا بس چلتا تو اس کو جوان ہونے سے روک دیتی اور اس کا غصہ اتنا بڑھتا کہ کبھی کبھی وہ پاگل ہو جاتی اور رانی کی طرف کچھ اس طرح گھور کر دیکھتی جیسے کہہ رہی ہو۔

"رانی کی بچی، بس ہو چکی جوان — اب آگے بڑھی تو چٹیا نوچ لوں گی۔"

مگر پھر فوراً ہی اس کا سر ڈھلک جاتا اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتی۔ اور جب عیدو کاشتکار گھر میں داخل ہوتا تو اس پر بری طرح برس پڑتی۔

"بس اب عید کے چاند کر دو رانی کا بیاہ — اب اس کو روکنے کا وقت نہیں۔"

"کہاں سے کر دوں رانی کی ماں، یہ گڑیا گڈے کا بیاہ نہیں — ہاتھ میں چار پیسے ہوں تو کسی سے بات بھی کروں، یہاں کچی کوڑی تک

نہیں اور پھر آج کے زمانے میں جو کوئی بغیر گہنا پاتی کے بات نہیں کرتا۔
اور اپنی حالت اب کسی سے چھپی بھی نہیں ہے"

"مگر قرض تو لینا پڑے گا۔ دھیرے دھیرے ادا کر دینا۔ آتے جاڑوں کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ اور پھر پھاگن میں گیہوں کی فصل اچھی ہو گئی تو یہ سمجھو کہ ہماری حیثیت ایسی بھی نہ ہو گی کہ بنئے سے مہلت بھی مانگیں۔"

اور یہ بات تو آئی گئی ہو گئی مگر عیدو کاشتکار نے یہی سوچا کر چلو اس کام سے فراغت پا لو، وقت کی بات تھی کہ یہ بات اس کے دل میں شربت کے گھونٹ کی طرح اترتی چلی گئی اور اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور قصبے کے بنئے کے آگے ہاتھ پھیلا دیا اور قرض بھی کیسے نہ ملتا۔ گھر کی کوٹھری میں اگر گوبری دی ہوئی تھی، اناج کی کوٹھیوں میں اگر جھاڑو پڑی ہوئی تھی تو کیا باہر میدان میں تو کھیتی کھڑی تھی۔ غلہ لہلہا رہا تھا، دھان میں زردی آگئی تھی ـــــ سورج کی روشنی میں ہوا کی سرسراہٹ کے ساتھ یہ بالیں لہلہا رہی تھیں۔ بنئے کے تصور میں بھی یہ کھیتیاں جو اس کے قصبے سے چار کوس پر تھیں ہوا کے ساتھ جھومنے لگیں اور اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے دھان کے ڈھیر کے ڈھیر میدان میں آ پڑے ہیں، پھر یہی نہیں اگلی فصل کی پھاگن کی ہوا جیسے اڑاتی ہوئی اس کے کان کے پاس سے گذر گئی اور اس نے دیکھا کہ گیہوں کی بالیں اس کو آواز دے رہی ہیں اس کے قدموں میں لہرا لہرا کر جھوم رہی ہیں۔ اور پھر یہ کھیتیاں بات کی بات میں صاف ہو گئیں، صرف زمین پر ڈنٹھل کھڑے تھے اور گیہوں کی چھری پڑی تھی، کھلیان میں غلہ تھا، بیل اس کو روند رہے تھے گیہوں کے دانے الگ ہو رہے تھے، بھوسا ہوا میں اڑ رہا تھا . . .

ـــــ بنیا مسکرا دیا۔

"دیکھو اب کے کیسی فصل رہی؟"

"فصل ـــ کچھ نہ پوچھو سیٹھ صاحب! اب کے جیسی فصل دس سال میں بھی نہیں ہوئی۔ مگر ابھی تک تو کٹائی کو بہت وقت ہے کون کہے کہ دھان ہے یا بھوسہ ـــ

ہاں سیٹھ صاحب ـــ بس اب تو اوپر والے کی دیا ہے ابھی کیا کہہ سکتے ہیں کہ دیکھنے میں تو بہت کچھ ہے پر تم ٹھیک ہی کہتے ہو جو یہ فصل کٹ کر آ جائے تو سمجھو کہ دھان پیدا ہوا ہے نہیں تو گھاس ہے گھاس۔"

اس وقت عیدو میاں نے ایک دھڑکا سا محسوس کیا جیسے فضا میں کوئی شور سا بلند ہو رہا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہاں سے بھاگ جائے اور بنئے سے قرض بھی نہ لے اور اپنے کھیتوں میں چلا جائے، اپنے دھانوں سے لپٹ جائے مگر پھر فوراً ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھ جھپکی اور اس نے دیکھا کہ اس کی رانی کا چہرہ چمک رہا ہے اس کی مانگ پر جیسے افشاں پڑی ہو، اس کے ہاتھوں میں مہندی رچی ہو۔ اس کی جھکی جھکی نظریں ـــ اور پھر اس کی بیوی اس پر بگڑ رہی تھی . . .

"اب کے جیسا کہو میں کر دوں رانی کا بیاہ ـــــ اب رکنے کا وقت نہیں، لڑکی اور پانی کی باڑھ ہاتھوں کے روکے نہیں رکتی۔"

اور یہی نہیں جیسے کسی نے اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی ہوں۔ اس کے سینے پر کسی نے پتھر رکھ دیا ہو اور ہمالہ کی پہاڑیوں نے اس کا راستہ روک دیا ہو۔"

"سیٹھ جی ـــ میرے کھیت ہیں، میرا گھر ہے، میری بیلوں کی جوڑی ہے۔ اگلی فصل میں سب ادا کر دوں گا نہیں تو سیٹھ جی کھیت تمہارے، گھر بار تمہارا، بل بیل تمہارے، مگر سیٹھ جی قرض تو ادا ہو ہی جائے گا۔ تمہاری دعا سے اب کے فصل بھی اچھی ہو ہی جائے گی۔"

اور سیٹھ نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیا، سیاہ گھنی گھنی مونچھوں کے درمیان سفید سفید دانت چمکنے لگے۔ پورا جبڑا کھل گیا اور سیٹھ کے ماتھے پر دریا کی لہروں کی طرح شکنیں بہتی چلی گئیں۔ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری لہر۔"

"مگر یہ بیلوں کی جوڑی تو تمہاری ہے کہیں ادھار باڑی کی تو نہیں تم کاشتکار لوگوں کا کیا بھروسہ ـــــ ہی ہی" اور وہ بہت زور سے ہنسا ـــ ایسی ہنسی جیسے وہ عیدو کو بھی اس میں شریک کرنا چاہتا ہو عیدو کے چہرے پر ہنسی آئی اور ہنسی بھی کیسی ـــــ اس کی آنکھوں میں چمک بھی تو نہ آسکی، مسکراہٹوں کی ہلکی اور نرم رو لہریں بھی تو نہ آسکیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس کو کسی نے زبردستی ہنسانے کے لئے منہ پر تھپیڑ مار دیا ہو جیسے قصبے کا تھانیدار اس سے کہہ رہا ہو۔

"ابے عیدو ہنستا ہے یا نہیں کہ ماروں چار جوتے۔"

اور دوسرے لمحے اس نے تھپڑ مار دیا اور اس کی آنکھیں اُبل پڑیں اور پھر فوراً ہی اُس نے ہنسنا شروع کر دیا "ہی ہی سرکار ہنس تو رہا ہوں؟" —— اور یہ تھی اس کی ہنسی جو اس کے چہرے پر چمک بھی نہ دوڑا سکی اور ساتھ ہی ساتھ اس کو اپنی ہتک کا احساس بھی نہ ہو سکا۔

اُس نے سوچا کہ کہہ دے "وہ سیٹھ جی یہ جوڑی میری ہے۔ میں نے اس کے لئے اپنی بیوی کے گہنے کی پوٹلی لے جا کر الٹ دی تھی اور تب جا کر یہ جوڑی آئی تھی اور اب یہ میری ہے ——" مگر وہ نہ جانے کیا سوچ کر چپ ہو گیا کہ نہ جانے کیا ہو مگر اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر ایک سال کے لئے وہ اپنی رانی کو جوان ہونے سے روک لیتا تو اس کو بنیئے کے سامنے ذلیل بھی نہ ہونا پڑتا۔ مگر وہ ضبط نہ کر سکا اور اس نے گڑگڑانا شروع کر دیا ——

"سیٹھ صاحب! لڑکی جوان ہو گئی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ جوان لڑکیوں کا زیادہ دن بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے —— ورنہ آپ کے پاس نہ آتا۔ وقت کی بات ہے۔"

اور پھر

جیسے وہ خواب کی بستی میں گھوم رہا تھا جیسے کسی نے اس کے جسم میں شراب انڈیل دی تھی۔ اس کو کچھ خبر نہ تھی کہ کیا ہو گیا ہے بس اس کو اتنا معلوم تھا کہ اس کے ہاتھ میں ایک ہزار روپیہ ہے۔ وہ مسکرایا، اس کی مسکراہٹ میں جسم و جان کا وزن پڑنے لگا اور ایک ہزار روپیہ اس کے ہاتھوں میں شعلے کی طرح تپنے لگا۔ اس کا انگوٹھا بنیئے کی سیاہی سے کالا ہو رہا تھا اس نے زمین سے رگڑا، انگوٹھے کی سیاہی ماند پڑ گئی اور وہ بنیئے کے پیر چھوتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اس کی رانی اس کی نظروں کے سامنے پھر گئی اس کے جسم پہ چاندی ہی چاندی تھی اور عیدو مسکرا رہا تھا۔ اس کی اپنی رانی دلہن بنی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کی مہندی اس کی سیج کی طرح سرخ ہو گئی تھی اور وہ بڑھتا چلا گیا اپنے گاؤں کی طرف، اپنے کھیتوں کی طرف اور جوں جوں وہ بڑھتا جاتا تھا۔ اس کے کھیت اس سے دُور ہوتے جاتے تھے۔ بالکل اس لالی کی طرح جو شام کو ڈوبتے ہوئے سورج کے ساتھ پہاڑیوں کے پیچھے دکھائی دیتی ہے اور پھر پلک جھپکاتے جھپکاتے ان گھاٹیوں میں کھو جاتی اور وہ منہ تکتا رہ جاتا —— وہ ایک ہزار روپیہ لئے چلا جا رہا تھا۔ اس کے کھیت اُس سے دُور ہوتے جا رہے تھے۔ اس کا گاؤں اس سے دُور ہوتا جا رہا تھا، مگر وہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اور وہ اپنے گاؤں پہنچ گیا۔

اس نے رانی کی شادی کی بات چیت پکی کی۔ اس کی شادی کا بندوبست کیا اور پھر ——

زمیندار نے اس کو کھیتوں سے بے دخل کر دیا اور وہ چنگھاڑ گیا۔ "سرکار میرے بچے بھوکے مر جائیں گے۔ سرکار میری بیلوں کی جوڑی کھل جائے گی۔ سرکار مجھے بے دخل نہ کیجئے —— سرکار میں بنیئے کا مقروض ہوں ——"

مگر جوان فصل کھڑی تھی اور زمیندار کے آدمی اُس کے کھیت میں گھسے ہوئے تھے، دھان کٹ رہے تھے اور زمیندار کی گاڑیوں میں لد رہے تھے اور عیدو کا چہرہ لٹک گیا تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے سچ مچ یہ سب گھاس ہے جو وہاں کھڑی ہوئی تھی۔ گھاس ہی گھاس ——

اس نے سر کو ایک بار جھٹکا دیا اور وہیں للکار کر بولا۔

"خبردار جو میرے دھان کو ہاتھ لگایا۔ جان سے مار دونگا۔"

اور پیچھے مڑ کر اُس نے دیکھا تو خان بہادر کی آواز گونج رہی تھی۔

"پروا مت کرو، میں ٹھیک کئے دیتا ہوں —— تم اپنا کام کئے جاؤ ——"

—— اور عیدو نے اپنے جسم کی رگوں میں تناؤ سا محسوس کیا۔ اس کے جسم میں گرم گرم خون دوڑنے لگا اور پھر جیسے وہ رگیں یک بیک ڈھیلی پڑ گئیں۔ جیسے اس کے گرم خون میں کسی نے برف گھول دیا۔ سارا جسم منجمد ہو گیا۔ جیسے کسی نے اُس میں سے زندگی چھین لی ہو۔ —— اور زمینداروں کے غنڈوں نے اس کو زمین پہ گرا دیا ——

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کی بیوی رو رہی تھی اس کی لڑکیاں

چیخ رہی تھیں اور اس نے سنا کہ اس کے کھیتوں میں خالی ڈنٹھل کھڑے تھے اور قصبے سے کھ بنئے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"عیدو نکالو میرے ایک ہزار ——— دوسروں کے کھیتوں کے بل بوتے پر قرض لیتے پھرتے ہو بے ایمان کہیں کے۔"

اور عیدو کے چہرے پر آنسو بھی نہ آسکے وہ خلا میں دیکھتا رہ گیا اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ زمین اس کے ہاتھوں سے پرندے کی طرح پھر سے اڑ گئی اور وہ بنئے کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس کے جسم کی چوٹیں زمیندار کے غنڈوں کی لاٹھیاں ——— یہ سب جذب ہو چکی تھیں، بس اس کے جسم کی ہڈیوں میں وہ کسک باقی تھی وہی کسک ———

"ایک ہزار نہیں ——— میں پہلے جانتا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی دھوکا ہے ——— دیکھا کھولو اپنی جوڑی ——— اور خالی کرو یہ گھر۔"

——— اور عیدو کے جسم کے تمام تار جھنجھنا اٹھے۔ اس کا آخری سہارا اس سے چھن رہا تھا اور پھر ———

عیدو کا گھر بار نیلام ہو گیا۔ بیلوں کی جوڑی بنئے کے یہاں پہنچ گئی اور وہ بے دست و پا ہو گیا ——— مگر خان بہادر رمضان خاں نے اس پر رحم کرتے ہوئے اس کو اپنی بٹائی پر رکھ لیا اور کاشت کار عیدو کھیت مزدور ہو گیا۔

اور اس طرح سارا گاؤں عیدو بن گیا، ہر کاشت کار عیدو بن گیا، رامو بخش، کالو میاں، شبراتی، شریف، اور شیام لال سبھی عیدو بن گئے ——— اور اس طرح کھلم کھلا رنگ پور میں دو صفیں بن گئی تھیں۔ ایک وہ صف جس میں ہتھیار بند سپاہی، زمینداروں کے غنڈے اور کھدر پوش لیڈر ——— جن کی فوری ضرورت کے تحت حکومت نے بھرتی کی تھی اور ان سب کے سرخ و روال وہ زمیندار تھے جن کی رنگ پور کے علاقہ میں زمینیں تھیں اور یہ صف خان بہادر رمضان خاں کے اشارے پر آگے بڑھ رہی تھی ——— اور اس صف کے بائیں جانب ایک اور صف تھی جس میں ایک ہی طبقہ کے انسان تھے سب مزدور اور کسان تھے۔ وہ جن کے کس بل پر غرور شہریار اس وقت بھی اکڑ رہا تھا اور جن کے کھیتوں کا رس ان کے چہروں پر چمک رہا تھا ——— اور رنگ پور کے علاقے میں دھوم مچی ہوئی تھی، سرکار کہہ رہی تھی کہ رنگ پور میں بغاوت ہو رہی ہے اور حکومت نے اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے فوجیں بھیجی تھیں، جو ان صفوں کو منتشر کرنا چاہتے تھے، جن میں عیدو اور رامو تھے۔

اور عیدو چیخ رہا تھا:۔

"جاؤ آج رنگ پور کے بیٹوں کو ان کی ماؤں کا پیا ہوا دودھ حرام ہے اگر اس دھرتی کو نہ چھین سکے جس نے ماں بن کر ہماری پرورش کی ہے۔ تم بتاؤ کہ اب کونسا راستہ ہے۔ ان زمینداروں، غنڈوں اور ان کی سرکار کے آگے سر جھکاؤ گے یا اس دھرتی پر اپنا خون نچھاور کر دو گے؟"

اور رنگ پور کی دھرتی پر خون اُبلنے لگا، بالکل ماں کی چھاتی کے دودھ کی طرح ——— تڑ تڑ گولیاں چلنے لگیں، فضا میں گولیوں اور لاٹھیوں کی آواز گونجنے لگی ——— اور فضا ہی میں نہیں بلکہ وہ گولیاں کھیتوں میں بھی گرنے لگیں ———

رانی کی ماں یونہی چیختی رہ گئی

"یہ ہمارے کھیت ہیں ان پر ملامت کرو، یہ ہماری ہی دھرتی نہیں تمہاری بھی ہے ——— یہ مٹی دھان اگاتی ہے۔ گیہوں اور باجرہ اس کی کوکھ سے پیدا ہوتا ہے اس کو مت مارو ——— اس پہ گولیاں مت چلاؤ۔ اس خالی کوکھ میں بارود مت بھرو ——— مگر وہ چیختی رہی اور گولیاں چلتی رہیں۔ اور لاٹھیاں برستی رہیں ——— اور فضا میں خون کے سرخ سرخ فوارے چھوٹتے رہے۔

عیدو گرفتار کر لیا گیا مگر اس کی فوج دھان اور گیہوں کی کونپلوں کی طرح بڑھتی چلی گئی اور اس وقت جبکہ سرکاری اعلان ریڈیو پر خالی بادل کی طرح گرج رہا ہے ——— رنگ پور کی دھرتی لہو لہان ہو گئی ہے، رنگ پور کے مرد اور عورتوں کے جسم گولیوں سے چھلنی ہو گئے ہیں۔ اور اب میں سوچ رہی ہوں کہ اس لہو لہان دھرتی اور رنگ پور کے مرد اور عورتوں کے خون سے جو پرچم بنے گا وہ کس رنگ کا ہوگا۔ اور ریڈیو کی آواز فضا کے خلا میں اڑتی چلی جا رہی ہے۔

"اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے حکومت کو گولی چلانی پڑی اور حکومت اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ مشہور کمیونسٹ باغی عیدو خاں گرفتار کر لیا گیا ہے اور اب رنگ پور میں مکمل امن و امان ہے ———"

جی ہاں مکمل امن و امان ہے لیکن سرخ آندھی ———

———

دیویندر اسّر

غیر امریکی

چوپاٹی کی نم آلود ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر ننگے پاؤں ٹہلتے ٹہلتے پاؤں میں ایک عجیب کیف آگیں ٹھنڈک سی محسوس ہونے لگی۔ دن بھر پیدل گھومتے رہنے کے باعث گھٹنوں میں جو تھکن پیدا ہو گئی تھی، اب آہستہ آہستہ دور ہو رہی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا نتھو چاٹ والے کی دکان کی طرف بڑھا۔ اس کی دکان کے سامنے تختے کے نیچے میں نے اپنے فلیکس کے پرانے جوتے چھپا رکھے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ جلدی جلدی جوتے پہن لوں تاکہ یہ راحت رساں ٹھنڈک بمبئی کی تپتی ہوئی سڑکوں پر دوبارہ گھومنے سے بھاگ نہ جائے۔ چاٹ والے نے مجھے اپنی طرف یوں تیزی سے بڑھتے دیکھ کر ایک دم میرے ہاتھ میں دونا پتہ تھما دیا۔ اسکے بعد زبان کے چٹخارے کیلئے میں نے دہی بڑے بھی کھائے۔ دو پیسے کا پانی پی کر اور آٹھ آنے کی چپت کھا کر میں جوتے پہن کر آگے بڑھ گیا۔ راستے میں ایک اخبار والے سے پتہ چلا کہ آج رات کو بمبئی کے میئر انگلستان اور امریکہ کا دورہ کر کے واپس آنے والے ہیں۔ چھوٹے بڑے مقامی لیڈر اُن کا استقبال کرنے کیلئے سانتا کروز کے ہوائی اڈے پر گئے ہیں۔ جبھی چوپاٹی کچھ ویران ویران سی دکھائی دیتی تھی۔ اور سمندر کی لہروں کا شور کچھ زیادہ سنائی دیتا تھا۔ میں بھی لوکل ٹرین پر بیٹھ کر سانتا کروز پہنچ گیا۔ تاکہ اس امریکی آئے کو دیکھ سکوں جس سے بمبئی کو غلاظت، گندگی اور تعفن سے پاک کیا جا سکیگا۔ بمبئی کے میئر کی روانگی کے دوسرے دن ہی بمبئی کے مہتروں نے ہڑتال کر رکھی تھی اور سارا شہر گندگی کے اونچے اونچے ڈھیروں سے بھر گیا تھا

سانتا کروز کے ہوائی اڈے پر چمکدار کاروں، بے ڈول جیپوں اور لاریوں کا ہجوم تھا۔ انگریزی اور دیسی لباس ایک دوسرے میں غلط ملط ہو کر ادھر ادھر حرکت کر رہے تھے۔ بادل گرج رہے تھے اور ہر لحظہ گہرے اور کالے ہوتے جا رہے تھے۔ بارش کے آثار نظر آ رہے تھے۔ چند پادری زیر لب جہاز کی سلامتی کے لئے ہاتھ اٹھائے دعائیں مانگ رہے تھے۔ ایک کھدر پوش اپنی مونچھوں کو اوپر نیچے دائیں بائیں شمال جنوب۔ مشرق مغرب غرضیکہ ہر ممکن طریقے سے گھما رہے تھے اور اس طرح اپنی بے تابی کا اظہار کر رہے تھے۔ کیونکہ ہوائی جہاز کے آنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ کھڑے کھڑے میرے گھٹنوں میں پھر تھکاوٹ ہونے لگی اور پاؤں پھر اسی طرح جلنے لگے۔ دماغ بھی پریشان ہو رہا تھا کیونکہ یہاں سمندر کا نظارہ بھی نہ تھا۔ چند مضحکہ خیز شکلیں آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ رات کے ڈیڑھ بجے ٹی۔ ڈبلیو۔ اے کا طیارہ زمین پر اترا اور سب کے چہروں پر خوشی اور شکر کے جذبات نمایاں ہونے لگے۔ کاروں اور جیپوں والوں کا سیلاب اُمڈ کر آگے بڑھ گیا۔ تاکہ امریکی سوغات کو سب سے پہلے وصول کر سکیں۔ میئر صاحب کا گلا پھولوں اور موتیوں کے ہاروں سے بھر گیا۔ پادریوں نے یسوع مسیح کا ہزار ہزار شکریہ ادا کیا۔ مگر میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا اور تماشا دیکھتا رہا۔ پریس رپورٹروں کے قلم اور کیمرے چل رہے تھے۔ اور امریکہ کی تعریف میں قصیدے لکھے جا رہے تھے۔ لیکن میں دور کھڑا رہا۔ اور آخر اس بے کاری سے اکتا کر واپس چلا آیا۔ کیونکہ وہ امریکہ سے کوئی [illegible] نہیں لائے تھے۔ بلکہ زبان کا جادو اور مسحور کن لفظوں کے تانے بانے کافی سیکھ کے آئے تھے۔ امریکی طرز زندگی اُن کے چہرے پر اپنا پورا جلال دکھا رہی تھی۔

گھر پہنچ کر محسوس ہوا کہ تھکان صرف گھٹنوں تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ جسم کے عضو عضو میں سرایت کر چکی تھی۔ میں بستر پر دراز ہوتے ہی سو گئی اور خواب میں ہالی وڈ کی رنگین اور مان پرور دنیا اور کیلیفورنیا کی سونے کی کانوں میں گھومتا رہا۔ صبح دس بجے کے قریب آنکھ کھلی۔ آنکھ کھلتے ہی شانتا نے ایک چھوٹا سا کاغذ کا پرزہ ہاتھ میں دے دیا۔ جلدی جلدی اُسے کھولا۔ یہ پرزہ میرے امریکی دوست فلپ نے بھیجا تھا چند الفاظ بڑی جلدی میں گھسیٹے ہوئے تھے —— "میں آج شام کو امریکہ واپس جا رہا ہوں، میرا وطن مجھے پکار رہا ہے۔" نیچے فلپ کے جانے پہچانے دستخط تھے۔ نیند سے آنکھیں کیا کھلی یہ چند بے ہنگم سے الفاظ پڑھ کر کھلی کی کھلی رہ گئی۔ فلپ اتنا عجلت پسند انسان نہیں ہے۔ وہ بڑے تحمل اور غور و فکر کے بعد قدم اٹھاتا ہے۔ کل دن کو وہ مجھے فیمس سائن لیبارٹری کے سامنے ملا تھا۔ وہ بالکل ہشاش بشاش تھا۔ اُس نے مجھے کہا۔ اب وہ کوشش کر رہا ہے کہ چند سوویٹ فلموں کی "ڈسٹری بیوشن" کا کام شروع کر دے اور پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ لیکن تمہاری آزاد حکومت اسے چلنے بھی دیگی؟ شرارت آمیز مسکراہٹ اُسکے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ وہ مجھے فیمس بلڈنگ کے ریستوران میں لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے کام پر چلا گیا اور میں چوپاٹی کی طرف پیدل چل پڑا۔ فلپ کا یکایک یہ فیصلہ کر لینا تعجب خیز امر تھا۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ بمبئی کے میئر نے اُسے امریکہ کے بارے میں کوئی خفیہ اطلاعات بہم پہنچائی ہوں۔ جن کی بنا پر وہ ہندوستان چھوڑ کر واپس وطن جا رہا ہے۔ شاید تیسری جنگ چھڑ گئی ہو اور وہ پھر فوج میں بھرتی ہونا چاہتا ہو۔ لیکن یہ بھی ممکن نہ تھا۔ کیونکہ وہ جنگ کا نام سنتے ہی ناک سکیڑ لیتا تھا۔ جیسے کوئی زہر سانس کے ساتھ جسم میں داخل ہو رہا ہو۔ وہ اکثر میرے کٹے ہوئے بازو کو پیار سے سہلاتے ہوئے کہا کرتا ہے۔ "ڈیر چوکس رہنا —— تمہارے بچے کی ایسی حالت نہ ہونے پائے،" اگرچہ پھر بھی وہ امریکی ہے۔ وطن کا پیار کسے نہیں ہوتا چاہیئے اُس کا وطن جنگ کی طرف ہی کیوں نہ بڑھ رہا ہو۔ ان امریکیوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ان کے ضمیر کی ڈوری تو ڈالر سے بندھی ہوئی ہے۔ بڑھ بڑھ کر امن اور جمہوریت کی ڈینگیں ماریں گے اور جب ڈالر ذرا خطرے میں نظر آئیگا تو بندوق اٹھائے امن اور جمہوریت کو اپنے آہنی پاؤں تلے روندتے چلے جائیں گے۔

میں نے شانتا سے پوچھا کہ فلپ نے اور کچھ نہیں بتایا۔ اُس نے جواب دیا کہ وہ بہت جلدی میں تھا۔ یہ رقعہ بھی ڈرائیور لیکر آیا تھا۔

"کیا تم نے کل ریڈیو سنا تھا کوئی ایسی خبر تو نہ تھی۔ جس سے یہ شبہ ہو کہ جنگ جلد ہونے والی ہے" میں نے اپنے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"جنگ۔ جنگ۔۔۔۔" اُس نے جھنجلا کر کہا "جب فوجی امداد کے معاہدے کرو گے۔ اور اپنے قرضے کو بچانے کیلئے اسلحہ اور گولہ بارود بیچو گے تو جنگ نہیں تو کیا امن ہوگا،" شانتا پہلے ہی سے جلی بھنی بیٹھی تھی۔ "ایسی خبریں تو دن میں بیسیوں بار سننے میں آتی ہیں کہ اب جنگ ہوئی کہ ہوئی۔" اُس نے میرے کٹے ہوئے بازو کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ میں نے بازو کو چادر سے ڈھانک لیا "معلوم نہیں —— ان سیاستدانوں کی کھوپڑی کو کیا ہو گیا ہے" وہ ننھے کو گود میں اٹھاتے ہوئے اور جنگ جنگ چلانے والوں کو مرثیے میں گالیاں دیتی ہوئی بالکونی میں جا کھڑی ہوئی۔ وہ ننھے کو سڑکوں پر دوڑتی ہوئی ٹرامیں۔ لیمپوں اور کاروں کا تماشہ دکھانے لگی۔ ننھا اس کی گود میں کلکاریاں کرتا ہوا ہمک ہمک کر ہوا میں پرواز کرنے کی بے سود کوشش کر رہا تھا۔ میں ننھے کو خوشی سے اچھلتا دیکھ کر اپنے کٹے ہوئے بازو پر آستین چڑھاتے ہوئے باتھ روم میں چلا گیا۔

شانتا کے جواب سے نا امید ہو گیا تھا۔ اس لئے جلد جلد منہ ہاتھ دھو کر کپڑے پہن کر نیچے اتر آیا۔ زیادہ دیر تک بس یا ٹرام کا انتظار نہ کر سکا اور ٹیکسی پر سوار ہو کر فلپ سے ملنے روانہ ہو گیا۔

فلپ کے روانہ ہونے میں چند گھنٹے ابھی باقی تھے۔ پھر وہ امریکہ چلا جائیگا۔ میرے دماغ میں عجیب کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ لیکن مجھے بلانے کی یہ چال ہی نہ ہو —— شاید اُسکے لڑکے کو قید کی سزا ہو گئی ہوگی کیونکہ UN-AMERICAN COMMITTEE کی جانب سے اُس پر غیر امریکی ہونے کا مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ فلپ کا لڑکا ہالی وڈ کا مشہور فنکار ہے۔ اس نے کئی فلموں میں ہیرو کا پارٹ ادا کیا ہے

ابھی اُس کی عمر ہی کیا ہے۔ وان بڑا خوبرو اور بانکا جوان ہے۔ اس کے چہرے سے ذہانت ٹپکتی ہے۔ فلموں میں جب اُس کا کلوزاپ آتا ہے تو تماشبین ایک لمحہ کے لئے سانس روک لیتے ہیں۔ جذبات کی عکاسی میں تو اُسے خاص مہارت حاصل ہے۔ معلوم نہیں اُسکے چہرے میں کیا جاذبیت اور دلکشی تھی کہ اُس کی فلمیں بہت جلد مقبول ہو گئی تھیں۔ فلپ نے مجھے وان کی ایک تصویر دکھائی تھی۔ جس میں وہ ہالی وڈ کے دوسرے اداکاروں کے ساتھ جہاز سے اتر رہا تھا اور عدالت میں جا رہا تھا۔ جہاں ان سب پر غیر امریکی ہونے کا مقدمہ چلایا جانے والا تھا۔ سب مسکرا رہے تھے جیسے آزادی اور جمہوریت کا مُنہ چڑا رہے ہوں۔ وان اپنے دونوں بازو اپنے دوستوں کے کندھوں پر پھیلائے قہقہہ لگا رہا تھا۔ اُس وقت وہ کتنا حسین اور باوقار معلوم ہوتا تھا۔ فلپ نے بڑے فخر سے کہا تھا۔ کہ میں پچھلی جنگ میں اپنے ملک کی طرف سے بغیر کسی مقصد کے لڑا تھا۔ لیکن وان میرا لڑکا آج ایک عظیم مقصد کیلئے دنیا کے تمام امن پسندوں کی طرف سے لڑ رہا ہے۔ وہ بہت ہونہار ہے۔ وان بڑا پیارا ہے۔ جب فلپ کو اپنے لڑکے کے قول و فعل پر اتنا گہرا اعتماد اور فخر ہے تو یقیناً اس کی قید پر اُسے رنج نہیں ہوگا۔ پھر معلوم نہیں وہ امریکہ کیوں جا رہا ہے۔ شاید پدرانہ شفقت بیدار ہو کر اُس کے اصولوں پر غالب آگئی ہو۔ ان امریکیوں کا کچھ پتہ نہیں۔ موقع آنے پر سب اصول اور آدرش اُن کے لاشعور میں جا گھستے ہیں۔ آخر فلپ کو بھی وان کا باپ ہونے کی حیثیت سے امریکی حکومت سے خطرہ ہے۔ ممکن ہے وہ اپنے بیٹے کی طرف سے معافی نامہ داخل کرانا چاہتا ہے یا اُس سے اپنا قانونی قطع تعلق کر کے اپنے آپ کو حکومت کے عتاب سے بچانا چاہتا ہو۔ میرا ذہن پھر الجھ ہو گیا۔

میں فلپ کو اسلئے نہیں جانتا کہ ہم ہندوستانی احساسِ کمتری کے باعث سفید قوم کے فرد سے دوستی رکھنا فخر محسوس کرتے ہیں اور نہ ہی اس لئے کہ وہ ڈالر کے دیش کا باشندہ ہے اور میں بھی بعض سیاسی مدبرین کی مانند اس سے ڈالر کی مدد چاہتا تھا۔ فلپ سے میری دوستی اس لئے بھی نہیں تھی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ مفت فلمیں دکھایا کرتا تھا یا کسی بال روم میں ساتھ لے جاتا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ پچھلی جنگ میں وہ میری جان بچانے کا باعث بنا تھا۔ ہماری ملاقات عجیب ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ اٹلی میں ہم امریکی سپاہیوں کے دوش بدوش ایک ہی مورچے پر لڑ رہے تھے۔ ایک جگہ خندق پار کرتے ہوئے میرے بازو میں گولی لگ گئی تھی۔ میں چکرا کر زمین پر گر پڑا تھا۔ میں تھوڑی دیر تک کراہتا رہا۔ پیاس کی شدت سے حلق خشک ہو رہا تھا۔ لیکن ارد گرد اتحادیوں کا کوئی سپاہی نہ تھا۔ جو مدد کو پہنچ سکتا۔ میں نے زمین کریدنی شروع کر دی تاکہ پانی مل سکے۔ مگر تھوڑی دیر ہی میں تھک ہار کر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ حلق میں سوئیاں چبھ رہی تھیں اور بازو میں درد ہو رہا تھا۔ اتنے میں فلپ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر بھٹکتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اُسکے بال بُری طرح اُلجھے ہوئے تھے۔ اور پاؤں میں لغزش تھی۔ غالباً وہ بہت دیر سے اسی طرح بھٹک رہا تھا۔ مجھے کراہتا ہوا دیکھ کر وہ میرے نزدیک آگیا۔ اُس نے اپنی پانی کی بچی ہوئی بوتل میرے منہ میں انڈیل دی اور اپنے فوری امداد کے سامان سے میرے بازو پر پٹی باندھ دی۔ لیکن درد کی شدت کم نہ ہوئی۔ خون بہنا بند ہو گیا تھا۔ گولی بازو میں دھنس گئی تھی۔ اور وہ فلپ سے نہ نکل سکی۔ تھوڑی دور ہی ایک مکان سے کسی بچے کے چلانے کی آواز آنے لگی۔ فلپ مجھے چھوڑ کر اس مکان میں گھس گیا۔ مکان سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ لیکن وہ چھت پر چلا گیا۔ اور بچے کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر میرے نزدیک لے آیا۔ بچہ آگ میں بُری طرح جھلس گیا تھا۔ اُس کی شکل تک بھی نہ پہچانی جاتی تھی۔ شاید وہ کافی حسین ہوگا۔ ہر بچہ خوبصورت ہوتا ہے۔ بچے کا چہرہ اب انتہائی ڈراؤنا ہو گیا تھا۔ وہ درد کی شدت سے بلبلا رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔

اُس کے سارے جسم پر پھپھولے اُبھر آئے تھے۔ میں جنگ میں دشمن کے روبرو گولی چلا سکتا تھا۔ لیکن یہ جھلسا ہوا بچہ نہ دیکھ سکتا تھا میں نے آہ بھرتے ہوئے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ یک لخت میرے کانوں میں ایک زور کی چیخ سنائی دی۔ میں نے مُڑ کر دیکھا۔ فلپ کی سنگین بچے کی چھاتی میں گڑی ہوئی تھی۔ وحشی درندہ۔ معصوم بے گناہ بچوں تک کو بھی قتل کرنے سے نہ چُوکا۔ میرے دل میں نفرت کا دریا اُمڈ آیا۔ اس کا دیا ہوا پانی زہر بن کر میری رگوں میں دوڑنے لگا۔ جی میں آئی کہ پاس پڑا ہوا پتھر اُسکے منہ پر دے ماروں۔ لیکن میں بے بس تھا۔ ایک مجھے کے

توقف کے بعد فلپ نے اپنی سنگین اُس کی چھاتی سے نکال کر اور اُسی سے زمین کھودنے لگا۔ رذیل اب اُسے دفن کرنا چاہتا تھا۔ بچہ دم توڑ چکا تھا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا — "تم جمہوریت کے پاسبان ہو۔ کمینے ...... " وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس نے بچے کو آہستہ سے اٹھایا اور اس کی جھلسی ہوئی پیشانی کو چوم لیا۔ بچے کی لاش کو قبر میں نہایت نرمی سے رکھ کر قبر کو ریت سے ڈھانپ دیا اور چند قدموں پر پڑے ہوئے روندے ہوئے جنگلی پھول اس کی قبر پر رکھ دیئے۔ جب وہ بچے کو ہمیشہ کے لئے قبر میں سُلا رہا تھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر بچے کے جلے ہوئے چہرے پر گر رہے تھے۔ شاید اُسے اپنا بچہ یاد آ گیا تھا۔ یا اُس بچے کی موت میں وہ اپنے بچے کی موت دیکھ رہا تھا۔ آخر وہ بھی انسان تھا۔ وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اور اپنا سر دونوں بازوؤں پر رکھ کر کسی گہری سوچ میں کھو گیا

"تم دشمن کے جلتے ہوئے بچے کو بھی زندہ نہیں دیکھ سکے۔ میں نے حقارت سے اُس کی طرف دیکھا۔ میں بھول گیا تھا کہ ابھی ابھی اس نے میرے بازو پر بڑی محبت سے پٹی باندھی تھی۔ اسکے باوجود کہ میں ایک ایشیائی تھا۔

"ہاں۔ میں اسے زندہ نہیں دیکھ سکتا تھا ...... " وہ قدرے توقف کے بعد بولا "وہ بچ نہیں سکتا تھا ...... میں اُسے درد سے بلبلاتا ہوا اور تڑپ کر مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا ...... وحشی بچوں پر بھی ہاتھ اٹھانے سے باز نہ رہ سکے" فلپ نے جذباتی لہجے میں اپنے امریکی سپاہیوں کو درندے کا خطاب دیتے ہوئے کہا۔

"تم اپنے ساتھیوں کو بدنام کر رہے ہو۔ یہ فوجی جرم ہے" مجھے بڑا تعجب ہوا۔ اُسی وقت وہ مجھے کچھ غیر امریکی سا دکھائی دینے لگا تھا۔

"آخر فاشسٹوں اور ہم میں کیا فرق ہے" اُس نے زبان سے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ غالباً اس طرح سے اُسے فاشسٹوں کے خلاف اپنے غصے کا اظہار کرنا مقصود تھا۔ گولیاں تڑاتڑ چل رہی تھیں۔ بم کے دھماکوں سے زمین آسمان گونج رہے تھے۔ فضا میں زخمیوں کی آہ و فغاں دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔ زمین خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ بمبار طیاروں کی گرج سے کان بہرے ہو رہے تھے۔ چاروں طرف دھواں اور آگ پھیل رہی تھی۔ ہوا میں عجیب سڑاندسی گھل گئی تھی۔ اس شور سے گھبرا کر زخموں سے نڈھال فلپ بے ہوش ہو گیا۔ وہ بہت تھکا ہوا اور زخمی تھا۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ اسکے بعد مجھے فلپ کی کوئی خبر نہ ملی۔ جب میں ہسپتال سے رخصت ہوا تو میرا ایک بازو نہیں تھا جنگ کے ختم ہونے کے بعد میں واپس اپنے وطن آ گیا۔ اور بے کاری کے دن گزارنے لگا۔ تھوڑی سی سرکاری پنشن کا ہی آسرا رہ گیا تھا۔ فلپ مر گیا یا وطن چلا گیا مجھے کچھ پتہ نہ مل سکا۔

ایک روز "موسیو ورڈو" دیکھ رہا تھا۔ میرے ساتھ والی سیٹ پر کوئی شخص بار بار بے تحاشا تالیاں پیٹ رہا تھا۔ انٹرول میں جب ہال کی بتیاں روشن ہوئیں تو دیکھا وہ کوئی لمبا تڑنگا مگر معمر سا امریکی تھا۔ اور گرد اور بھی بہت سے امریکی سپاہی اور امریکی نرسوں کے اکیٹ فلم دیکھ رہے تھے اُن میں بہت سے ندامت سے جھکے ہوئے تھے۔ شاید وہ اپنے ناکردہ گناہوں پر پشیمان تھے۔ لیکن جن میں اُن کا حصہ ضرور تھا۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو خاموش تماشائی سمجھتے ہیں۔ ہمارے پیچھے والی قطار میں ایک امریکی جوڑا بیٹھا ہوا آپس میں سرگوشیاں کر رہا تھا" اس میں تو اکسائٹمنٹ بالکل نہیں ...... " نوجوان امریکی عورت نے منہ بناتے ہوئے کہا "آدھی فلم گزر گئی اور ایک بوسہ تک بھی نہیں ...... " عورت نے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سُرخی درست کرتے ہوئے کہا۔ امریکی جوڑا اس فلم سے بہت دل برداشتہ نظر آتا تھا

ایسی فلموں کو تو فوراً بین (Ban) کر دینا چاہیئے" عورت نے دستی آئینے میں اپنے ہونٹ کا بغور معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ شاید وہ اپنے دل میں کسی ایکٹریس سے بیوٹی پریڈ میں مقابلہ کر رہی تھی۔

"امریکہ میں تو ہو گئی ہے" مرد نے عورت کی خفگی دور کرتے ہوئے کہا "لیکن ہندوستان میں ...... میں کل ہی امریکی سفارت خانے کو خط لکھوں گا ڈارلنگ —— آؤ ایک پیگ وسکی پی لیں شاید کچھ ...... " اور وہ دونوں ہال سے باہر نکل گئے۔ میں چاہتا ہوں کہ

نہیں یہ خوشخبری سُنا دوں کہ چارلی چپلن پر غیر امریکی ہونے کا مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ شاید اُن کے لئے کچھ اکسائٹمنٹ پیدا ہو جائے۔ اور وہ انٹرول کے بعد ایک کے بجائے تین چار بوسے لے سکیں۔ لیکن وہ باہر جا چکے تھے۔

میرے ساتھ والا امریکی اُن کی گفتگو پر مسکرا رہا تھا۔ اس مسکراہٹ میں قدرے حقارت اور طنز کا امتزاج تھا۔ شاید وہ کہہ رہا تھا "تم ابھی نوجوان ہو۔ تمہارا کوئی بچہ نہیں ہے . . . اور تم نے جنگ دیکھی بھی کہاں ہے۔" اُس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا وہ کوئی غیر امریکی سا معلوم ہوتا تھا شاید امریکہ میں دو امریکہ ہوتے ہوں۔ ورنہ ایک ہی ملک کے دو باشندے ایک ہی فلم پر رنج و راحت کے متضاد جذبات کا اظہار کیسے کر سکتے ہیں ویسے ہر ملک میں دو ملک ہوتے ہیں میں اس گو مگو کی حالت میں تھا کہ اُس نے وسکی کا گلاس مجھے پیش کیا۔ میں ہچکچا رہ گیا۔ کیا امریکے مجھ سے نفرت کرتے نہیں۔ ممکن ہے وہ امریکی نہ ہو۔ ورنہ یہ کیسے مجھے وسکی پیش کر سکتا ہے۔ امریکہ میں تو حبشیوں کو سفید بستیوں میں داخل تک نہیں ہونے دیا جاتا۔ میں حیرت اور استعجاب سے اُسکے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے میری ذہنی الجھن کا اندازہ لگا لیا تھا" مجھے پال رابسن کے نغمے بہت پسند ہیں" اُس نے اپنی بھوری بھوری مونچھوں میں مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنے آپ کو جم کرو کا دشمن ہی نہیں۔ بلکہ غیر امریکی بھی ثابت کر دیا اور میرا شبہ دور ہو گیا۔

"یہ حادثہ کیسے پیش آیا" اس نے میرے کٹے ہوئے بازو کو دیکھ کر پوچھا۔

"پچھلی جنگ میں اٹلی کے محاذ پر گولی لگ گئی تھی اور ایک امریکی سپاہی فلپ . . . . ."

میں فقرہ بھی پورا کرنے نہ پایا تھا کہ یک لخت وہ سیٹ سے اچھل پڑا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ یہ فلپ ہی تھا۔ فلپ سے مل کر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی اور وہ تمام مناظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ جنہوں نے مجھے اور فلپ کو ایک مشترکہ انسانی رشتے میں منسلک کر دیا تھا۔ فلپ سے ملاقاتوں کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ امریکہ میں امریکیوں سے زیادہ غیر امریکی بستے ہیں اور یہ جو ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں امریکی نظر آتے ہیں۔ دراصل ہاتھ میں ڈالر کی تھیلی لئے ہوئے۔ منہ میں مارشل امداد کے تقدس کا ورد کرتے ہوئے اور بغل میں ایٹم بم دبائے ہوئے ہیں۔ میں اور فلپ اُس روز رات کے اندھیرے پہر تک بمبئی کی سڑکوں پر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھومتے رہے اور مذاق کرتے رہے۔ ہم نے ایک ہوٹل میں اکٹھے کھانا کھایا۔ اُس نے ہوٹل کا بل ادا کرنا چاہا۔ میں نے کہا۔ "مارشل امداد دے رہا ہے" اور وہ جھینپ گیا۔ میں نے پیسے دیئے اور ہم باہر نکل آئے۔ ہوٹل کا امریکی آرکسٹرا بدستور فضاؤں میں ارتعاش پیدا کرتا ہوا پُراسرار روشنی کے ساتھ چھن چھن کر سڑکوں پر پھیل رہا تھا۔ ہم اس وقت ننگی ننگی ٹانگوں کے نخرے کرنے اور جوان جسموں کے بل کھانے اور شراب کی بو میں لپٹے ہوئے طویل بوسوں کی لذت سے لطف اندوز ہونے کے بجائے باتیں کرنا چاہتے تھے۔ جو مدتوں سے ہمارے دلوں میں دبی دبی چنگاریوں کی مانند روشن تھیں۔ لیکن کسی غمگسار کے نہ ملنے کے باعث اُن پر راکھ کی تہیں جم رہی تھیں۔ ہم نے ہر موضوع پر بات چیت کی۔ امریکہ۔ روس۔ چین۔ ہندوستان۔ جنوب مشرقی ایشیا کمیونزم، فاشزم۔ بے کاری ہالی وڈ کی فلمیں۔ امن کانگرس اور تیسری جنگ معلوم نہیں کن کن موضوعات پر ہم نے تبادلہ خیال کیا۔ لیکن ہر بار بات جنگ اور امن پر آکر رُک جاتی تھی۔

اس واقعے کے بعد میری اور فلپ کی شامیں اکثر اکٹھی گزرا کرتی تھیں اور میں اُسی روز چوپاٹی کی سیر کرنے جاتا تھا۔ جب فلپ کسی ضروری کام کی وجہ سے میرے ساتھ شام نہ گزار سکتا تھا۔

ٹیکسی وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کی بلڈنگ کے سامنے آکر رُک گئی۔ میں لپک کر دوسری منزل میں چلا گیا۔ فلپ انڈرویئر پہنے سامان وغیرہ باندھنے میں مشغول تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے عجیب شکل بنائی۔ جیسے کہہ رہا ہو "دوست۔ ہم تو نو دو گیارہ ہوئے۔ اب تم جانو اور تمہارا ملک . . . . . . "

میں نے پہنچتے ہی مذاق کیا "ارے یار تم جا رہے ہو۔ جبکہ ہمارے مدبرین تو انہیں اپنے ملک میں بلانے کے لئے سو سو جتن کر رہے ہیں" اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "لیکن اب امریکن آئیں گے۔ میں تو خیر امریکی ہوں" اس پر اُس نے زور کا قہقہہ لگایا اور مجھے ساتھ گھسیٹ کر سامان بندھوانے لگا۔

"تم سب کام کر رہے ہو۔ دوستوں کو خبر کر دی ہوتی" میں نے اُس کی عجلت پر شکایت کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر میں امریکہ کی بجائے تمہاری حکومت کا مہمان ہو جاتا اور پھر امریکہ جا کر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" وہ مجھ سے کچھ چھپانا چاہتا تھا۔ وہ جب بھی باتیں کرتا تھا تو بڑا محتاط رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ اشاروں میں باتیں کرنے کا عادی تھا۔

"آخر تم اتنی جلدی کیوں جا رہے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ کیا سیٹ بک ہو گئی ہے" میں نے اپنی حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

اُس نے میز کی طرف اشارہ کر دیا۔ میز پر اُس کا ٹکٹ پڑا ہوا تھا اور اُس کے نیچے ایک سادہ لفافے میں فلپ کے کسی عزیز کا خط تھا اُس نے لکھا تھا کہ تمہاری بیوی کا دماغ چل گیا ہے۔ وہ رات کو سوتے سوتے چلا اٹھتی ہے۔ فلپ فلپ۔ ڈارلنگ۔ جنگ پر نہ جاؤ۔ ایٹم بم ایٹم بم۔ میری لوریٹا کو بچا لو۔ سب ڈالر لے لو۔ مگر لوریٹا کو بچا لو بعد از تحریر کے نیچے لکھا ہوا تھا کہ آج ان کے مقدمے کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ اوما کو ایک سال کی سزا ہو گئی ہے۔ اُس کے دوسرے چار ساتھیوں کو کمپنیوں سے نکال دیا گیا ہے میری جس نے تمہارے لڑکے کے ساتھ ہیروئن کا پارٹ بھی ادا کیا ہے۔ اس بنا پر مجرم قرار دی گئی ہے کہ اُس نے چرچل کی امریکہ میں اشتعال انگیز تقریروں کے ذریعے جنگ بھڑکانے کی کوششوں سے تنگ آ کر "چرچل واپس جاؤ" اور "ہم امن چاہتے ہیں" کے نعرے لگائے تھے۔ ہاں اُس نے نیویارک امن کانفرنس کے ٹکٹ بھی بیچے تھے۔" ظاہر ہے اس خط میں بہت سے فقروں پر سیاہی پھری ہوئی تھی۔ لیکن فلپ کی مدد سے میں پورا خط پڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔

میری سمجھ میں پھر بھی کچھ نہ آیا کہ فلپ امریکہ کیوں واپس جا رہا ہے۔ خاندان کی محبت اسے واپس بلا رہی ہے یا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"لیکن میں محاذ پر ضرور جاؤں گا ۔ ۔ ۔ ۔" فلپ کی روانگی کا مسئلہ پھر اُلجھ گیا۔

"مگر تم تو جنگ سے نفرت کرتے ہو" فلپ کی فلسفیانہ سنجیدگی کو نہ سمجھتے ہوئے میں نے کہا۔

"ہاں —— لیکن اس جنگ سے نہیں جو میں اب لڑوں گا" یہ کہتے ہوئے وہ لمبا تڑنگا امریکی نظر آ رہا تھا۔

"کیا تم تاج محل۔ الیورا اور اجنتا کے غاروں کو دیکھنے کی حسرت لئے ہی امریکہ چلے جاؤ گے۔ شاید تم اس جنگ میں زندہ نہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" میں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ میرا خیال تھا کہ جب وہ تیسری جنگ لڑنے جا رہا ہے تو شاید وہ واپس نہ آ سکے گا۔ اُس کی روانگی کا راز ابھی سربستہ تھا۔

"میں پھر آؤں گا —— آزاد طور پر اُس رشتے میں منسلک ہو کر جو ہم دونوں کے درمیان ہے —— اگر میں اب نہ گیا تو تاج۔ ایلورا اور اجنتا کے حسین نقش و نگار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں گے —— اور امریکہ کا مجسمہ آزادی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اُس نے اپنے ماتھے سے پسینے کی بوندیں پونچھتے ہوئے کہا۔

"بڑی عجیب بات ہے کہ تمہاری بیوی جنگی ہسٹیریا کا شکار ہو گئی" میں نے تمہاری پر خاص طور پر زور دیا۔

"لیکن وہ پروفیسر کی بیٹی بھی ہے۔ اس کا باپ اس تھیوری پر ریسرچ کر رہا ہے کہ انسانی بقا کیلئے جنگ لازمی ہے۔

جب اُس نے اس تھیوری کو ثابت کیا اور اخباروں میں اُس کی تعریف میں اداریے لکھے گئے تو اُس روز اُس کا لڑکا ایٹم بم۔ ایٹم بم چلاتا ہوا ساتویں منزل سے کود کر خودکشی کر گیا تھا" میں نے فلپ کی زبان کے طنز کو محسوس کیا۔ جو تمام مارشل پلان پر ایک عظیم طنز تھا۔ وہ سب سامان پیک کر چکا تھا اور اب تولیے سے ہاتھ وغیرہ صاف کر رہا تھا۔

دوست تم اپنی کوئی نشانی تو دیتے جاؤ شاید تم پہلے امریکی ...."

امریکہ کی توہین نہ کرو ڈیر۔ وہاں ٹرومین اور مارشل کی نسل ہی نہیں بستی " فلپ دوا امریکیوں کی مجبوری کا پوری طرح قائل تھا اسکے بعد ہم نے چائے پی اور نیچے اترنے لگے۔ سیڑھیوں پر ایک مسلا ہوا پھول پڑا تھا۔ فلپ نے پھول کو اٹھا لیا اور اُسے اپنی انگلیوں سے جھاڑ کر اپنے ٹین پھول میں ٹانک لیا۔

" شاید یہ کھلی ہوا میں پھر کھل جائے" فلپ نے پھول کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ٹیکسی پر سوار ہو کر ہم سانتا کروز کی طرف چلے۔

" آج کل بیکاری کے دنوں میں تم لوگوں کو خودکشی کرنے میں بڑی دقت ہوگی" فلپ نے بمبئی کی بلند و بالا عمارتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ " امریکہ میں ہماری عمارتیں اس سے کئی کئی گنا زیادہ بلند ہیں"

" بمبئی کے نزدیک سمندر بھی ہے" میں نے بمبئی کی برتری ثابت کرتے ہوئے کہا۔ " تمہیں ہندوستانیوں سے نفرت کیوں ہے؟" میں نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

" مجھے تم سے پیار ہے ڈیر کیونکہ تم غیر ہندوستانی ...."

" خاموش" میں نے اُسکے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ کوئی سُن لے گا تو تُو تحفظِ امنِ عامہ میں دھر لیا جائیگا" اور ہم دونوں نے ایک بلند قہقہہ لگایا اور کار کی رفتار تیز کر دی۔

سانتا کروز کے ہوائی اڈے پر آج زیادہ چہل پہل نہ تھی۔ نہ کوئی سیاح آنے والا تھا۔ اور نہ کوئی وفد جانے والا تھا۔ ہم بڑی دیر تک ادھر ادھر ٹہلتے رہے اور خوش گپیاں کرتے رہے۔ لیکن میرا دل اداس تھا۔ میرا من کہہ رہا تھا کہ فلپ جلد ہی غیر امریکی قرار دے دیا جائیگا اور وہ ہزاروں غیر امریکیوں کے ساتھ کسی قید خانے میں بند کر دیا جائے گا!

جب وہ جہاز کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا تو مجھ سے بغلگیر ہوگیا۔ اُس کی آنکھوں میں پارے کی حرکت اور چمک تھی۔ اُس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ لیکن اُسکے ہونٹ نوخیز کلی کی مانند مسکرا رہے تھے۔ اُسکے دل کا کنول کھل رہا تھا۔ اُس نے مجھے ایک نیلے رنگ کا خوبصورت لفافہ دیتے ہوئے کہا۔

" دوست میں تمہیں یہی تحفہ دے سکتا ہوں۔ جو ہیروں اور جواہرات میں نہیں مل سکتا۔ بلکہ انسان کے جذبات اس کی پرکھ کر سکتے ہیں۔" اُس نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ وہ جہاز پر سوار ہوگیا۔ وسل ہوئی اور جہاز آہستہ آہستہ زمین سے اُٹھنے لگا۔ تھوڑی دور جا کر وہ بلندیوں میں پرواز کرنے لگا۔ ایک لحظہ کیلئے میں جہاز کو دیکھتا رہا۔ پھر میں نے لفافہ کھولا۔ شاید اس میں اُسکے جانے کا کوئی راز درج ہو جو وہ مجھ سے پہلے نہ بتانا چاہتا ہو۔ لفافے میں ایک چمکدار کاغذ میں تین تصویریں تھیں۔ اوپر والی تصویر میں تین بچے کھڑے تھے۔ معصوم۔ بھولے بھالے مسکراتے ہوئے چہرے۔ نیلی نیلی صاف شفاف متجسس آنکھوں والے۔ ایک دم جی چاہا کہ اُن کی پیشانیوں کو چوم لوں اور اپنی روح کو پاکیزگی معصومیت اور حسن سے بھر لوں۔ ان بچوں میں ایک دس سالہ لڑکی بھی تھی۔ تصویر کے نیچے فلپ کے ہاتھ سے لکھا ہوا تھا۔

" مستقبل کے ستارے "

تصویر کی دوسری طرف اس تصویر کے بارے میں یہ الفاظ رقم تھے۔

ارسطو اور افلاطون کی سرزمین کے وہ تین بچے جن کے والدین کو یونانی فاسستوں نے پھانسی پر چڑھا دیا اور یہ تین بچے ——— انسانیت کے تین پھول — آج ہم سے امن اور جمہوریت

کے تحفظ کا عہد لینے آتے ہیں:

دوسری تصویر فلپ کی ننھی بچی لوریٹا کی تھی۔ اُسکے کٹے ہوئے بال اُس کی پیشانی پر پھیلے ہوئے تھے۔ اُس کے ہونٹ بند تھے لیکن کوئی تیکھا سوال پوچھ رہے تھے۔ اُس کی آنکھیں بھی بند تھیں۔ شاید وہ بچپن کے سہانے اور دلکش خواب دیکھ رہی تھی۔ ایسی خاموش اور پُرسکون چہرہ میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ لوریٹا کسی نئی ریاضت میں مگن تھی۔ تصویر کے الٹی طرف تحریر تھا۔

"لوریٹا نے مجھ سے سوال کیا ہے کہ کیا میں اُٹلی کے اُس کھِلتے ہوئے بچے کی مانند اُس کی
خوشیوں بھری چھاتی میں سنگین گھونپوں گا۔ اور اُس کی قبر بھی اپنی ہی سنگین سے اپنے
ہاتھوں کھودوں گا۔ کیا امن اور خوشی پیار اور محبت کے لمحے پھر سے نایاب ہو جائینگے"۔

اور تیسری تصویر چین کے ایک چودہ برس کے لڑکے کی تھی۔ وہ چین کی آزاد عوامی فوج کے سپاہیوں کی وردی میں ملبوس تھا۔ چیانگ نے اُسے جنگی مجرم قرار دیکر قید کرلیا تھا۔ لیکن اُس کا چہرہ ہوا میں رقص کرتے ہوئے گلاب کے پھول کی مانند خوشی سے سرشار تھا۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا۔

"امن اور جمہوریت کا ننھا پاسبان"

٭ ٭ ٭

قتیل شفائی

عورت

جب کبھی چاند گھٹاؤں میں گھرا ہوتا ہے
مَیں ترے کاکل و رخسار میں کھو جاتا ہوں
جب خلاؤں میں اُبھرتی ہے ابابیل کوئی
میں تری یاد میں بے چین سا ہو جاتا ہُوں
جب کبھی آنچ ستاروں کی ستاتی ہے مجھے
تیری یادوں کی خنک سیج پہ سو جاتا ہوں،
جب کہیں دُور تصوّر میں نکل جاتا ہو
میں تری زلف میں کچھ اشک پرو جاتا ہُوں

حسرتیں مہر بہ لب دیکھ رہی ہیں مجھ کو
میرے احساس میں کہرام مچانے کے لئے
آرزوؤں کی چبھن دل میں گھلی جاتی ہے
میری سوئی ہوئی راتوں کو جگانے کے لئے
ولولے نقش بہ دیوار ہوتے جاتے ہیں
میرے انجام کی تلخی میں سمانے کے لئے
زندگی آئینہ بردوش کھڑی ہے کب سے
مجھ کو تیری ہی کوئی شکل دکھانے کے لئے

وقت اڑتا ہی چلا جاتا ہے جگنو کا بن کر
اور میں تیرے خیالوں سے نکلتا ہی نہیں
کائنات ایک نئے حسن کی ضو مانگتی ہے
اور مَیں جادۂ انوار پہ چلتا ہی نہیں
روح آلام کی یلغار سے چلاتی ہے
اور میں پیار کے انداز بدلتا ہی نہیں
تو مرے پیار سے انکار کئے جاتی ہے
اور یہ آس کا پتھر کہ پگھلتا ہی نہیں

تو کہ زرکار جھروکے میں سجی بیٹھی ہے
تجھ کو رُسوا سحر و شام کیا جائے گا،
تیرے جلووں کی تمازت میں نہا لینے پر
تیرے ماحول کو بدنام کیا جائے گا
خلوتِ خاص میں ہونٹوں کی صبوحی پی کر
صبح ہوتے ہی تجھے عام کیا جائے گا
گنگناتی ہوئی جیبوں کے سنا کر نغمے
تیرے پندار کو نیلام کیا جائے گا

تو کہ ہر محفلِ رنگیں میں چلی آتی ہے
اپنے چہرے پہ سیہ رات کا غازہ مل کے
اپنے آنچل میں چھپائے ہوئے دھڑکن دل کی
اپنی پلکوں پہ سجائے ہوئے سپنے کل کے
اَن گنت رنگ ترے چشمۂ عارض میں گھلے
نو بہ نو جام ترے قلب و نظر میں چھلکے
بارہا جسم کا بازار سجایا تو نے
اُف مگر کوئی خریدار نہ آیا چل کے

تو کہ بازار میں پہلی سی تری قدر نہیں
اتنی ارزاں ہے مگر پھر بھی خریدار کہاں
تیرے ہونٹوں سے ہے عنقا وہ تبسم کی مٹھاس
تیری آواز میں، وہ نقرئی جھنکار کہاں،
مطلق الحکم جوانی کے وہ انداز گئے
اب ترے حسن میں پہلی سی، وہ للکار کہاں،
”نرخ کچھ اور بڑھا دے کہ یہ ارزاں ہے ابھی“
آج وہ جنس کہاں، آج وہ بازار کہاں،

تو کہ ماضی کی بہر طور پرستار نہیں
کیوں گئے وقت کی باہوں پہ گری جاتی ہے
کیوں کسی ڈار سے بچھڑے ہوئے پنچھی کی طرح
آسماں بوس محلات میں کُرلاتی ہے
کیوں زبوں حال شرابی کا بڑھاپا بن کر
اپنے جوبن کی حکایات کو دہراتی ہے
کیوں کسی بسترِ زرکار پہ کروٹ لے کر
اپنے ٹوٹے ہوئے انگ انگ کو سہلاتی ہے

تو کہ احساس کی رانی ہے، مہارانی ہے — تیرا جوبن نہیں در در پہ بھٹکنے کے لئے
تیرے آنسو نہیں دامن پہ ڈھلک جانے کو — تیری صورت نہیں آنکھوں میں کھٹکنے کے لئے
تیری نظریں نہیں جھک جھک کے بہکنے والی — تیرا لہجہ نہیں باتوں میں اٹکنے کے لئے
تو کسی پیار کے دھوکے میں نہ لانا دل کو — یہ ترے ہاتھ ہیں دامن کو جھٹکنے کے لئے

مجھ کو ہر چند ترے حسن نے دھتکار دیا — لیکن اس دل پہ مرا زور تو چلتا ہی نہیں
جب تلک میں تری یادوں کا نہ جھولا جھولوں — جی کسی طرح جدائی میں بہلتا ہی نہیں،
میں وہ زردار نہیں جس کا گلستانِ حیات — حرص کی آنچ بناں پھولتا پھلتا ہی نہیں،
تو مرے پیار سے انکار کئے جاتی ہے — اور یہ آس کا پتھر کہ پگھلتا ہی نہیں،

میں کہ افلاک کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر — چور ہوتا ہوں تو روتے ہوئے سوجاتا ہوں
جب زر و سیم کے پھندے میں الجھتا ہے کوئی — میں ترے گاتے ہوئے درد میں کھو جاتا ہوں
جب مجھے تیری جوانی کا خیال آتا ہے — جانے کیا سوچ کے بے چین سا ہو جاتا ہوں
جب کہیں دُور تصور میں نکل جاتا ہو — میں تری زلف میں کچھ اشک پِرو جاتا ہوں

وقت نے مجھ سے تجھے چھین لیا ہے لیکن — میں جیوں گا ترے خوابوں میں سمانے کیلئے
میں جیوں گا تری عظمت کا نگہباں بن کر — میں جیوں گا تجھے ذلت سے بچانے کیلئے
میں ترے دل پہ کوئی آنچ نہ آنے دونگا — میں بڑھوں گا تجھے سینے سے لگانے کیلئے
زندگی آئینہ بردوش کھڑی ہے کب سے — مجھ کو تیری ہی کمی شکل دکھانے کیلئے

اعجاز بٹالوی

پٹی ہوئی لکیر

چینی کے نازک گلدان میں نرگس کے باسی پھول کمرے کا خاموش جائزہ لے رہے تھے۔ چیزیں اس سلیقے اور احتیاط سے رکھی تھیں جیسے کسی چیز کو ہاتھ لگانے سے سارا کمرہ بے ترتیب ہو جائے گا۔ آتشدان پر شیشے کے چوکھٹوں میں جڑی ہوئی تصویریں دروازے کی جانب دیکھ رہی تھیں جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہوں۔ ایک کونے میں میز پر چند کتابوں کے درمیان ٹیبل لیمپ گردن جھکائے کھڑا تھا۔ فرش پر بچھے ہوئے قالین اور صوفے پر پڑے ہوئے ریشمیں کشن کے شوخ رنگ کچھ کچھ مدھم پڑنے لگے تھے۔ میز پوشوں پر ریشمیں دھاگے سے بہت خوبصورت پھول کاڑھے گئے تھے اور حاشئے کی نفاست سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اپنی فرصت کے بےشمار لمحوں میں ان پر دیدہ ریزی کی ہے کمرے کی تمام چیزوں سے ایک معصوم دوشیزگی برس رہی تھی۔ جیسے کبھی مرد کا سایہ تک ان پر نہیں پڑا مگر تپائی پر رکھا ہوا چاندی کا خوبصورت سگریٹ کیس کمرے کی ہر چیز کا منہ چڑا رہا تھا۔ اتنے میں وہ گنگناتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

دن بھر کی محنت کے بعد جب وہ ہسپتال سے لوٹی تو اس کا جسم تھک کر چُور ہو چکا تھا۔ لمبے لمبے وارڈوں میں چکر لگا کر اس کی ٹانگیں بوجھل ہو گئی تھیں۔ آہنی چارپائیوں پر لیٹی ہوئی مریض عورتوں کے سرہانے کھڑے ہو کر مسکرانے کی کوشش نے اس کے چہرے کی اپنی مسکراہٹ بھی چھین لی تھی۔ دماغ مریضوں کی کراہیں سن سن کر بھنا اٹھا تھا اور آنکھیں بیمار چہروں کو دیکھ دیکھ کر اکتا گئی تھیں اور یہ سب کچھ ہر روز ہوتا تھا۔ ہر روز اس بیمار پرست زندگی کے بعد جب وہ شام کو گھر لوٹتی تو اس کے قدم کہیں کے کہیں پڑتے اور ہسپتال کی مریضانہ زندگی اس کا تعاقب کرتی ہوئی معلوم ہوتی۔ ہسپتال کی عمارت کے قریب ہی اس کا چھوٹا سا خوبصورت بنگلہ تھا جس میں وہ اپنی ملازمہ کے ساتھ خاموش زندگی گزار رہی تھی۔ سوائے نرس کے جو کبھی کبھی کسی مریض کی حالت کو خطرناک پا کر اسے بلانے کے لئے چلی آتی اس گھر میں اور کوئی نہیں آتا تھا۔ ہسپتال اور گھر —— اس کی زندگی بس انہیں دو حصوں میں بٹ کر رہ گئی تھی۔ قصبے کی عورتیں اسے صحت اور شفا کی دیوی کہتی تھیں جس کا اثر یہ ہوا تھا کہ ہسپتال کے رجسٹر میں مریضوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔

اس نے ہسپتال سے واپس آ کر بے دلی سے کپڑے تبدیل کئے، ہاتھ منہ دھویا اور چائے پی کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔

—— اس کمرے کو ڈرائنگ روم کہنا شاید اس لئے زیادتی ہوگی۔ کہ اس نے سلائی کی مشین سے لے کر خط لکھنے کے پیڈ تک ضرورت کی تمام چیزیں اسی کمرے میں رکھی ہوئی تھیں لیکن اس کے باوجود کمرے کی نفاست اور آرائش میں کوئی فرق نہیں آنے دیا تھا۔ جب وہ گھر میں ہوتی تو اپنا بیشتر وقت اس کمرے میں گزارتی۔ اس کے ساتھ سونے کا کمرہ تھا۔ مکان کے باقی دو کمرے خالی پڑے تھے جن میں سے ایک میں اب اماں نے اپنی چارپائی ڈال لی تھی۔ برآمدے سے گزر کر باورچی خانے کے ساتھ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں کھانے کی میز اور دو کرسیاں پڑی تھیں۔ دوسری کرسی شاید احتیاطاً رکھ دی گئی تھی۔ حالانکہ اب تک اس کے استعمال کئے

جانے کا ایک موقع بھی نہیں آیا تھا۔ سائیڈ بورڈ پر سفید چادر بچھی تھی جس پر ملازم نے چینی کے برتن احتیاط سے چن رکھے تھے۔ وہ جس کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھایا کرتی تھی اس کے سامنے والی دیوار پر ایک تصویر لٹک رہی تھی۔ ایک دن ملا کے پوچھنے پر اس نے کہا تھا کہ یہ اس کی والدہ کی تصویر ہے۔

وہ گنگناتی ہوئی ڈرائینگ روم میں داخل ہوئی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے کمرے کے چاروں طرف دیکھا۔ تمام چیزیں اسی طرح پڑی تھیں جس طرح وہ انہیں صبح ہسپتال جاتے ہوئے چھوڑ گئی تھی۔ کبھی کبھی اس کا جی چاہتا تھا۔ وہ گھر لوٹے تو اسے وہ کتاب جسے وہ پڑھتے پڑھتے میز پر چھوڑ گئی تھی کھڑکی میں پڑی ملے یا کشن اس نیم مردہ طور پر صوفے پر دکھائی دینے کی بجائے سونے کے کمرے میں اس کی چارپائی پر پڑا ہوا ہو۔ گلدان آتش دان سے گر کر ٹوٹ جائے۔ یا اس کا پوڈر دان گم ہو جائے۔ لیکن ہر شام جب وہ گھر لوٹتی تو کمرے کی بے جان چیزیں اسی ترتیب سے پڑی ہوتیں جس ترتیب سے پہلے رونہ ملازمہ کو انہیں رکھنے کی تاکید کی گئی تھی۔ پھر اس کی نظر اپنی سفید ساڑھی پر پڑی، کیسی بے شکن تھی۔ اس کا جی چاہا بستر پر آلتی پالتی لگائے کہ ساڑھی پر بے شمار شکنیں پڑ جائیں اور پھر کھڑی ہو کر آئینے میں دیکھے کہ سلوٹیں پڑی ہوئی سفید ساڑھی کیسی لگتی ہے اس نے ہاتھ بڑھا کر میز پر سے اُون کا گچھا اور سلائیاں اٹھائیں اور سویٹر بننے لگی۔

اس کے دونوں ہاتھوں میں سلائیاں تیز تیز چل رہی تھیں کہ اسے خیال آیا کہ وہ صبح ہسپتال جانے سے پہلے عین اسی جگہ بیٹھی یہی سویٹر بن رہی تھی۔ اور اب پھر وہی سویٹر اسے جھنجھلاہٹ سی ہوئی اور اس نے اُون اور سلائیاں سمیٹ کر پھر میز پر رکھ دیں۔ اُون کو میز پر رکھتے ہوئے اس کی نظر سگریٹ کیس پر جا پڑی اور وہ دل ہی دل میں ہنسنے لگی۔ اس کمرے کی تمام چیزوں کے درمیان پڑا ہوا سگریٹ کیس کس قدر عجیب معلوم ہو رہا تھا۔ اسے خیال آیا کوئی دیکھے تو کیا کہے لیکن دوسرے ہی لمحے میں اس نے سوچا کہ یہاں اس سے ملنے ہی کون آتا ہے۔

ایک دن جب وہ بازار میں کچھ چیزیں خریدنے گئی تھی تو اس کی نگاہ اس سگریٹ کیس پر پڑی۔

"وہ سگریٹ کیس اٹھائیے، کیا قیمت ہوگی اس کی؟" اس نے دوکاندار سے کہا۔

دوکاندار نے سگریٹ کیس پیش کرتے ہوئے کہا "بتیس روپے"

اور جب وہ شاپنگ کے بعد گھر لوٹی تو ملا نے حیرت سے پوچھا "بی بی یہ تو مُوا سگریٹ رکھنے کا ڈبہ ہے اسے کیا کریں گی آپ"

اور اس نے کہا "یونہی اٹھا لائی نصیبن۔ دوکان میں پڑا ہوا بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ اسے سامنے تپائی پر رکھ دو" اور اس دن سے یہ سگریٹ کیس وہیں پڑا تھا۔

آخر اس کی نظریں کمرے کی خالی خالی فضا سے تنگ آ کر سامنے کے دریچے سے باہر دیکھنے لگیں۔ سورج آسمان کی ڈھلان سے آہستہ آہستہ پھسل کر مغرب کی گود میں پہنچ گیا تھا اور اس کی پھیکی پھیکی کرنوں کی نکھری نکھری روشنی کمرے میں آ رہی تھی۔ وہ اُٹھ کر دریچے میں آ کھڑی ہوئی۔ دریچے کے باہر دور تک سبز گھاس کا وسیع قطعہ تھا، اور اس کے پرے درختوں کی لمبی قطار کے پیچھے پھیکی پھیکی کرنیں سمٹی جا رہی تھیں۔ سورج ابھی پوری طرح غروب نہیں ہوا تھا۔ درختوں کی قطار کے اوپر مغربی آسمان پر پھیلے ہوئے بادلوں کا رنگ قرمزی ہو گیا تھا۔ اور ان کے سنہالی کناروں سے روشنی چھلک رہی تھی۔ مشرقی آسمان پر چاند ابھر آیا تھا۔ لیکن اس کے چہرے کی سُرخی، ابھی سفیدی میں تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ چاند کا چہرہ سرخ تھا۔ جیسے اسے سورج کی موجودگی کا احساس ہو۔ پھر سورج ڈوبتا چلا گیا اور چاند کے چہرے پر سفیدی اترتا چلا آیا۔ نیلے پرسکون آسمان کا رنگ شفاف ہو گیا۔ اب چاند یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی گہرے نیلے آنچل پر پگھلی ہوتی چاندی کا گول نشان۔ نیلے رنگ کے وسیع آسمان پر بادل کا ایک تنہا ٹکڑا رہ گیا تھا۔ جو ایک داستان دو

میں چاند کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔ وہ دریچے میں کھڑی چاند کی طرف دیکھتی رہی۔ وسے چاند۔ وہ چکور کی کہانی یاد آگئی جو اس نے بچپن میں کئی دفعہ سنی تھی۔ چکور بے تاب ہو کر چاند تک پہنچنا چاہتا ہے مگر فاصلے کی دوری سے بے خبر ہے۔ اس نے سوچا دنیا والوں کی نظر میں چکور کی محبت مثالی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ کہتے ہیں چکور چاند کے لئے تڑپتا ہے کون جانے چاند خود چکور کے لئے بے تاب ہو۔ چکور کی مجبوری دنیا کی نگاہوں میں ہے مگر چاند کی بے تابی تک ان کی نظریں نہیں پہنچتیں۔ شاید چاند بھی اپنے محبوب کی خاطر زمین پر اتر آنے کے لئے اتنا ہی بے تاب ہو جتنی چکور کی خواہش پرواز لیکن کسے خبر کہ آسمان والوں کے قانون بھی اتنے ہی کڑے ہیں جتنے زمین والوں کے۔ اب بادل کے تیرتے ٹکڑے نے چاند کو آلیا اور اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

وہ کمرے کی طرف لوٹی۔ کمرہ تاریک ہو گیا تھا۔ اور دریچے کے آگے لٹکے ہوئے فرش کا محض چھوٹا سا ٹکڑا چاندنی سے منور ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بجلی کا بلب روشن کر دیا اور کمرے میں ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ ایک عجیب بے خیالی کے عالم میں وہ آتشدان کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ سامنے شیشے کے فریم میں قید اس کی اپنی تصویر مسکرا رہی تھی۔ اس نے اس مسکراتی ہوئی آنکھوں والی لڑکی کی طرف غور سے دیکھا اور سوچنے لگی کہ وہ چھ سال کے اس عرصے میں کیا سے کیا ہو گئی ہے۔ اسے اس لڑکی میں جو اس کے سامنے شیشے میں قید مسکرا رہی تھی۔ اور اس عورت میں جو اس کے سامنے کھڑی اسے گھور رہی تھی۔ کوئی مناسبت نظر نہ آئی۔ آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کا دلآویز خم، ابھرے ابھرے گال اور چہرے کی رونق۔ وہ یہ سب نعمتیں وقت کے سنگدل دیوتا کی بھینٹ کر چکی تھی وہ بے اختیار ہو کر آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ چہرے پر اگرچہ وہ اگلی سی دلکشی باقی نہ رہی تھی لیکن اس کی جگہ ایک اطمینان آمیز ملائمت نے لے لی تھی۔ جیسے پہاڑوں کی گلپوش وادیوں میں دن ڈھلے کی دھوپ۔ آنکھوں کی گہرائیوں میں ایک عجیب سا سکون تھا جیسے گھنے درختوں کے جھنڈ میں لیٹی ہوئی جھیل۔ سر میں کہیں کہیں سفید بال جھانکتے تھے۔ اس کے چہرے کا تمام اظہار اب بھی پتھر کی ایک حسین مورتی سے کم نہ تھا۔ جس کے چہرے پر سنگتراش نے ایک غمگین مسکراہٹ ہمیشہ کے لئے ثبت کر دی ہو۔ اس نے دیکھا کہ اس کی گردن پر ٹھوڑی کے نیچے کچھ فالتو گوشت جمع ہو رہا ہے۔ اسے یاد آگیا کہ سلطانہ اس کی گردن کے اس حصے کی تعریف کرتے کرتے بہک جایا کرتی تھی۔ اور کس طرح اسے چڑانے اور چومنے کی کوشش میں ہاتھا پائی پر اتر آتی تھی۔

سلطانہ کا خیال اس کے ذہن کے اندھیرے میں جگنو کی طرح چمکا اور وہ واپس صوفے پر آ بیٹھی۔ اب اندھیرے کا یہ جگنو زمان و مکان کی قید سے آزاد وقت کی آسکیوں کے وسیع سمندر کو پھاندتا ہوا اڑتا چلا جا رہا تھا۔ راستے میں اسے کالج کا زمانہ یاد آگیا اور اس کے ساتھ وہ شام جس کے بعد اس نے زندگی کے درد کو سینے سے لگا لیا تھا۔ اور اب تک اسے سینے سے لگائے پھرتی تھی ...... یہ برسوں پہلے کی بات تھی ...... وہ ابھی بچی ہی تو تھی۔ شام کو اسکول سے لوٹی تو اس نے دیکھا کہ گھر کی ہر چیز سے وحشت ٹپک رہی ہے، دیکھی بھالی چیزوں سے اسے ڈر لگ رہا تھا۔ اس نے برابر کے کمرے سے سسکیوں کی آواز سنی اور جلدی سے اپنا بستہ میز پر پھینک کر امی کے کمرے میں چلی گئی۔ امی بستر پر اوندھے منہ پڑی تکیے میں منہ چھپائے رو رہی تھیں اور اس کی بہن کے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو حیران نظروں سے امی کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا اور سب کچھ سمجھ لیا۔ اس نے جان لیا کہ ابا نے آج پھر امی کو مارا ہے۔ گھر میں آئے روز یہی کچھ تو ہوتا تھا۔ ماں اور باپ کی لڑائی نے گھر کو جہنم بنا رکھا تھا۔ رات گئے اس کا باپ گھر لوٹتا۔ اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے ہوتے۔ اس کے منہ سے عجیب سی بو کے بھبکے آتے اور پھر اس کی ماں اور باپ میں لڑائی شروع ہو جاتی۔ اس کا باپ گالی گلوچ پر اتر آتا اور اس کی ماں کے کوسنوں کی آوازیں بلند ہونے لگتیں۔ ہمسائے جاگ اٹھتے اور اس کا باپ چڑ کر اس کی ماں کو پیٹنے لگتا۔ دونوں بہنیں اپنے بستروں پر دبکی پڑی رہتیں۔ وہ ایسے موقعوں پر خود کئی دفعہ باپ کے ہاتھوں پٹ چکی تھیں۔ کئی

وقفہ وقفہ اسی کے ساتھ مل کر رونے لگتیں۔ اب جوں جوں وہ بڑی ہو رہی تھی باپ کے لئے اس کے دل میں نفرت بڑھتی جا رہی تھی اور آج جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو اس کی ماں پھر رو رہی تھی۔ اس نے اپنی چھوٹی بہن کو پیار کیا اور اس کی ماں دونوں بیٹیوں کو گلے لگا کر زور زور سے رونے لگی۔ پھر اگلے روز اس کے نانا کا چہرہ گھر میں نمودار ہوا۔ اسے اپنے نانا کی سفید مقیشی داڑھی اور جھریوں والا چہرہ ابھی تک یاد ہے۔ اس کے گھر میں آتے ہی جیسے انہیں زندگی کی مصیبتوں سے بچانے کے لئے کوئی حفاظت کا ہاتھ آگے بڑھ آیا ہو۔ اور پھر وہ اپنی بہن اور اپنی ماں کے ساتھ نانا کے گھر چلی آئی اور باپ کا گھر ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔

وقت گزرتا گیا اور وہ بڑی ہوتی گئی لیکن باپ کی ایک نہایت منحوس تصویر اس کے ذہن میں جمی رہی۔ وہ اپنے باپ کی کوئی بات بھی نہ سننا چاہتی تھی، اس کے ذکر پر پریشان ہو جاتی تھی۔ پھر ایک روز انہیں معلوم ہوا کہ ان کا باپ سخت بیمار ہے اور اپنے گناہوں پر سخت شرمندہ ہے۔ پھر انہیں خبر ملی کہ وہ بستر مرگ پر پڑا زندگی کے دن گن رہا ہے اور اپنے بیوی بچوں کیلئے تڑپتا ہے۔ اس کی شدید علالت کی خبریں ملتی رہیں لیکن اس کا دل نہ پسیجا۔ رشتے داروں نے آ کر کہا وہ روتا ہے اور کہتا ہے کاش وہ مرنے سے پہلے بیوی بچوں سے معافی مانگ سکے۔ پھر ایک دم انقلاب آیا۔ جیسے طوفان کے بند ٹوٹ جائیں اور اس کی ماں رونے لگی۔ اور اپنے مرتے ہوئے خاوند کو دیکھنے چلی گئی۔ اس کی چھوٹی بہن نے ماں کا ساتھ دیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس نے اس گھر میں جانے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اس کا باپ مر گیا اور بالکل بے اختیاری طور پر اس کی آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک گئے لیکن وہ آج تک خود کو ان دو آنسوؤں کے لئے معاف نہ کر سکی۔

اندھیرے کا جنگل، تاریکی کا ایک دور خطرہ عبور کر گیا تھا۔ اب وہ میڈیکل کالج کی طالب علم تھی بیوہ ماں کے بڑھاپے کا سہارا۔ ایک خاموش طبع اپنے کام سے کام رکھنے والی چپ چاپ سی لڑکی کالج کے لڑکے اس سے خائف تھے وہ ان سے بات نہ کرتی تھی۔ ساتھ ہی سے لیبٹ سے اچھی صحبت آزما کر مایوس ہو چکے تھے باقی اس کے متعلق سنی سنائی باتیں سن کر اس سے ڈرنے لگے تھے۔ اب لڑکوں کی محفلوں میں اس کا ذکر یوں ہوتا: "ارے کون ہیرا دی؟ کیا کہا خوبصورت ہے؟ ہاں مگر زندگی سے تنگ آئی ہوئی ہے" "وہ لڑکی ہے یا الجبرے کا سوال" "میں نے سنا وہ باتیں بھی کرتی ہے" "میں نے سنا آج کل پوٹاشیم سائینائیٹ کی تلاش کر رہی ہے" اصغر نے جو اپنے دوستوں کے حلقے میں اچھا خاصا نفسیات کا ماہر سمجھا جاتا تھا اعلان کر دیا تھا کہ یہ لڑکی تیسری جنس سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے پیچھے اپنے کو پریشان کرنا سوائے دیوانگی کے اور کچھ نہیں۔ اس کا یہ رویہ اس کی ہم جماعت لڑکیوں کی سمجھ میں بھی نہ آ سکا تھا۔ آخر لڑکوں سے دو گھڑی ہنس کر بات کر لینے میں کیا ہرج تھا۔ اور رضیہ تو اپنی ہم جماعتوں سے ہمیشہ کہا کرتی کہ اگر تم اپنی ایک غلط انداز مسکراہٹ سے کسی کو شوخ رنگ کی ٹائیاں پہننا، تنہائیوں میں گنگنانا اور کوری آنکھوں سویرا کرنا سکھا سکو تو اس میں برائی کیا ہے اور شاید اسی لئے وہ اپنی مسکراہٹیں اتنی فیاضی سے لٹایا کرتی تھی کہ کالج میں شاعروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا تھا۔ لیکن اسے رضیہ کی یہ باتیں کبھی پسند نہ آ سکی تھیں، اُسے تو سلطانہ کا مزاج بھاتا تھا۔ اس کی طرح خاموش، آہستہ سے بات کرنے والی، بناؤ سنگھار سے دل برداشتہ، مردوں اور شادی کو گالیاں دینے والی سلطانہ۔ کالج کے لڑکے سلطانہ کی طرف سے مایوس نہ تھے۔ لیکن اب کچھ عرصے سے ان دونوں کی دوستی کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا تھا۔ سلطانہ کے اثر سے اب وہ لڑکوں کو قدرے بے تکلفی سے ملنے لگی تھی۔ مگر ان کی ہر بات کا مذاق اڑانے کی عادت نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ کالج کے برآمدے میں جب کوئی البیلا انہیں گھورتا ہوا ان کے پاس سے گزر جاتا تو وہ ذرا اونچی آواز میں کہتی "سلطانہ کہو دل کرشن امریکن ایکٹر کی نقل میں آپ نے جیرٹے کی یہ واسکٹ پہنی ہے اس کا جسم آپ سے کہیں خوبصورت ہے؟" اس پر ان دونوں کا قہقہہ بلند ہوتا اور لڑکے کے قدم تیز ہو جاتے

وہ صوفے پر بیٹھی تھی اور اس کے ذہن میں اندھیرے کا جنگل پھر دراز ہو رہا تھا۔ اس کی اڑان کے ساتھ ساتھ کتنی تصویریں ابھر

ابھر کر مٹ رہی تھیں۔ اداس دنوں اور اداس راتوں کی تصویریں۔ اور انہیں تصویروں میں اسے وہ رات نظر آئی جب وہ پہلی دفعہ سلطانہ کے ساتھ سوئی تھی مگر سلطانہ بے وفا تھی۔ وہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ اس رات وہ دونوں ایک فلم دیکھ کر واپس آئی تھیں۔ بڑی ہی اُداس کرنے والی فلم تھی۔ جسے دیکھ کر زندگی کی ساری تلخیاں شعور کی سطح پر آگئی تھیں۔ اس نے کہا سلطانہ آج تم یہیں سو جاؤ اور وہ اپنے کمرے میں بیٹھی سلطانہ کے ساتھ بڑی اُداس باتیں کرتی رہی۔ ایسی باتیں کہ اس نے آج سے پہلے کسی سے نہ کی تھیں۔ پھر وہ سلطانہ کے ساتھ لیٹے لیٹے رونے لگی اور سلطانہ نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے گلے سے لگا لیا۔ اس نے سلطانہ کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اور وہ دونوں بڑی میٹھی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتی رہیں۔ پھر اس نے اپنے گرم ہونٹ سلطانہ کے ہونٹوں پہ رکھ دیئے اور اس کی آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسو سلطانہ کے ملائم گالوں پہ پھسلتے رہے ساری رات سلطانہ کی گرم آغوش میں سو کر اسے محسوس ہوا جیسے زندگی کو سہارا مل گیا ہو۔

سلطانہ کی دوستی اس کی زندگی کا سہارا ہی تو تھی۔ وہ اس سے ملتی تو زندگی کی ساری نامرادیاں بھول جاتی۔ سلطانہ کی ہمراہی میں زندگی کا ساگر ایسا طوفانی نہ رہتا۔ لیکن پھر ایسا بھی طوفان آیا کہ ایک ہی موج میں سلطانہ اس سے بچھڑ گئی۔ جب اس نے سلطانہ کی منگنی کی خبر سُنی تو اسے اس پہ اعتبار نہیں آتا تھا۔ مگر جب سلطانہ نے خود اس سے مل کر کہا کہ وہ ماں باپ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر شادی کر رہی ہے۔ تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی" سلطانہ!" اس نے زہر خند سے کہا "اگر تم خود اپنی پسند سے شادی کا فیصلہ کرتیں تو شاید مجھے اس قدر دکھ نہ ہوتا مگر اب تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ تم لڑکی نہیں اصطبل میں بندھی ہوئی گھوڑی ہو"

سلطانہ نے اس بات کا بھی بُرا نہ مانا اور ہنس کر کہا "یہ وقت تو ہر لڑکی کی زندگی میں آتا ہے۔ وہ خود شوہر کا انتخاب کرے یا ماں باپ پر چھوڑ دے تم تو اسے اصطبل میں بندھی ہوئی گھوڑی ہی سمجھو گی"

وہ آنکھیں بند کئے سلطانہ کی باتیں سنتی رہی اور غصے اور نفرت کی لہریں اُٹھیں دل ہی دل میں پیدا ہو کر طوفان مچاتی رہیں۔ اس نے کہا "سلطانہ تمہاری شادی نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ کہ تم جیسی ذہین لڑکی بھی کبھی یہ یقین کرے گی۔ کہ عورت واقعی ایک لکیر ہے جو ازل سے پٹتی چلی آتی ہے" اور سلطانہ نے ہنس کر جیسے معافی مانگتے ہوئے کہا "خدا کے لئے چھوڑو اس بحث کو۔ آؤ میں تمہیں اپنے ہونے والے شوہر کی تصویر دکھاؤں اور اس نے اپنا پرس کھول کر ایک لمبی لمبی مونچھوں والا چہرہ اس کے سامنے رکھ دیا"

سلطانہ کی شادی ہو گئی اور وہ باوجود اس کی التجاؤں کے شریک نہ ہوئی۔ اس کی التجا کے آنسوؤں کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔ اس نے محض اتنا کہا "نہیں سلطانہ میں تمہاری شادی پہ نہ جاؤں گی۔ اب میں کسی کی شادی پہ نہ جاؤں گی" سلطانہ چلی گئی اور اس کی زندگی پھر ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح بے کیف اور ویرانے کی مسجد کی طرح خاموش ہو گئی۔ کالج میں اس کا آخری سال تھا اور اُس نے اپنے ذہن میں تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنی آئندہ زندگی کا نقشہ تیار کر لیا تھا۔ کہ مسعود اس ٹھہرے ہوئے پانی کی جھیل کے ساحل پہ آ کھڑا ہوا اور ساحل کے کنارے کٹ کٹ کر خاموش سطح پہ تازہ لہریں پیدا کرنے لگے۔ مسعود اس کا ہم جماعت تھا۔ جس کی چاہت کا اظہار کبھی معنی خیز نگاہوں کی حد سے آگے نہ بڑھا تھا۔ پہلے تو اس نے سوچا کوئی خاص بات نہیں وہ یونہی اس کی طرف دیکھ رہا ہو گا۔ مگر پہاڑوں کی چوٹیوں پہ سورج کی گرمی سے برف پگھلتی رہتی ہے لیکن میدان والوں کو اس کا احساس صرف اسی وقت ہوتا ہے۔ جب پگھلی ہوئی برف کا پانی پر شور ندی بن کر نشیب کی طرف بہہ نکلتا ہے جب مسعود کی ان نظروں کا مفہوم اس پہ واضح ہوا تو وہ گھبرا گئی۔ اس نے ایک روز کالج لان میں گزرتے ہوئے اسے روک لیا

اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اس کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی تھی، غصے سے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے لیکن اس نے ہمت کر کے کہا "مسعود صاحب! مجھے آپکی یہ حرکت بالکل پسند نہیں ہے، میں اسے بیہودگی سمجھتی ہوں" مسعود نے جو اس کی غیر متوقع گفتگو پر کچھ گھبرا سا گیا تھا۔ اپنا سگریٹ پرے پھینکتے ہوئے بولا "مجھے اس بات کا افسوس ہے، آپ نے غلط سمجھا مجھے آپ سے ایک ضروری بات کہنا ہے، کیا آپ کوئی وقت نکال سکیں گی؟" اس کے قدم لڑکھڑا گئے اور اس نے جلدی جلدی قدم اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "آئندہ آپ مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہ کیجیئے گا۔"

امتحان شروع ہونے میں چند دن باقی تھے اور کالج میں امتحان کی تیاری کے لئے چھٹیاں ہونے والی تھیں کہ ایک لیکچر کے دوران میں مسعود کو اپنے ساتھ والی کرسی پر بیٹھے دیکھ کر اس کا خون پھر غصے سے کھولنے لگا۔ اب لیکچر روم میں اندھیرا تھا اور سامنے پردے پر ایک میڈیکل فلم دکھائی جا رہی تھی۔ اس نے مسعود کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے مس ہوتے ہوئے محسوس کیا اور تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کلاس روم چھوڑ کر باہر چلی آئی۔ مسعود نے بعد میں معافی مانگنے کی کوشش بھی کی مگر اس کے پاس چند تیوریوں اور تلخ لفظوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

امتحان کا نتیجہ نکلا۔ وہ اس میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے ملازمت کیلئے درخواست بھیج رکھی تھی کہ ایک روز مسعود اس سے ملنے کے لئے چلا آیا۔ مسعود نے فوج میں شاہی کمیشن لے لیا تھا اور اب وہ مصر جا رہا تھا۔ مسعود نے اس دفعہ بڑی سنجیدگی سے باتیں کیں اور کہا "میں مصر جانے سے پہلے آخری دفعہ تم سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے ہمیشہ تمہارے ساتھ زندگی بسر کرنے کے خواب دیکھے ہیں۔ میں تمہارے وعدے پر زندہ رہ سکتا ہوں۔ تم میرے لئے زندگی کی خواہش بن جاؤ گی۔ تمہارا خیال مجھے جنگ کی مصیبتوں اور سفر کی دقتوں کو ہنس کھیل کر جھیلنا سکھا دے گا .... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں میں پردیس میں تمہارا رہوں گا" لیکن اس نے انکار کر دیا اور مسعود مصر چلا گیا۔ اسے ملازمت مل گئی اور وہ لیڈی ڈاکٹر ہو کر اس شہر میں چلی آئی جہاں اسے محبت اور شفا کی دیوی سمجھا جانے لگا۔ جہاں وہ برسوں سے ایک خاموش زندگی گزار رہی تھی۔

اس واقعہ کو چھ برس ہو گئے تھے۔ جنگ ختم ہوئے بھی کئی سال گزر گئے تھے اور اس دوران میں اس کی زندگی میں کوئی بڑا واقعہ نہ ہوا تھا۔ صبح شام برسوں سے ایک ہی ڈگر پر چل رہے تھے جس سے وہ کبھی کبھی اکتا جاتی تھی۔ وہ دن رات کی اس بے رنگ کہانی سے تنگ آجاتی، زندگی کے بوجھ سے تنگ آجاتی اور سوچتی کہ آخر یہ سفر کہاں ختم ہو گا۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ جھلملا رہے تھے۔ بادل کا تنہا ٹکڑا چاند کے قریب ہی منڈلا رہا تھا۔ دور سٹیشن پر آنے والی ٹرین کا ہلکا سا شور اٹھا اور کھو گیا وہ صوفے پر خاموش بیٹھے بیٹھے تنگ آگئی تھی اس نے سوچا کاش نرس آجائے اور کہے کہ کسی مریض کی حالت خطرناک ہو گئی ہے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ باہر ہوا کے دوش پر درختوں کے پتے سرسرا رہے تھے۔ اتنے میں ماما نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا "بی بی ایک صاحب آپ سے ملنے کے لئے آئے ہیں" اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا "کون صاحب ہیں؟" اس نے ماما سے اپنی گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کی "بی بی انہوں نے اپنا نام میجر مسعود بتایا ہے" یکبارگی کمرے میں ہزاروں قمقمے چمکے اور بجھ گئے اسے محسوس ہوا کہ وہ محبت اور نفرت کی بے اندازہ لہروں میں ہچکولے کھا رہی ہے ملازمہ اس کی اجازت کے لئے اس کے سامنے کھڑی تھی اور وہ دریچے سے باہر چمکتے ہوئے چاند اور جھلملاتے ہوئے ستاروں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے اوپر سے نیچے تک ایک نظر اپنے آپ پر ڈالی "انہیں اندر لے آؤ" یہ فقرہ لڑکھڑاتا ہوا اس کے منہ سے نکلا اور پیشتر اس کے کہ ملازمہ کا آخری قدم دہلیز سے باہر پڑتا اس نے اسے واپس بلاتے ہوئے کہا "نعیمن دیکھو وہ سگریٹ کیس اٹھا کر الماری میں رکھ دو، وہ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے"

شکیلہ اختر

"یا اللہ" ——— ریحانہ نے دروازے پر نظر ڈالتے ہی اچانک کہا۔ "اجی ہم کچھ نا کہیں ہیں دلہن"
آواز کے ساتھ ایک لمبا سپاٹ سا سایہ آنچل سے اپنا آدھا منہ چھپائے اندر داخل ہوگیا۔ اور سامنے چوکی پر بیٹھی ہوئی ریحانہ کی آنکھیں سفید کاغذ پر بے بسی سے گڑ گئیں، اب اس کے لئے سب کچھ ختم ہوگیا تھا، پلاٹ، تسلسل، مجروحوں کی دردانگیز نگاہیں اور اندھے زخمیوں کی روح خراش کراہیں، اتنی دیر میں ساری کیفیت اسکے دل و دماغ سے مٹ چکی تھی۔ اور وہ اپنی جھکی ہوئی نظر بھی تو اوپر نہیں اٹھا سکتی تھی ہائے اللہ کس کمینے نے اس کو میرے گھر کا پتہ بتا دیا تھا اور اسی پرانی چڑچڑاہٹ سے اس کا سارا جسم اینٹھنے لگا۔ وہ یہیں سے کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ سنکر اس کی روح لرز اٹھتی تھی اور پھر آہستہ آہستہ وہ لمبا سپاٹ اور ڈگمگاتا ہوا سایہ آگے بڑھتا چلا آتا تھا اور ریحانہ کی مسرتوں، خوابوں اور اسکے سارے جذبات کا بیدردی سے گلا گھونٹ دیتا تھا! ریحانہ تڑپتی سسکتی اور پھر ایک لاش کی طرح سرد اور بے جان سی بن جاتی تھی جس میں کوئی زندگی باقی نہ رہتی تھی، وہ بار بار اتنی بیدردی کی موت مرنا نہیں چاہتی تھی ——— "اجی۔ تم ہی تو میری جان بچائے ہو دلہن اللہ تمرا بھلا کرے ——— نہ نہ ہم کبھی تم کو نا بھول سکیں ہیں" اور ادھیڑ عمر کی بڑھیا ریحانہ کے قریب بیٹھ جاتی۔ بڑھیا کی ناک ہمیشہ سنکتی رہتی اور وہ بار بار ناک کے راستے اپنی بند سانس کو ہونک ہونک کرکے چھوڑتی رہتی ——— "ایک بات بولیں دولہن" ——— اسکے لبوں پہ رکھا ہوا میلا آنچل لرز اٹھتا ——— اور یہی باتیں ریحانہ کو کھلا دیتیں۔ "دیکھو جی سن لو۔ دیکھنا ہے تو چپ چاپ بیٹھی رہو ——— اور جو اسی طرح بک بک کرنا ہے۔ تو پھر چلی جاؤ"۔ مگر سانولے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے چہرے میں گڑی ہوئی وہ بے رونق اور میلی آنکھیں ریحانہ کی کھلی ہوئی شاداب آنکھوں میں ڈوب کر جیسے بڑی حسرت سے کہتیں۔ "تم اتنی دُھلی ہوئی اور چمکیلی سی کیوں ہو؟ اور میں! کیا ہمیں بھی آنکھیں ہوں ——— پھر تمہاری طرح کیوں نہیں لگتی؟ ——— اور ریحانہ اس نشتر کی چبھن سے تڑپ تڑپ اٹھتی ——— "کا کہیں دولہن ——— یہ نگوڑا مارا بلوائی سب نے ایسا بلوہ کھڑا کردی ہیں اجی یہی نوادہ میں اپنے باپ دادا کا گھر رہے چار ہزار کا لالہ براجل سب دروازہ پر ——— مگر ہائے کاٹ دی ہیں نے میری بستی کو کاٹ کے رکھ دی ہیں دولہن۔ ہم نہیں کہن ہیں۔ تینوں رُتنا ماتی گھر دوار چیز بس چھوڑ چھاڑ کے بھاگے۔ ارے باپ رے باپ اتنا ظالم اتنا ظالم رہے دلہن کا بتا دیں ایک ایک آدمی کو بیس بیس آدمی مارتا تھا۔ لگ لگ کے چھپا چھپ کے بھاگے تب بھی منڈی سب بدن پر کا کپڑا ایک چھین لیہیں۔ کا کہیں دولہن" ——— پتلے مگر دو تنگ کھنچے ہوئے ہونٹ تھوڑی دیر کیلئے ایک دوسرے سے پیوست ہو جاتے جیسے دیگچی سے برابر کا ڈھکنا مگر دل کی آنچ تیز ہو جاتی ہنڈیا کھدکنے لگتی ڈھکنا کھل جاتا اور پھر گرم گرم بھاپ باہر نکل پڑتی۔ "اللہ غارت کرے ——— ہائے ہائے ہائے نا گھر کا رکھا نا گھاٹ کا"۔ اور ریحانہ تلملاتی رہتی ——— "دیکھو جی ——— تم یہ سو بار کہہ چکی ہو سب کچھ کہہ چکی ہو ——— پھر اب چپ رہو خدا کے لئے چپ رہو ——— "

"کچھ تو نا بولیں ہیں دولہن ——— تم ہی تو میرا جان بچائے ہو، تم کا اپنا بال بچہ تو جہیں ہن اور کون ہے جس سے بول چال کے دل ہلکا کریں

ریحانہ کی انگلیوں میں قلم صرف کانپتا رہا۔ اُس کی نب خشک ہو چکی تھی اور سامنے سفید کاغذ بے کسی کے عالم میں دھرا تھا۔ گھر کا جھنجھٹ، ملنے والوں کا تانتا، قومی خدمات اور آنے والے رشتہ داروں کے خلوص سے آج تھوڑا سا چھٹکارا ملا تھا۔ اس کے دماغ میں کب سے ایک اچھا سا پلاٹ مچل رہا تھا وہ ایک نئے انداز سے یہ افسانہ لکھنا چاہتی تھی۔ فسادات پر افسانہ پڑھتے پڑھتے اب اسکا جی اکتا گیا تھا۔ سارے پرچوں میں بس یہی طوفانی گھٹائیں جھوم رہی تھیں اور جانے مدت سے وہ رنگین اور رومانی افسانے کن خوابوں کے سنہرے جزیروں میں جا چھپے تھے۔ اور اس پر اُسکی آنکھوں کے سامنے مصیبت کا یہ پہاڑ۔ "ائے اللہ" — اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ "رشوا — ارے کبھی ان کو چار آنے پیسے دیدیجئے" اُس نے ایک چوبی کے آڑ میں پناہ لینی چاہی — "اجی ہم پیسہ لانا آدمی ہیں جی۔ ای گھوڑا مارا بلوائی نے ایسا بنا دیہیں۔ نہ تو ہم تڑے ایسے ملتے، ایسے ہی پلنگ، ایسے جوکی، کا ہم کوئی فقیر تی ہیں؟ اب گھوڑا پٹیا بلوائی جو بنا دیتے۔ کا جانو تم — ہمرے میاں کا آٹھ سو مشاہرہ دودھ کا دھویا آٹھ سو۔ گھر کا بناد ہی دولہن گھوڑی ماری بنگالن نے اپنے میں پھنسا لیہیں۔ ہائے جنم سے کرم پھوٹا تھا۔ بیاہ ہوتے ہی ہمرے میاں کو بیگم سے بھیا کے لیگئی اہی جی — بردوان میں — آج بھی ہمرے ہیں ٹھاٹ کر رہی ہے" ریحانہ نے اپنی بیزار نگاہوں سے اسکو دیکھا ایک کھسیانی ہنسی ہنس کے بڑھیا نے اپنی آنکھیں جھکا لیں — "کا کہیں دولہن۔ کل سے کچھو نا پکا ہے۔ تم ہی بچاری تو ہیر اجان بچائے ہو۔ اور یہ دیکھو نہ ساری۔ ایری لیری ہو گئی۔ مگر کا کریں کہاں سے لادیں — اللہ تیرا بھلا کرے۔ تم ہی تو جان بچایو۔ اسکول کیمپ میں بھی ایک ٹھو ساری ملی رہے۔ اچھا کیمپ تھا۔ کمبل ملا، ساری ملی اور دونوں شام کھانا ملتا رہے۔ مگر اللہ غارت کرے دشمن کو اُس کو بھی توڑ دیہیں تب سے ہائے ہائے واز کو ترس گئے۔ نا کھانے کا ٹھکانہ نا سونے کا پڑیگا" ریحانہ سے اب اسکی باتیں سنی نہ جاسکتی تھیں، وہ کاغذ قلم دوات سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی — بیسیوں دفعہ وہ اس ریکارڈ کو بجتا ہوا سن چکی تھی۔ مگر کتنا معصوم تھا یہ ریکارڈ بھی اتنا بجنے پر بھی کہیں پر سے نہ گھسا تھا۔ "تم کہاں جا رہی ہو دولہن۔ ہم کچھو تو نا بول رہے ہیں — اُو تو موئی ڈی کا ٹا سب نے گھر سے باہر کر دیہیں"۔ اور ریحانہ کمرے کے اندر جا کر اپنے بستر پر ایک ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح گر گئی۔ آج کا دن بھی ختم ہو گیا۔ ایک ساتھ اسکو کتنے کام کرنے پڑتے تھے بیمار عزیزوں کو ڈاکٹروں کے پاس لے جانا۔ ہسپتال میں داخل کرانے کی کبین اور کوچ لینے کی کوشش کرنا، پھر آنے والے مہمانوں کیلئے مسلسل کھانا پکوانا، اور اپر سٹار کے یہاں خاندان بھر کیلئے اچھے ڈیزائن کے زیور بنوانے کا کام بھی اُسی کے سپرد تھا، بلاؤز اور جمپروں کیلئے سستے اور خوبصورت کپڑے بھی صرف وہی خرید سکتی تھی۔ ان کے علاوہ اپنے شہر بھر کی دعوتوں پر جانا ہوتا تھا، کون اسکو نہیں جانتا تھا اور وہ بڑے شوق سے تقریبوں میں شریک ہوتی، اتنے سارے لوگوں سے ایک ساتھ باتیں کرنے میں اسکو بڑا لطف آتا تھا، رنگ برنگی ٹولیاں جیسے سینوں تلاور کے تختے مہک رہے ہوں۔ قومی خدمات کا سہرا بھی اسی کے سر بندھا تھا، اچھی ہو یا بیمار مگر قوم کی خدمت زیادہ اہم تھی۔ گزشتہ سال چھ مہینے تک اس نے ریلیف کا کیا کیا کام کیا تھا۔ صبح آٹھ بجے سے ٹرک پر جو نکلتی تو بھوکی پیاسی رات کے دس بجے گھر پہونچنا نصیب ہوتا تھا اور اس پر بھی گھر میں لوگوں کے منہ سوجے رہتے تھے، "خود تو ٹرک میں گھومتی رہتی ہیں اور مہمانوں کا سیلاب ہمارے سروں پر چھوڑ دیا ہے"۔ اور ریحانہ پر جیسے بجلی گر پڑتی۔ بھوک سے چکراتی ہوئی نگاہوں کے سامنے گھناؤنے کام گھومنے لگتے، خون سے لت پت کتنی زچوں کو اُس نے درختوں کے نیچے سے اپنے ہاتھوں پر اٹھا اٹھا کر ہسپتالوں میں پہنچایا تھا۔ بدبودار سڑے ہوئے زخموں کو دھونا، مریضوں کی خبرگیری اور پھر کپڑا، تیل اور صابن بانٹنے کیلئے گلی گلی کی خاک چھاننا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اور اسپر الزام بھی اسی کے سر۔ پھر یہ اکیلی اسی کی ہمت تھی۔ جو پارہ پارہ سے کپڑوں کے مجمع ہو گئے تھے۔ پرانے ہی سہی۔ مگر ان سے غریبوں کا بدن تو چھپ سکتا تھا۔ اسکے بعد سارا سارا دن وہ رکشا پر گھومتی رہتی۔ جاننے اور ان جاننے لوگوں کے ارادوں پر بہت تھوڑے سے لوگ اسے خوش آمدید کہتے۔ بہتوں کی پیشانیوں پر شکنیں پڑ پڑ جاتیں۔ طرح طرح کے بہانے اور قسم قسم کے الزام وہ سنتی رہتی۔ پھر بھی اسکے قدم ڈگمگائے نہیں۔ مگر کہا سے برقعہ کے اندر کبھی کبھی اس کا دل بھی

دھڑک اٹھتا تھا۔ کہیں وہ آرام گاہ میں نہ بھیج دی جائے۔ مگر کسی نہ کسی طرح اس نے ان پناہ گزینوں کیلئے پانچ ہزار چندہ جمع کر ہی لیا جو اس کی نگاہوں میں نہیں اس کی روح کی گہرائیوں میں بس رہے تھے۔ اور اس پر سے یہ بڑھیا بُری طرح اسکے گلے سے چمٹ گئی تھی ——— ہائے توبہ۔ جیسے کوئی لمبا اور سوکھا ہوا کنکھجورا اپنے ہزار پیروں سے اُس کی روح میں پیوست ہو گیا ہو ——— اپنے لمبے اور سوکھے ہوئے جسم کا توازن مشکلوں سے کھڑاؤں کی سطح پر قائم کرنے میں لڑکھڑاتی ہوئی وہ ہر روز اور کبھی کبھی دن میں دو بار بھی آ جاتی اور آتے ہی اسکے قریب اپنی سوکھی ہوئی ناک سے بند ہوتی ہوئی سانس کو چھوڑنے لگتی۔ ہونہہ، ہونہہ، ہونہہ کے اور ریحانہ کے دماغ میں کنکھجورے کی ساری ٹانگیں بُری طرح چبھنے لگتیں۔ اور اسکے بعد پھر وہی رٹا ہوا بیکار ڈھول بجنے لگتا۔ اس وقت ریحانہ کا جی چاہتا کہ وہ اس گھر سے بھاگ جائے اور کئی بار ایسا ہوا بھی کہ اسکو دیکھتے ہی وہ رکشا منگا کر باہر چلی گئی۔ مگر گھنٹوں کے بعد جب واپس آتی تو وہ سراپا انتظار ابھی تک بیٹھی تھی۔ ریحانہ اسکو روپے، پیسے، کافی غلے اور ایک ساری دے چکی تھی مگر ہر روز اس کو کہاں تک دیتی رہتی اور بڑھیا کے سامنے چہرے پر غم کی کالی گھٹائیں چھا جاتیں ——— کاہیں دولہن ——— دولہن روز کا کھانا۔ تین بہن ہم سب دو تھیلی بہن لاڈ کا اور اس پر بھی ایک ٹھو بیمار۔ یہ مت جانو کہ ہم کو عزت ویسے رہی ہو ہم تیرا پائی پائی ادا کر جیگے۔ اور ریحانہ کو دم آتے آتے پھر غصہ آجاتا۔ تو کیا سارے شہر میں ایک میں ہی رہ گئی ہوں "— نانا دولہن۔ بھلا ہم تم کو بھول سکتے ہیں۔ ہم بھیک منگنی ناہیں دولہن، تم قربان بچہ ——— ہو ——— تم ہی بچاری تو ہمرا جان بچائے ہو"۔ اور ریحانہ اس بجتے ہوئے ریکارڈ کو چھوڑ کر گول کمرے میں چلی جاتی ——— ہزاروں بے گھر بھٹکتے تھے۔ مارے گئے تھے بہار کی دنیا ہی تہ و بالا ہو گئی تھی۔ مگر یہ بڑھیا اسکی زندگی میں ہر روز کیسے کیسے زلزلے پیدا کرنے کو فتنہ ہو گئی تھی۔ کبھی رحم اور خلوص کی لہریں اٹھتیں اور کبھی چڑچڑاہٹ غصہ اور نفرت کی۔ اور ریحانہ کا دل ڈوبنے لگتا۔ وہ انسانیت کیلئے لڑ رہی تھی؛ بیچاری مظلوم بے بس بڑھیا اسکے سوا کسی کو نہیں جانتی تھی۔ اور اپنی بچی سمجھ کر ہی تو اسکے یہاں آتی ہے۔ پہلے وہ اسپر مہربان تھی برابر دو دو چار چار روپے دیا کرتی ——— مگر ہر روز کی یہ لگاتار مہربانیاں کون کر سکتا ہے۔ اور ان کی ہزاروں کی جھولیاں تو کچھ خدائی فضل و کرم ہی بھر سکتا تھا۔ روپے دینا اس نے بند کر دیئے کبھی چاول کبھی آٹا اور کبھی پیسے دیدیتی۔ اور اسکے گھر میں جو بھی پکتا اسکو بھر پیٹ کھلا دیا کرتی۔ مگر وہ پیسوں کو بڑی حقارت سے لیتی اور غصے کی تلملاہٹ کے ساتھ کھانا کھاتی ——— "ہونہہ جیسے ایک ہم مسلمان تھے۔ تم آرام سے رہو۔ تمرا گھر کھڑا رہے۔ تمرے چولہا پر کھانا پکتا رہے اور ہم تمرا بھیک کھائیں۔ ہم مارے جائیں۔ ہم کاٹے جائیں۔ ہمرا خاندان بھر مٹی میں مل جائے اور بستی بھر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے کا ہے کہ بس ایک ٹھو ہم ہی لوگ تو مسلمان تھے ———" ریحانہ چپ چاپ سنتی رہتی اور باورچن کی آنکھوں سے کبھی کبھی آنسو نکل پڑتے۔ "چپ رہو ماں ——— چپ رہو۔ جو ہو گیا سو ہو گیا ——— اب کیا کیا جائے"۔ اور ریحانہ کو اس وقت اپنے سے اپنے گھر سے اور ساری دنیا سے نفرت ہو جاتی۔ یہ بڑھیا کس طرح سے اُس کی زندگی کو کھوکھلا کرتی جا رہی تھی۔ ریحانہ نے ایک دن اپنے نوکر کے ساتھ اسکو اپنی ایک سہیلی کے گھر بھیج دیا اسی کی طرح رفعت کی زندگی بھی قومی کاموں کے لئے وقف ہو چکی تھی۔ ریحانہ نے ایک خط لکھ دیا کہ ریلیف کے سیکرٹری سے دو کمبل تین ساری اور کچھ دوسرے کپڑے اس بچاری کو دلا دو۔ آخر بھرے ہوئے بند کمرے کی چیزیں بیکار رہی پڑی سڑ رہی ہیں نہ"۔ رفعت نے بہت کوشش کی۔ مگر ریلیف کے بند کمرے کی کنجی نجانے کہاں بند تھی۔ سیکرٹری نے افسوس ظاہر کیا۔ اور آخر بچاری رفعت کو اپنے پاس سے ایک کمبل اور ایک ساری دینی پڑی۔ بپھری ہوئی ندی کا دھارا اب دوسری طرف ہو گیا تھا۔ ایک ہفتہ تک ریحانہ کا جی ہلکا ہلکا لگا ——— اُس نے اپنا افسانہ لکھ لیا تھا ——— وہی بیقرار آنکھیں۔ خون سے تر آلودہ کپڑے بچوں کی دھندلی ہوئی لاشیں اور جب وہ اپنا افسانہ ختم کر چکی تو اُس نے سوچا کتنے لوگ اسکو پڑھکر تڑپ اُٹھینگے۔ سارے ہند و پاکستان کیلئے یہ ناسور کتنا اذیت ناک ہے۔ ٹھیک اسی وقت رفعت کی موٹر آگئی۔ اور اُس نے آتے ہی شور مچایا: "بڑی اچھی دوستی نبھائی ہے آپ نے ——— تھک گئی۔ ریحانہ باجی۔ دس دس چیزیں دیتے دیتے تھک گئی۔ مگر یہ سلسلہ ——— آخر کہیں پر جاکر اسکو رکنا تو چاہئے نہ۔ میں نے اپنے حصہ کا اسکو آم کھلایا شربت پلایا۔ الف سے

چھپا چھپا کر اسکو غلہ دیا۔ اپنی ایک ساڑی اور باجی کا ایک کمبل دیا۔ مگر اب تو وہ اپنی باتوں سے مجھے ہلاک کرے گی — سلمیٰ بہنیں خوب اوٹ پٹانگ بکتی ہی تھی۔ رات اپنی ایک بہن کو بھی لے آئی اور دونوں نے گیارہ بجے رات تک جو دماغ چاٹا ہے تو اللہ کی قسم سارے لوگ مجھ سے جھگڑ پڑے کہ تم بڑی اچھی دوست بنی ہیں۔ تمہاری ریحانہ باجی، اپنی مصیبت لیکے ہمارے سروں پر تھوپ دی"۔ اور ریحانہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ "اب مجبوراً دل کو سکون ملا رخصت کہ تم میری ہمدرد تو ہیں — میں تمہیں اپنی حالت کیا بتاؤں۔ بس یہی کہ کچھ دنوں کیلئے یہاں سے چلی جاؤنگی تو شاید اس طرح وہ آنا بند کرے"

"اور ریحانہ باجی آپ نے کچھ سنا بھی ہے؟ وہ بڑھیا اپنے شہر کے نواب صاحب کے گھر میں گھس گئی۔ پہلے تو اپنی شکایت پیش کی، اسکے بعد اس نے خوب خوب سنایا۔ "تم نواب ہو نہ اللہ کے ہاتھ کے بنائے ہوئے اصلی نواب — تم اپنی موٹر میں اپنے گھر بھر کو چڑھا کر بھاگ آئے اور یہاں آرام سے اپنی کوٹھی میں بیٹھے ہو، اور ہم لوگ اسی لیے مارے گئے اسی لئے لوٹے گئے کہ بس ایک ہم ہی تو مسلمان تھے۔ اور تم کچھ نہ تھے نامسلمان، بس خالی نواب صاحب اور نواب کو بھلا کون مارتا کون لوٹتا" — اور اس حقیقت کو سنکر ریحانہ کا دل سچ مچ تڑپ اٹھا۔ زندگی کی ساری نعمتیں چھننے کے بعد اتنی بے رحمی سے بچارے غریب ہی بکثرت مارے گئے تھے۔ ان بچاروں کی عیدیں بھی اجڑی ہوئی اور بے رونق سی بنیں۔ گھڑی بھر کیلئے اونچے گھرانوں کی شاندار عیدوں سیویوں اور دعوتوں کے نظاروں کے سہارے ہی تو وہ اپنی خوشیاں منا لیتے تھے۔

اُمنڈتی ہوئی ندی کے دھارے نے کروٹ بدلی، پھر وہی پرانی ریتوں پہ جوار بھاٹا اٹھنے لگا — "نگوڑی پیٹی بنگالن — اُدھی نے پھنسا لیا ہے، اور اوپر سے منڈی کا لوٹوں نے ناس دیا — اپنا گھر — اور اپنا تحصیل، کا کس دولہن۔ سنیں بن کر سرکار گھر جوا رہی ہے — مگر کون جائے بڑا ڈر لگے ہے دولہن"۔ اور یہ سنتے ہی ریحانہ بپھر جاتی "تو یہ ادھر ہی کرنے سے مر ہی جانا اچھا ہے — توبہ — توبہ۔ اتنے لوگوں کو ملا کر بستی کی بستی سنسان پڑی ہے مگر تم کو کیسے چھوڑ دیا ایک دفعہ ان کا ہاتھ اوپر اٹھ جاتا — پھر ہم سب لوگ بچ جاتے توبہ — ابھی یہی کوئی بات جو تم نے ہماری روحوں کو بھی ناپاک بنا دیا — سب کیا دھرا کارت گیا، مگر اپنی زبان سے نکلی ہوئی بات کو سنکر ریحانہ خود ہی کانپ اٹھی۔ ہائے اللہ آپ وہ کیا کرے۔

ریحانہ کے ایک عزیز نے بڑھیا پر ترس کھاتے ہوئے کہا کہ پانچ روپیہ تنخواہ اور کھانا اور کپڑا پر صرف بچہ کی نگرانی کرنے کو وہ ان کے ساتھ چلے"۔ یہ سنتے ہی اسپر دورے پڑنے لگے۔ "تم نوکر دیا پانچ روپے کی نوکری — ایک مٹھو مفت کے ہم ہی مل گئے ہیں، کٹوا کے شوا کے اب مٹی بنا لو۔ نگوڑا امنڈی کا ٹا دشمن سب۔ میرے گھر پہ بلا — اور ہم بن والی"۔ اور وہ اپنا منہ آنچل سے چھپا کے پلنگ پر لیٹ گئی۔ اب وہ بھی کرتی۔ آتی۔ دیر تک بولتی رہتی اور اپنا منہ چھپا کر پلنگ پر سو جاتی۔ وہ سوتی رہتی اور کالی کالی مکھیاں اس پر چھائی رہتیں — اور جب وہ اٹھ کر کسی کو کھانا ہوا کھینچی تو پیٹھ پھیر کر بیٹھ جاتی — کھاؤ — کھاؤ جی ہم نا دیکھ رہے نہیں"۔ اور کھانے والا یہ سنکر سٹ پٹا جاتا۔ نوالے حلق میں پھنسنے لگتے اور سر پر گھڑوں پانی پڑ جاتے —

— "تم کو بال بچہ دیجیں ہیں دولہن — تم ہی تو میرا جان بچاتے ہو"۔ وہ ہر روز چاول مانگتی، روپے اور کپڑے بھی مانگتی — مگر ایمان کتنا ہی ادنچا کیوں نہ ہو۔ ریحانہ کہاں تک دے سکتی تھی؟ — یہی ہوتا کہ جب بھی وہ آتی اسکو کھانا کھلا دیا جاتا — ایک دن وہ اکڑتی رہی — دیر تک بگڑتی رہی اور آخر میں مجبور ہو کر گڑگڑانے لگی وہ منتیں کرنے لگی کہ اسکے لیے حلق سے کھانا نہیں نگلا جائے گا اس کے گھر کے سارے لوگ کل سے بھوکے ہیں۔ مگر ریحانہ نے چار آنے پیسے دیکر اس کو کھانا کھلا دیا، چوتی آنچل کے کونہ میں باندھتی باندھتی وہ زور سے ہچکیاں ملانی۔ اور جتنا کھایا تھا سب کا سب قے کر دیا۔ برآمدہ۔ آنگن سب ہی لت پت ہو گیا اور وہ سارا دن رنگ برنگے قے کرتی رہی، آنگن سب ناس ہو گیا۔ ریحانہ کی بہنیں وقت سے بہت پہلے ہی دیکھتے دیکھتے گھومتے

(بقیہ صفحہ ۹۲ پر)

صبح صادق حمید

خدا کے بچے

سردیوں کی طویل ٹھٹھری ہوئی راتوں میں ایک ایک بوسیدہ کمبل لئے، اپنی ٹانگیں اپنے سینوں کے ساتھ لگائے وہ سکڑ سمٹ کر سخت اور کھردری زمین کے فیاض سینے پر بچھی ہوئی کھجور کی چٹائیوں پر پڑے رہتے اور جب صبح چار بجے ہی یتیم خانے کے ناظم مولوی صاحب اُن کے سرہانے سے کھنکارتے ہوئے گزرتے تو انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے اُن پر بے شمار بجلیاں ٹوٹ پڑی ہیں —

"اب جاگ بھی چکو، حرامزادو، کتے کے پِلّو —"

ہر روز باقاعدگی کے ساتھ انہی لفظوں کے ساتھ اُن سب کی صبح شروع ہوتی اور وہ لرزتے ہوئے ٹھٹھرتے ہوئے اپنے بوسیدہ کمبلوں سے نکل آتے۔ اُن کا جی چاہتا کاش اُن پر کوئی ایسی طویل رات آ جائے، جب انہیں پھر جاگنے کے لئے نہ کہا جائے، لیکن ایسی طویل رات کبھی نہ آئی۔ وہ دعائیں مانگتے رہے۔ کاش کسی روز تو انہیں گالیاں دے کر نہ جگایا جائے — لیکن اُن کی دعائیں کبھی قبول نہ ہوئیں۔ نہایت باقاعدگی کے ساتھ اُن پر بجلیاں ٹوٹ پڑتیں —

"حرامزادو، کتے کے پِلّو —"

وہ سب یوں ایک دم اُٹھ بیٹھتے جیسے انہوں نے بجلی کا تار چھو دیا ہو۔ مولوی صاحب کی غضبناک آنکھیں انہیں یوں گھورتیں جیسے انہوں نے نیند کے چند ذرّے اُن کی جیب سے چوری کر لئے ہوں، جیسے انہوں نے کوئی بہت بڑا، بہت بھیانک گناہ کیا ہو — چوروں کی طرح مولوی صاحب کی نظریں بچاتے ہوئے وہ باہر جا کر ٹھنڈے پانی کی ٹونٹیوں تلے سر رکھ دیتے اور پھر انہیں میں سے ایک کانپتا ہوا بچہ اپنے کٹکٹاتے ہوئے دانتوں کے ساتھ پکارا اُٹھتا — اللہ اکبر، اللہ اکبر — اور وہ سب اپنے بڑے رب کے سامنے سجدے میں گر جاتے، جو زمین کا مالک تھا، جو آسمانوں کا مالک تھا۔ لیکن جو شاید اس یتیم خانے کا مالک نہیں تھا، اس کے ناظم کا مالک نہیں تھا — اس کے ناظم کی ہر وقت چلنے والی چھڑی کا مالک نہیں تھا —!!

آزادی کے ساتھ ہی شیر محمد کو یتیمی مل گئی تھی، جب لوگ اپنے سفید آقاؤں سے آزاد ہوئے تو اُسے ماں باپ کی محبت سے آزاد کر دیا گیا —! آزادی سے پہلے اُس کا باپ تھا۔ جو ہر وقت اُسے کندھوں پر اُٹھائے پھرا کرتا تھا۔ گھر میں، بازار میں دوکان پر، وہ اُسے ایک پل کے لئے بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتا — اُس کی شفیق ماں تھی۔ جو اپنے اکلوتے بچے کو چومتے چومتے تھکتی نہیں تھی، جو اُسے رات بھر لوریاں دیا کرتی تھی — اُن کا گھر تھا۔ جو اُن کی مختصر سی جنت تھی۔ جہاں اُس کے قدموں تلے آنکھیں بچھائی جاتی تھیں۔ جہاں اُس کے دم سے ہر وقت رونق رہتی تھی۔

جب آزادی ملی — جب ہند و مسلم فساد ہوئے — تو پہلے اُن کی دوکان جلا دی گئی۔ کیونکہ وہ مسلمان تھے اور مسلمان پاکستان مانگتے تھے۔ اور پھر ایک رات جب اپنے ماں اور باپ کے ساتھ وہ اوپر سو رہا تھا۔ اُن کے مکان کو آگ لگا دی گئی۔ اُس نے لپکتے ہوئے شعلوں کی گرمی اور نتھنوں میں گھستا ہوا دھواں محسوس کیا۔ اُس کے بعد اُسے کچھ معلوم نہیں کہ اُس پر کیا گزری۔ اُس کے باپ کے ساتھ کیا ہوا، اُس کی شفیق ماں — اُسے

اُن کا کچھ پتہ نہ ملا۔ صرف اُس نے لوگوں سے سنا کہ وہ اپنے مکان کے ساتھ ہی جل مرے ——— پھر اُسے قافلے کے ساتھ پاکستان بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد لوگ اُسے اس بدنصیب بستی میں چھوڑ گئے۔ جہاں اُس جیسے کئی بچے تھے، جہاں ہر وقت کندھوں پر اٹھائے پھرنے والا باپ نہیں تھا، جہاں اُس کی شفیق ماں نہیں تھی ——— جہاں بڑی بڑی داڑھی والا مولوی تھا اُس کی گھورتی ہوئی آنکھیں تھیں، اُس کی بے قرار چھڑی تھی !!

دن بھر وہ روتا رہا۔ اپنے گھر جانے کی ضد کرتا رہا۔ کسی نے اُس کے سر پر تسلی کا ہاتھ تک بھی نہ پھیرا۔ وہ سارے لڑکے اُس پر ہنستے رہے ——— اُس کا مذاق اڑاتے رہے ———

"باپ بہت یاد آ رہا ہوگا بیچارے کو!"

"اور ہم جو ہیں ——" ایک بڑے سے لڑکے نے اپنی سرمئی مسوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور دوسرے سب لڑکے زور زور سے ہنس دیئے۔ وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ وہ سب کیوں ہنس رہے تھے اُس نے سوچا شاید باپ یاد آنا اچھی بات نہیں ہوتی۔

"ہمیں تو اپنی امی یاد آ رہی ہے" اُس نے بسورتے ہوئے نہایت معصومیت سے کہا۔

"ارے ——— تو مولوی صاحب جو ہیں۔" اُسی بڑے سے منحوس لڑکے نے پھر کہا۔ اور سب لڑکے اور بھی زیادہ زور سے ہنسنے لگے۔

مگر جب اچانک دروازے میں مولوی صاحب کی صورت نظر آئی۔ تو جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ قیلولہ فرماتے ہوئے اس ہنسی کے شور سے اُن کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اور اب وہ ان بچوں پر برس رہے تھے۔ جو ہنسی جیسے ناقابلِ معافی جرم کے مرتکب ہوئے تھے ———

"ارے نعیم کے بچے" اُنہوں نے بڑے سے لڑکے سے کہا۔ "یہ تو نے کیا عدالت لگا رکھی ہے ——— اور تو کیا نام ہے تیرا؟"

"جی شبیر محمد ——— " اُس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"بڑا شیر کہیں کا ——— صبح سے روتے جا رہا ہے، یہاں تیری ماں تو ہیں جو تیرے ناز نخرے سہے گی —" اور لڑکے پھر کھسکنے لگے۔

"مگر جی یہ نعیم تو کہتا تھا۔ کہ آپ ہماری ماں ہیں ——— " اُس نے معصومیت سے کہہ دیا۔

اور مولوی صاحب کو جلال آ گیا — "ادھر آ تو نعیم کے بچے اور خنزیر اب ہمیں کو لگے نشانہ بنانے ——— سؤر کے بچے ہم تیری ماں تو نہیں ہاں تیری ماں کے خصم ہو سکتے ہیں ——— حرامخور ———" اور انہوں نے اُسے دھڑا دھڑ پیٹ دیا۔

اُس کا جی چاہا وہ اُن کا ہاتھ پکڑ کر کہہ دے ——— "جناب کوئی آپ کی جیب سے تو نہیں کھاتے ہیں۔ مانگ کر لاتے ہیں تو کھاتے ہیں، بلکہ آپ کو بھی کھلاتے ہیں۔ یہ بڑی سی توند، یہ پُر نور داڑھی، یہ سرخ چہرہ ہماری مانگ کر لائی ہوئی بھیک کی بدولت ہی تو ہے ———"

مگر وہ پٹتا رہا اور کچھ نہ کہہ سکا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُسے فوراً وہاں سے نکال دیا جائیگا۔ ایک دفعہ پہلے بھی اُسے یونہی گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ رات بھر ایک مسجد میں ٹھٹھر کر اگلے روز اُسے پھر مولوی صاحب سے معافی مانگنی پڑی تھی ———

اُسے پیٹ کر مولوی صاحب چلے گئے اور وہ چپ چاپ بلبلاتا رہا ——— اور شبیر محمد سوچتا رہا کہ یہی لڑکا جو ابھی اُس پر ہنس رہا تھا اب خود رو رہا ہے ——— اُسے یہ سوچ کر بڑی الجھن ہوئی۔ اُس کا باپ تو کبھی نہیں رویا کرتا تھا ——— اُسے یاد تھا اُس کا باپ صرف ایک دفعہ اُس کے سامنے رویا تھا، اُن دنوں وہ بہت بیمار تھا۔ اُسے ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا۔ اور کئی روز سے وہ بستر پہ پڑا تھا۔ اُس کی ماں رات رات بھر اُس کے سرہانے بیٹھی رہتی اُس کا باپ بہترین ڈاکٹر لاتا رہتا۔ اُس کے پاس بیٹھا اس کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہتا، اُسے کہانیاں سناتا رہا۔ مگر بخار کی میعاد طویل پکڑتی گئی اور پھر اکتیسویں دن وہ رات بھر بے ہوش پڑا رہا۔ اُس دن بخار کی میعاد ختم ہو رہی تھی۔ اُس دن وہ زندگی اور موت کے دوراہے پر پہنچنے والا تھا ——— رات بھر ڈاکٹر اس کے پاس سے نہ ہلا، رات بھر اُس کی ماں اور باپ گڑگڑاتے رہے، دعائیں مانگتے رہے ——— پھر جب صبح کو اُس نے آنکھیں کھول دیں تو ڈاکٹر جیسے خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ اُس کی ماں کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اُس نے

اُس کے زرد و زرد گالوں کو چوم چوم کر تر کر دیا —— لیکن اُس وقت اُس کے باپ کو جانے کیا ہو گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور دیر تک روتا رہا، اُسے تب بھی بڑی الجھن ہوئی تھی۔ وہ سوچتا رہا تھا کہ تمام عرصہ جب وہ بیمار رہا، اُس کی ماں قریباً ہر وقت روتی رہی۔ اُس کا باپ ہمیشہ ہنستا رہا، اور اُسے ہنساتا رہا۔ اور اب جب وہ اچھا ہو گیا تھا، اُس کی ماں بے اندازہ خوش تھی۔ اور اُس کا باپ رو رہا تھا ——

مگر اب تو اُس کا باپ نہیں تھا اور مولوی صاحب کہتے تھے کہ اب اُس کی ماں بھی تو نہیں رہے۔ پھر اب اگر وہ بیمار ہو گیا تو اس کے پاس کون بیٹھے گا۔ اس کے لئے ڈاکٹر کون لائیگا —— وہ یہ سوچ کر اور بھی زیادہ پریشان ہو گیا، اُس کا جی چاہا وہ زور زور سے رونے لگے مگر خوف کے مارے اُس کے حلق سے آواز تک نہ نکل سکی، وہ چپ چاپ آنسو بہاتا رہا۔

پھر ایک دبلا پتلا سا لڑکا اُس کے قریب آیا اور اُس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں —— "رو نہیں شیرے بھیا! یہاں یونہی ہوتا ہے۔ چند روز ہوئے جب میں یہاں آیا تھا تو میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا" وہ اُسے تسلیاں دیتا رہا —— "یہاں ہر نئے آنے والے پر شاید یونہی ہنستے ہیں۔ تو رو نہیں —— پھر کوئی دن آئیگا جب ہم بھی نئے آنے والوں پر یونہی ہنسا کریں گے ——"

ہنسنے کے خیال سے اُسے کچھ ڈھارس ہو گئی۔ اور اُس نے آنسو پونچھ لئے۔ حیران سی نگاہوں سے وہ اُس دُبلے سے لڑکے کو دیکھنے لگا جیسے اُسے اُس کی باتوں پر یقین نہ آ رہا ہو جیسے وہ اُس سے پوچھ رہا ہو، کیا ہم سچ مچ یہاں ہنسا کریں گے؟ —— اور یہ مولوی صاحب جو ابھی نعیم کو پیٹ کر گئے ہیں۔ یہ ہماری ہنسی کیسے برداشت کر سکینگے —— ؟ نہیں یہ کیسے ہو سکے گا، ہم نہیں ہنسیں گے، ہم پٹنے کے لئے نہیں ہنسیں گے —— دیر تک وہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ دبلے سے لڑکے نے اُسے بتایا کہ وہ پنجابی تھا۔ اُس کے ماں باپ کہو، بلوے میں مارے گئے تھے۔ وہ قافلے کے ساتھ یہاں پہنچ گیا تھا اور کیمپ سے اُسے یہاں بھیجوا دیا گیا تھا۔ پہلے پہل وہ بھی روتا تھا، اُسے بھی اپنے ماں باپ اور اپنا گھر یاد آتا تھا، اُس پر بھی وہ لڑکے یونہی ہنستے تھے۔ پھر وہ سب بھول بھال گیا۔ کیونکہ اُسے اور بہت سی نئی باتیں یاد کرنی پڑیں۔ اور وہ اُسے تسلی دیتا رہا۔ کہ وہ بھی سب کچھ یونہی بھول جائیگا۔ کیونکہ اُسے بھی بہت سی باتیں یاد کرنی پڑینگی۔

شام کو سب لڑکے مصروف ہو گئے۔ کچھ برتن مانجھنے لگے کچھ جھاڑو دینے لگے، کچھ کھانا پکانے لگے۔ کچھ مولوی صاحب کا کام کرنے اُن کے گھر چلے گئے۔ اُسے بھی پہلے روز مولوی صاحب کے ہاں بھیجا گیا۔ کیونکہ وہ کوئی اور کام نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے مولوی صاحب کا چھوٹا بچہ کھلانے کی ڈیوٹی مل گئی —— جب وہ اُن کے ہاں گیا تو مولوی صاحب کی بیوی اپنے خادموں میں ایک نئے خادم کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی، نہ جانے کیوں اُسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اُس کی ماں اُسے چوم رہی ہو! مگر جب اُس کے لٹکتے ہوئے بازوؤں میں ایک بوجھل سا بچہ تھما دیا گیا تو اُسے محسوس ہوا کہ اُسے محض دھوکہ ہوا تھا —— کافی دیر تک وہ اُسے اٹھائے پھرتا رہا پہلے کبھی اُس نے اتنا بوجھ نہیں اٹھایا تھا۔ اور اب اُس کی باہیں تھک کر چور ہو گئی تھیں۔ کبھی اس بازو پر، کبھی اس پر، کبھی کندھے کے ساتھ لگائے وہ اُسے لئے پھرتا رہا اور پھر وہ مولوی صاحب کی بیوی کے پاس گڑگڑا آیا ——

"جی —— میں تھک گیا ہوں ——"

"او نی! تو نے کونسا پہاڑ اٹھا رکھا ہے لونڈے ـ"

"ارے حرامزادے کیا مفت کی کھانے لگا یہاں" مولوی صاحب نے اُس کے کان اینٹھ دیئے: "لے جاؤ باہر اس باپ کو ——" اور وہ اپنی بھیگی ہوئی حیران نگاہوں سے اپنے تیسرے باپ کو دیکھتا باہر چلا گیا۔

دیر گئے اُسے وہاں سے چھٹی ملی۔ جب وہ واپس پہنچا تو سب لڑکے اپنی مٹی کی پیالیاں لئے کھانا کھانے جا رہے تھے۔ اُسے بھی ایک ایسی ہی پیالی مل گئی۔ اور وہ اُن سب کے ساتھ باورچی خانے میں چلا گیا۔ ایک قطار بنا کر وہ سب وہاں زمین پر بیٹھ گئے۔ پھر انہی پیالیوں میں دال کے چھلکے کا شوربہ اور گندم اور چنے ملے آٹے کی ایک ایک روٹی دے دی گئی۔ اور وہ

سب اس پر ٹوٹ پڑے۔ اُس سے ایک لقمہ بھی نہ کھایا گیا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا دوسرے لڑکوں کو دیکھتا رہا۔ چند لقموں میں اپنی اپنی روٹی ختم کر کے وہ پیالیوں کو چاٹتے رہے، اپنی انگلیوں کو چاٹتے رہے اور حریص نظروں سے شوربے کے دیگچے کو دیکھتے رہے اُن روٹیوں کو دیکھتے رہے جو اُن سے چند قدم کے فاصلے پر رکھی تھیں۔ لیکن جن کو مانگنے کی اُن میں سے کسی کو بھی ہمت نہیں تھی —— اور اُسے بے ساختہ وہ کتے یاد آ گئے جو ہر شام اُن کے دروازے پر اکٹھے ہو جایا کرتے تھے، جنہیں دن بھر کی بچی کچھی روٹی کے ٹکڑے اور ہڈیاں ڈال دی جاتی تھیں اور اس سے پہلے کہ وہ مزید مطالبہ کریں انہیں مار کر بھگا دیا جاتا تھا — !!

پھر وہ سب ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور بالکل مشین کے پرزوں کی طرح انہوں نے روز کی رٹی رٹائی دعا مانگی، اپنے بڑے رب کی تعریف کی اور خالی پیالوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامے وہ یہ سوچتے ہوئے باہر نکل آئے کہ بارہ گھنٹے کا طویل عرصہ کیسے گزرے گا۔ جب انہیں پھر کھانے کو ملیگا —— !!

سونے سے پہلے جب اُس نے اپنے بستر کے متعلق پوچھا تو ایک بار پھر سب لڑکے ہنسنے لگے ——

"تمہارے ابا جان نے یہاں کوئی پلنگ نہیں بھیجا ہے"

"یہ تو یتیم خانہ ہے بھیا! تم کسی ہوٹل میں کیوں نہ چلے گئے"

"راستہ بھول گیا ہوگا بیچارہ!"

سب لڑکے ہنستے رہے اور وہ حیران ہو کر سوچتا رہا کہ یہ یتیم خانہ کیا ہوتا ہے —— وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا، تو کیا یہاں سویا نہیں کرتے، راتیں جاگ کے ہی کاٹتے ہیں — نہیں سوتے تو ہونگے، مگر ان کی چارپائیاں کہاں ہیں، ان کے بستر کہاں ہیں؟ —— پھر، پھر —— اور اُسے اُس کے دُبلے پتلے دوست نے بتایا کہ یہاں بستر نہیں ہوتے، یہاں چارپائیاں بھی نہیں ہوتیں کیونکہ اُن ہنسنے والے لڑکوں نے کہا تھا ناکہ یہ یتیم خانہ ہے —— یہاں پھٹے ہوئے کمبل اوڑھ کر اُن زمین پر بچھی ہوئی کھجور کی چٹائیوں پر سوتے ہیں —— یہ کوئی ہوٹل تو نہیں ہے نا —— !!

وہ دن بھر سے بھوکا تھا، پھر اُسے زمین پر سونا پڑا۔ رات بھر اُسے نیند نہیں آئی۔ بہت دیر تک وہ اپنے دوست سے باتیں کرتا رہا۔ دوسرے تمام لڑکے لیٹتے ہی سو گئے وہ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر اُس کا دوست بھی سو گیا اور وہ اکیلا پڑا کمرے میں چاند کی روشنی کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا، بہت سی باتیں، جو اُس کے ننھے دماغ میں کچھ عجیب طریقے سے الجھ گئی تھیں —— پھر آہستہ آہستہ رات زیادہ سرد ہوتی گئی اور پھٹے پرانے کمبل میں اُس کی ٹانگیں سکڑتی گئیں اور بہت رات گئے اُس کی آنکھ لگ گئی۔

اُسے عجیب سے خواب آتے رہے، اُس نے دیکھا کہ مولوی صاحب اُس کے باپ کو پیٹ رہے ہیں اور وہ رو رہا ہے۔ وہ اُس سے پوچھتا رہا —— "ابا تم پہلے تو نہیں رویا کرتے تھے؟" وہ اُسے کہتا رہا —— "نہیں بیٹا اب مسکراہٹیں ختم ہو گئی ہیں، تم ہنسا کرتے تھے تو میں بھی ہنستا تھا اب تم رویا کرو گے تو میں کیسے ہنس سکونگا —— نہیں اب ہنسی ختم ہو چکی ہے —— اب رونا ہی رونا باقی رہ گیا ہے ——" پھر اُس نے دیکھا اُس کی امی اُسے چومنا چاہتی ہے۔ مگر نزدیک ہو کر جیسے اُس نے اُس پر پہاڑ رکھ دیا، پھر وہ پہاڑ آہستہ آہستہ اُس کا باپ بن گیا —— اُس نے محسوس کیا، جیسے اُس کی بانہیں ٹوٹی جا رہی ہوں، جیسے اُس کا جسم تھک کے چور ہو گیا ہو —— پھر اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کے سرہانے بجلی ٹوٹ پڑی ہو ایک دم سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اُس کا سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اُس کی گردن کی رگوں میں، کندھوں میں، کمر میں ہر جگہ شدید اکڑاہٹ اور درد تھا۔ اُس نے اپنے کمبل کے کونے سے جھانک کر دیکھا۔ سب لڑکے اٹھ کھڑے ہوئے تھے چاند کی روشنی اب اندر نہیں آ رہی تھی۔ اور باہر ابھی کافی اندھیرا تھا۔ اُس کا جی چاہا وہ پھر سے سو جائے مگر اُس کے پاس لیٹے ہوئے اُس کے دوست نے اُسے جگا دیا —— "ارے۔ سب لوگ جاگ چکے ہیں۔ مولوی صاحب سے خواہ مخواہ پٹ جاؤ گے —— اٹھو جلدی سے ——" اور مولوی صاحب

کا نام سن کر اُس کی نیند جاتی رہی۔ جلدی سے اپنا کمبل سمیٹ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ سب لڑکے نہانے کے لئے چلے گئے۔ اُسے بھی جانا پڑا۔ ٹھنڈے یخ پانی کے نیچے اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کا سر جم گیا ہو۔ جیسے اُس کی گردن اور کمر کے اکڑے ہوئے پٹھے ٹوٹ رہے ہوں۔ وہ سب کٹکٹاتے ہوئے دانتوں کے ساتھ اپنے بڑے رب کے سامنے سجدوں میں گر گئے۔ اُسے نماز نہیں آتی تھی لیکن اُسے مولوی صاحب کے حکم سے دوسرے لڑکوں کے پیچھے پیچھے اٹھک بیٹھک تو کرنی ہی پڑی —— وہ اپنے بڑے رب کو نہیں مولوی صاحب کی بیقرار چھڑی کو سجدے کرتا رہا جو اس چار دیواری میں اس کے بڑے رب سے بھی بڑی تھی —— !!

نماز سے فارغ ہو کر وہ سب واپس آ گئے اور باہر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ ایک ایک کپڑے کے تھیلے میں اُن میں سے ہر ایک کو یتیم خانے کے اشتہار، شیشے کے فریموں میں جڑی ہوئی قوم کے نام اپیلیں، چندہ لکھنے والے رجسٹر مل گئے۔ پھر مولوی صاحب نے اُن سب کو علیحدہ علیحدہ ٹھکانے بتا دیئے۔ جہاں انہیں جانا تھا ——

"دیکھو تم کرشن نگر جاؤ، اور تم نعیم! —— تم اسٹیشن پر جاؤ —— اور تم ماڈل ٹاؤن —— ! —— "

وہ سب اپنے تھیلے اپنے کندھوں پر ڈالے ہوئے چلے گئے —— وہاں باقی صرف شیر محمد رہ گیا۔ اُس کا دوست رہ گیا اور کچھ دوسرے لڑکے جو ابھی نئے آئے تھے اور جنہیں ابھی مانگنا نہیں آتا تھا —— اُسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ سب لڑکے کہاں جا رہے تھے۔ اس لئے وہ سوچ رہا تھا کہ شاید اُن سب کو ہی بھیجا جائیگا۔ مگر جب دوسرے لڑکوں کو اُن کے ٹھکانے بتاتے ہوئے مولوی صاحب کی گھومتی ہوئی انگلی انہیں چھوڑ کر اگلے لڑکوں کی طرف جا ٹھہری۔ تو اُس کے دوست نے اسے بتایا کہ وہ سب لڑکے یتیم خانے کے لئے چندہ مانگنے جا رہے تھے اور اس لئے اُن کو ابھی نہیں بھیجا جائیگا۔ کیونکہ انہیں مانگنے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا —— اور مولوی صاحب کہتے تھے کہ مانگنا بہت ڈھنگ کی چیز ہے —— !! اُس نے اُسے بتایا کہ ان لڑکوں کے جانے کے بعد مولوی صاحب اُن کو مانگنے کا ڈھنگ سکھایا کرتے ہیں اور جب وہ بھی سیکھ جائینگے، تو وہ بھی باہر جایا کریں گے ——

اور اس باہر جانے کے خیال سے ہی انہیں اتنی امید، اتنی راحت ہوتی جیسے کسی عمر بھر کے قیدی کو اچانک اُس کی رہائی کی تاریخ بتا دی جائے —— تو پھر وہ بھی باہر جایا کریں گے ؟ —— وہ بھی اس سنگین چار دیواری کے منحوس سائے سے نکل کر کھلے نیلے آسمان تلے پھر سکیں گے —— ؟ کیا وہ بھی مولوی صاحب کی ہمیشہ ہلنے والی چھڑی کی زد سے باہر جا سکیں گے —— ؟ اور اُن کے دل دھڑکتے —— ہاں! ہاں!! ہاں!!! وہ دن جلد آنے والا ہے، انہیں اعتبار نہ آتا جیسے اُن کے اندر کوئی بیٹھا ہوا زور زور سے چیخ رہا ہو —— نہیں! نہیں!! نہیں!!! —— وہ دن کبھی نہیں آئیگا ——

جب باہر جانے والے سب لڑکے چلے گئے تو نئے آنے والے سب بچے مولوی صاحب کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور پھر انہیں یہ لافانی گیت سکھایا گیا۔

"ماواں ہوندیاں ٹھنڈیاں چھاواں ——"

ایک لڑکا بلند آواز سے گاتا رہا۔ باقی سب اُس کے پیچھے پیچھے دہراتے رہے۔ مولوی صاحب کی چھڑی تال دیتی رہی ——

"شاباش! میرے بچو —— ذرا لہک کر گاؤ —— ہاں! گلے میں ایسا درد پیدا کرو کہ تمہارے بول سننے والوں کے دلوں میں اُتر جائیں —— "

معصوم بچے بغیر یہ جانے کہ وہ کیا گا رہے ہیں لہک لہک کر گاتے رہے۔ اپنے گلے میں سوز پیدا کرتے رہے —— جیسے بے شمار کوئلیں آم کے جھنڈوں میں کوک رہی ہوں —— اور مولوی صاحب کی چھڑی زور زور سے ہلتی رہی اور اُن کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا ——

"ہاں! ایسے، بالکل ایسے —— گاتے گاتے آنکھوں میں کچھ آنسو آ جائیں۔ جنہیں دیکھ کر پتھر کے کلیجے بھی اپنی جگہ پہ

قائم نہ رہ سکیں — چہروں پر ذرا مایوسی طاری ہو جائے جسے دیکھ کر بچوں والوں کے دل کانپ جائیں — اور اپنا گیت ختم کر کے یوں اُن کے سامنے ہاتھ پھیلا کر بڑھو — ایک ہاتھ ذرا آگے، ایک ذرا پیچھے اور اُن کے سامنے بچھتے چلے جاؤ۔ جناب خدا کے نام پر۔ رسول کے نام پر کچھ دیجئے — اپنے بچوں کی خیرات کچھ دیجئے — یتیم خانے کی امداد فرمائیے!"

اور معصوم بچے دہراتے رہے — "جناب خدا کے نام پر، جناب رسول کی خیرات کچھ دیجئے —"

"خبیثو! رسول کی خیرات نہیں —" مولوی صاحب بگڑ گئے۔ "بچوں کی خیرات کچھ دیجئے —"

وہ پھر جلدی جلدی دہرانے لگے: "جناب خدا کے نام پر جناب رسول کے نام پر کچھ دیجئے — اپنے بچوں کی خیرات —"

"شاباش! تم سب کتنے لائق ہو!! تم بہت جلد سب کچھ سیکھ جاؤ گے، تم پر خدا کا سایہ ہے — تم سب خدا کے بچے ہو!— کوئی بھی تم سے اپنی جیب بچا کر نہیں لے جا سکتا — اور اگر کوئی ٹس سے مس نہ ہو تو گلے میں ذرا اور رقت پیدا کر دو، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگا دو اور کوئی دوسرا گیت شروع کر دو — ہاتھ پھیلا کر پھر اُن کے آگے بڑھو اور تم کبھی ناکام نہیں لوٹو گے — مگر یاد رکھو اجلے اجلے کپڑوں والے بابوؤں کے سامنے کبھی وقت ضائع نہ کرو، اُن کی جیبوں میں کبھی کچھ نہیں ہوتا — دھوتیاں باندھے ہوئے سیدھے سادھے دیہاتیوں کے پاس دل بھی ہوتا ہے اور خدا کا خوف بھی اور اُن کی دھوتیوں کے پلو بابوؤں کی جیبوں سے بہت بھاری ہوتے ہیں۔ اُن سے ضرور مانگا کرو اور میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تاجروں سے، نھنڈے دل والی ماؤں سے، بے اولاد بابیوں سے اور ہاں — نئے بیاہے ہوئے جوڑوں سے، ان سے تمہیں کبھی انکار نہیں ملے گا —"

دن بھر وہ یہ لکچر سنتے رہے، یاد کرتے رہے۔ مولوی صاحب اُن کی پیٹھ ٹھونکتے رہے، انہیں شاباش دیتے رہے، انہیں ایک شاندار مستقبل کے سبز باغ دکھاتے رہے، انہیں ڈراتے رہے، دھمکاتے رہے — "دیکھو! یہ خیرات کے پیسے خدا کے پیسے ہوتے ہیں، ان پیسوں میں سے جو ذرا بھی ادھر ادھر کریگا وہ روسیاہ ہو گا۔ حق تعالیٰ اُس پر دین و دنیا دونوں میں عذاب نازل کرینگے، اُسے دوزخ میں پھینک دینگے —"

اور اُن کے ننھے دماغ عذاب اور دوزخ کا نام سن کر ہی کانپتے رہے۔

جب شام کے سائے گہرے ہو گئے تو باہر بھیجے ہوئے لڑکے ایک ایک کر کے آنے لگے۔ وہ باری باری اپنے رجسٹر اور اپنے مانگے ہوئے پیسے مولوی صاحب کے سامنے لا کر رکھتے گئے اُن میں کئی بہت کچھ لائے تھے۔ کئی صرف چند آنے لائے تھے۔ ایک لڑکا آنسو بہاتا ہوا خالی ہاتھ آیا تھا — مولوی صاحب اُن کے رجسٹر دیکھتے رہے، سکّوں کو بجا بجا کر نچا نچا کر دیکھتے رہے۔

"یہ روپیہ تو کھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ حرامزادے آنکھیں نہیں ہیں تیرے پاس —"

"اور یہ نوٹ؟ سارا تیل میں بھیگا ہوا ہے — کون لے گا اسے؟"

جو بہت کچھ لائے تھے انہیں تھپکیاں دی گئیں، جو چند آنے لائے تھے انہیں قہر آلود نظروں سے آنکھوں سے دور ہو جانے کا حکم دیا گیا، جو بچہ خالی ہاتھ آیا تھا اُس پر مولوی صاحب برسے اور اُن کی چھڑی بھی —

"خنزیر کے بچے بتا کہاں پھینک آیا ہے؟ — بول کیا کھا نا رہا ہے آج؟ بتا — میں تیرے پیٹ سے نکال لونگا۔ بول"

وہ پٹتا رہا، روتا رہا۔ تب شیرے اور اُس کے دوستوں نے محسوس کیا کہ مولوی صاحب کی چھڑی نیلے آسمانوں سے پرے تک پھیلی ہوئی ہے۔ جس کی زد سے شاید وہ کبھی بھی نہیں نکل سکیں گے۔

تھک کر مولوی صاحب نے چھڑی رکھ دی — "تو یوں نہیں بتائیگا خبیث، اچھا رات کو تیرا کھانا بند —" اور سارے پیسے ایک رومال میں باندھ کر وہ اپنے گھر کے اندر چلے گئے حسرت بھری نگاہوں سے سبھی انہیں جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ انہیں یوں محسوس ہوتا رہا۔ جیسے وہ اُس چھوٹے سے رومال میں اُن

سب کو، اُن کی روحوں کو، اُن کی زندگیوں کو باندھے لئے جا رہے ہوں۔ مگر اُن میں سے کسی کو ہمت نہ ہو سکی کہ وہ ان سے کہیں کہ یہ آپ ہماری دن بھر کی محنت کہاں لئے جاتے ہیں، یہ ہم آپ کے لئے تو نہیں مانگ کر لائے ہیں۔ اور نہ آپ کی بیوی کے لئے جس کے جسم پر سونے کا وزن بڑھتا جا رہا ہے۔ اور نہ آپ کے بچوں کے لئے جو —— مگر وہ اُف تک نہ کر سکے۔ چپ چاپ بے بسی کے ساتھ وہ مولوی صاحب کو جاتے ہوتے دیکھتے رہے

کتنے ہی روز ایسے ہی گزر گئے۔ مولوی صاحب کی گالیوں کے ساتھ اُن کی صبح شروع ہوتی، دن بھر وہ اُسی چکر میں سے گزرتے رہتے۔ باہر جانے والے لڑکے اپنے اپنے علاقوں کو چلے جاتے۔ دوسرے دن کو مولوی صاحب نئے گیت سکھاتے، انہیں مانگنے کے ڈھنگ بتاتے۔ دن بھر یونہی گزر جاتا، پھر لڑکے باہر سے لوٹ آتے، بعض کی پیٹھ تھپکی جاتی، بعض کو گھورا جاتا۔ باقیوں کے پیٹ سے کھائی ہوئی چیزیں نکالنے کی دھمکی دی جاتی، اُن کا کھانا بند کیا جاتا —— اور مولوی صاحب رومال باندھ کر گھر چلے جاتے

یہ چکر یونہی چلتا رہا۔ پھر نئے لڑکوں کو بھی باہر بھیجا جانے لگا۔ مگر اکیلے نہیں کیونکہ وہ ابھی قابلِ اعتبار نہیں تھے۔ ایک ایک بڑے لڑکے کی نگرانی میں انہیں بھیجا جاتا۔ شیرے کو پہلے پہل اسٹیشن پر جانا پڑا۔

"صاحب خدا کے نام پر —— جناب رسول کے نام پر کچھ دیجیے ——" اس نے ایک بابو کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے۔

"ارے! بھیک کیوں مانگتا ہے —— ؟"

"جی —— جی یتیم خانے کے لئے، مولوی صاحب کے لئے۔"

"تیرے مولوی کی —— چل بھاگ" اُس نے اُس کے کان اینٹھ لئے، تب اُسے یاد آیا کہ اس نے غلطی کی تھی۔ مولوی صاحب نے بتایا تو تھا کہ ایسے بابوؤں سے کچھ نہ مانگا کرو۔ اُس کے بعد اُس نے پھر کبھی بابوؤں سے نہیں مانگا۔

مگر ایک دفعہ پھر اُسے ایک بابو کے سامنے ہی ہاتھ پھیلانا پڑے۔ اب اُسے اکیلا باہر بھیجا جاتا تھا۔ ہر روز جوں توں کر کے اُسے چند آنے کہیں نہ کہیں سے مل ہی جاتے تھے۔ مگر اُس روز صبح سے مارا مارا پھرنے کے باوجود اُسے کہیں سے ایک آنہ بھی نہیں ملا تھا۔ وہ ہر ایک کے سامنے رویا تھا، گڑگڑایا تھا مگر کسی کا دل نہیں پسیجا تھا اور اب جوں جوں سورج ڈوب رہا تھا۔ اُس کا دل بھی ڈوبا جا رہا تھا۔ سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ واپس جانے کا وقت قریب آ رہا تھا اور اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے مولوی صاحب کی چھڑی اس نیلے آسمان پر چھائی جا رہی ہو —— جیسے اُس کے خالی پیٹ میں کھائی ہوئی چیزیں نکالنے کے لئے ہاتھ ڈالا جا رہا ہو —— اور اُس کے قدم پیچھے مڑنے کی بجائے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ جیسے اُسے کوئی غیر مرئی طاقت دھکیلے جا رہی ہو ——

اُس نے سوچا وہ کسی محلے کی طرف کیوں نہ چلا جائے شاید وہاں لوگ اس پر کچھ رحم کر سکیں —— شاید —— اور اُس کے قدم خود بخود اُسی طرف مڑ گئے۔ ایک گلی میں جا کر ایک جلتے ہوئے مکان کے سامنے وہ ٹھٹک گیا۔ ایک تاریک سی کھولی کے سامنے ایک عجیب سا بابو کھڑا تھا۔ اُس کا کرخت چہرہ اور کالا سا رنگ دیکھ کر اُسے خوف آنے لگا۔ مگر اُسے ڈوبتا ہوا سورج اور مولوی صاحب کی چھڑی یاد آ گئی اور اُس نے اُسی کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے ——

"یتیم خانے کیلئے کچھ چندہ دیجیے —— یتیم بچوں ——"

"ارے ہاں! کیوں نہیں دینگے —— اندر آؤ —— تمہیں پیار بھی دینگے —— یتیم خانے کیلئے چندہ بھی دینگے ——"

اور معصوم بچہ بغیر کچھ سوچے سمجھے، اندر چلا گیا۔ بابو کچھ عجیب طرح سے ہنسا اور کھولی کا دروازہ بند ہو گیا۔ ساری فضا شرم کے مارے تاریکی میں ڈوب گئی

جب وہ یتیم خانے واپس پہنچا تو ہر طرف اندھیرا چھا چکا تھا، جب اُس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے مولوی صاحب کی ہتھیلی پر چاندی کا ایک چمکتا ہوا روپیہ رکھ دیا تو اُن کے چہرے سے سارا غصہ بھاگ گیا —— محبت سے انہوں نے اُسے گود میں اٹھا کر چوم لیا۔ ہر روز چندہ لاتے لاتے وہ پہلی مرتبہ ایک روپیہ لیکر آیا تھا ——!!

پرتھوی ناتھ شرما

چٹان کے نیچے

سارا محلہ سو چکا تھا۔ لیکن اندرا اکتاہٹ اور افسردگی سی محسوس کرنے کے باوجود امتحان کی کاپیوں کے صفحات پلٹنے اور سرخ پنسل سے نمبر لگانے میں مشغول تھی۔ میز پر لالٹین رکھی تھی اور پرچوں کا انبار لگا تھا۔ اُن پرچوں میں تیرہ چودہ سال کی لڑکیوں کی ذہنی کاوشوں کے نمونے پھیلے ہوئے تھے۔ اندرا اُن تیرہ چودہ سال کی لڑکیوں کے مستقبل اور اپنے ماضی اور حال میں اس طرح کھو گئی تھی کہ پرچوں پر نمبر لگانے کا کام محض ایک مشینی حرکت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ فرق اتنا تھا کہ اُن معصوم طالب علموں کا بوجھ ابھی ہلکا پھلکا تھا۔ اور اندرا کا بوجھ — اُف! ماں باپ سے بغاوت اور ملازمت اختیار کر کے آزادانہ زندگی بسر کرنے کے باوجود بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ سات آٹھ سال پہلے جو بوجھ صرف ایک ہلکا سا پتھر محسوس ہوتا تھا۔ اب ایک عظیم چٹان بن گیا تھا اور بوجھ کے نیچے وہ اس طرح دب گئی تھی کہ رہائی پانا ایک ناممکن بات معلوم ہوتی تھی۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ کتوں نے بھونکنا بند کر دیا تھا۔ آدمی سو چکے تھے۔ اور مائیں اپنے بچوں کو اپنے پہلوؤں سے چمٹائے محوِ خواب تھیں۔ اُن عورتوں کو صدیوں کی غلامی اور محکومیت کے باوجود ایک چیز تو نصیب تھی۔ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو اپنے مرجھائے ہوئے سینوں سے لگا کر سلانے کا اطمینان — اور اندرا وہ صدیوں کی غلامی اور محکومیت کا شکار ہونے کے باوجود جگر کے ٹکڑے کو کلیجے سے لگانے کے اطمینان سے محروم تھی۔ اور وہ بیوہ بھی نہیں تھی۔ بیوہ ہوتی تو شاید اُس کا راستہ صاف ہوتا۔ اور وہ کبھی کی پرانے راستوں کو چھوڑ کر نئے راستے پر گامزن ہو چکی ہوتی اور اس طرح گلے سڑے سے مکان میں اپنا دماغ بیچ کر اپنی محرومی کا سایہ اُن معصوم لڑکیوں کی طرف نفرت بھری نگاہ سے دیکھنے کے عمل سے نہ ڈالتی۔ آخر اُن معصوم بچیوں کا قصور کیا تھا۔ جو وہ اکثر کلاس روم میں بیٹھے بیٹھے اپنے ظلم کا غلط بدلہ لینے کے لئے سوچتی رہتی تھی: کیا ہی اچھا ہو۔ جو یہ لڑکیاں میری مانند نامراد زندگی بسر کریں — ان کے دل میں میرے جیسے چوڑے چوڑے زخم ہوں —" نہیں! اسے اُن معصوم بچیوں کے بارے میں اتنے سخت خیال دل میں نہیں لانے چاہئیں۔ وہ بھولے بھالے پودے تو باغوں میں نشوونما پا کر پھلنے پھولنے اور مسکرانے کیلئے پیدا ہوئے ہیں۔ پرماتما کرے۔ بچیوں کو اتنی ہمت نصیب ہو کہ وہ سماج کی بندشوں کو توڑ کر صحت مند اور صالح زندگی گزار سکیں اور اُن چٹانوں کو اکھاڑ پھینکیں جو عورتوں کے ذہنوں پر مسلط ہیں۔

اندرا نے کاپیاں دیکھنے کا کام چھوڑ دیا۔ اور اُس کی نظر ایک مایوس مالی کی مانند اپنے جسم کے زرد مرجھائے ہوئے پودے پر جم کر رہ گئی وہ اب اپنے آپ پر ہنس بھی تو نہیں سکتی تھی۔ وہ عورت تھی اور اس نے زندگی کی بتیس بہاریں گزار دی تھیں۔ اور عام معیار کے مطابق وہ ختم ہو چکی تھی۔ اور اُس کے ماں باپ زندہ تھے۔ خاوند زندہ تھا۔ ہاں۔ اور وہ مر چکی تھی۔ وہ زندگی کے بارے میں سوچ تک نہیں سکتی تھی۔ ماں باپ نے اُسے پیدا کیا تھا۔ اور انہوں نے اُسے ٹھنڈے بے حس ہاتھوں سے قتل کر ڈالا تھا۔ وہ لاش تھی۔ اُسے ماں باپ نے قتل کر دیا تھا۔ اور ماں باپ چٹان بن کر اس کی لاش پر جمے ہوئے تھے۔

اُسے اپنے مائکے سے آئے ہوئے چار سال ہو چکے تھے۔ لیکن اتنی دُور بیٹھے ہوئے اور لڑکیوں کے سکول میں پڑھانے کا کام کر کے

باوجود۔ ماں ایک سخت چٹان تھی۔ اور باپ بھی ایک چٹان تھا۔ اور وہ اگر اور وہ چپی جاتے۔ جب بھی وہ چٹانیں ہٹنے کا نام لینے والی نہیں تھیں۔ اُن کو صدیوں کی روایتوں نے بنایا تھا تا۔ اور ان سخت چٹانوں کے ہٹنے کا خیال تک بھی کتنا روح فرسا اور مشکل تھا۔

اندرا نے تھک کر میز کے سہارے سر رکھ دیا اور سونا چاہا۔ لیکن وہ سو نہ سکی۔ اور سوچتی ہی رہی۔

* * * * * * * * * * * *

اندرا کا بیاہ اکیسویں سال میں ہوا تھا۔ ماں باپ سخت پریشان تھے۔ اور ماں اکثر اپنی سہیلیوں سے کہتی رہتی تھی۔ کہ لڑکی کی گرہ بہت سخت ہیں۔ کوئی بر نہیں ملتا۔ بر ملتا ہے تو گھر نہیں ٹھیک ملتا۔ اور گھر ٹھیک ملتا ہے تو بر ٹھیک نہیں ملتا۔ اندرا کے بھاگ پھوٹ گئے ہیں۔ لڑکی خاندان کی عزت رکھ سکے گی یا نہیں۔ جیسے جیسے کنوارپن کے دن بڑھتے ہیں۔ میرے سینے پر سانپ سے لوٹ جاتے ہیں، ... ہاں! وہ اپنی ماں کے سینے پر سانپ بن کر لوٹ رہی تھی۔ کیونکہ اُس کی گرہ سخت تھی۔ اندرا نے ایک بار کچے دماغ والی لڑکیوں کی مانند سوچا کہ کیوں نہ وہ بجائے سانپ بن کر ماں کی چھاتی پر لوٹنے کے دھرتی پر موت کی سرد چادر اوڑھ کر سو جائے۔ تاکہ ماں باپ کی عزت رہ جائے اور گرہیں کھل جائیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ اُس کے خیالات حقیقت کا جامہ پہن سکیں۔ اُس کا رشتہ ایک غریب گھرانے میں طے ہو گیا۔ لڑکے کی عمر چھبیس سال کی تھی۔ اور وہ پینتیس روپیہ ماہوار کا کلرک تھا۔ ماں نے بہت ناک بھوں چڑھائی۔ لیکن باپ نے اُس کو عزت اور لڑکی کی بڑھتی ہوئی عمر کا حوالہ دیکر راضی کر لیا۔ اور اندرا کی شادی غریب، سادہ اور سماج کے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے رام ناتھ سے ہو گئی۔

رام ناتھ ایک نہایت شریف آدمی تھا۔ اُس کا قصور صرف ایک تھا کہ وہ غریب تھا۔ اُس کے ماں باپ غریب تھے۔ اُسکے ماں باپ غریب ہوتے ہوئے ضمیر فروش انسان نہیں تھے۔ اُنہوں نے سخت زندگی گذاری تھی۔ اور رام ناتھ بھی سخت زندگی گزارنے کا عادی تھا۔ اُس نے بیوی کو سارا حال سنا دیا۔ میں نے تمہارے باپ سے بہت کہا کہ صاحب سوچ وچار سے کام لیجئے۔ میں غریب آدمی ہوں۔ آپ کی لڑکی کو آرام نہیں پہنچا سکونگا میرے پاس تو صرف سوکھی روٹی اور گاڑھے کے موٹے کپڑے ہی ہیں۔ لیکن تمہارے والد صاحب نے بہت زور دیا۔ اب اگر کوئی بات پیدا ہو تو اندرا تم مجھے قصوروار نہ ٹھہرانا۔

اندرا نے اپنے خاوند کے آخری جذباتی فقرے کو دل کی گہرائی میں اترتا ہوا محسوس کیا۔ ماں کے لئے وہ سانپ تھی۔ جو ہر لحظہ اور ہر عمر سینے پر لوٹتا رہتا تھا۔ اور اُس کا خاوند احساسِ کمتری کا شکار تھا۔ یا پھر وہ اپنی غریبی کو محسوس کرتا تھا۔ لیکن اندرا نے اپنا فرض سمجھا کہ وہ اپنے خاوند کے شک کو پہلی ہی بار دور کر دے۔ اُس نے رام ناتھ سے کہا۔ "آپ خواہ مخواہ شرمندہ کرتے ہیں۔ آپ محنت کرتے ہیں۔ محنت کی روٹی کھاتے ہیں۔ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا کر بھیک تو نہیں مانگتے۔"

رام ناتھ اس بات کو سنکر بہت خوش ہوا تھا۔ وہ اپنی بیوی پر نازاں تھا۔ اُس نے اندرا کو ایک گاڑھے کی ساری پیش کی تھی۔ "یہ ایک غریب کا تحفہ ہے"۔

"غریب کا کیوں۔ یہ تو میرے لئے کمخواب سے بھی زیادہ قیمتی ہے جی۔!"

اندرا شادی کے بعد دس بارہ دن اپنے خاوند کے گھر رہی۔ ان دنوں میں اُس نے زندگی کے کتنے ہی عقدوں کو کھولا۔ رام ناتھ کے ساتھ اس نے اکیلے ہی کئی بار اچھی اچھی باتیں کیں۔ اُسکے ذہن میں خوشیوں کے بیل بوٹے پھوٹے۔ عہد وپیماں ہوئے۔ اور اپنے آپ کو ایکا ایکی ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ لیکن اندرا کی خوشیاں عارضی تھیں۔ تیرھویں دن اُس کا بھائی لینے کے لئے چلا آیا۔ وہ کالج کا طالب علم تھا۔ اُس نے آتے ہی ناک بھوں چڑھائی۔ رام ناتھ کی غریبی اور ناداری کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اُس نے اندرا سے اندرا کی سسرال میں اپنی ناراضگی کا اظہار بھی کرنا چاہا۔ لیکن اندرا نے اُس کی زبان کو روک دیا۔ "بابو کی پسند میری پسند ہے بھیا۔ جب دن اچھے آتے ہیں تو انہیں کوئی نہیں روک سکتا۔

اور برسے دن ہیں تو بھی کہا۔ جیون وقت بتانے کا دوسرا نام ہے۔ میں بہت خوش ہوں "۔

لیکن بھائی کالج کا طالب علم تھا۔ اُس کا دماغ کچا تھا۔ کالج کے پورشدہ ماحول میں پرورش پاتے پاتے اُس نے اپنے ذہن میں زندگی کا ایک خاص معیار متعین کر لیا تھا۔ وہ سوچ تک نہیں سکتا تھا کہ انسان اتنا غریب بھی ہو سکتا تھا۔ جتنا کہ رام ناتھ۔ وہ تو اندرا کے خاوند کو ایک ایسے اچھے خاصے نوجوان کی صورت میں دیکھنا چاہتا تھا۔ جو خود اگر زیادہ نہ کماتا ہو کم از کم ماں باپ کی طرف سے تو مالدار ہو۔ باپ نے گھر میں یہی کہا تھا۔ کہ لڑکا ابھی تھوڑا کماتا ہے۔ آگے اور زیادہ کمانے لگے گا اور باقی ماں باپ خاندان وغیرہ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ اُسکے باپ نے اندرا کی بڑھتی ہوئی عمر کی وجہ سے اُسے غریب خاندان میں جھونک دیا تھا۔ اور وہ جب اندرا کو گھر لیکر پہنچا۔ تو اُس نے سخت الفاظ میں اپنی ناراضگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

"کیا ڈھونڈا ہے گھر آپ نے صاحب۔ باؤجی لڑکی کو سکھ نہیں مل سکتا"، بھائی نے کہا۔

ماں بولی۔ "میں پہلے ہی کہتی تھی۔ ان کی عقل کو تو نہ جانے کیا ہو گیا ہے!"

"اتنا سوچو تو ماں! ان صاحب کو بیٹس ۲۵ روپیہ ماہوار ملتے ہیں۔ باپ کے پاس دھیلا نہیں۔ ایک ٹوٹا پھوٹا ڈھورا ہے فقط اُسے اوڑھ لو اور بچھا لو۔"

"ہاں بیٹا بڑھاپے میں دکھ دیکھنا تھا۔ میں تو اپنی لڑکی کو جب تک پورا انتظام نہ کر لوں سسرال نہیں بھیجونگی۔"

اندرا خاموش رہی۔ اور باپ چپ چاپ سنتا رہا۔ یہ سب رام ناتھ کی غریبی کا قصور تھا۔ جو بھائی اور ماں بیٹھے بیٹھے یوں اس کر رہے تھے اگر رام ناتھ امیر ہوتا تو یہی لوگ پیشوائی کیلئے آنکھیں بچھاتے اور کوشش کرتے کہ اپنے گھر کی ساری دولت اُس کے سپرد کر دیں۔ ہاں! رام ناتھ غریب تھا۔ اور وہ لوگ اُس کو ذلیل کرنے کے ارادے باندھ رہے تھے۔ اُس کو سسرال نہیں بھیجیں گے۔ اگر اُسکے خاوند کے پاس زیادہ پیسہ جمع نہ ہو سکا۔ تو کیا وہ اپنی ماں کی کڑوی کسیلی باتیں سنتی رہے گی۔ اور میکے ہی میں گھلتی سڑتی رہے گی۔ اُس کا دل چاہا۔ کہ وہ بہادری کے ساتھ کہہ دے "بھیا تم ابھی اس وقت مجھ کو سسرال چھوڑ آؤ۔ مجھے لڑائی پسند نہیں۔ میں وہاں آرام سے گزارا کر سکونگی"۔ لیکن روایتی آہنی پنجے نے اُس کا گلا گھونٹ دیا۔ اور وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ خاموش رہی۔ اور بھیا اور ماں کی باتیں زیادہ زہریلی اور خطرناک صورت اختیار کرتی گئیں۔

دن گزرے۔ ہفتوں کی باری آئی۔ مہینے بیت گئے۔ اور پورا سال ہونے کو آیا۔ رام ناتھ کے والد نے تین چار خط لکھے کہ وہ بہو کو رخصت کرانے کیلئے کب اپنے بیٹے کو بھیجے۔ لیکن ماں نے ہر وقت یہ لکھوا کر جواب بھیج دیا۔ "ابھی کیا جلدی ہے"۔ پورا سال تو گزرنے دو۔ اور سال بھی گزر گیا اور رام ناتھ کے والد نے بجائے رخصت کا وقت دریافت کرنے کے خط لکھا۔ کہ وہ اب زیادہ دیر تک انتظار نہیں کر سکتا۔ رام ناتھ کی والدہ بیمار رہتی ہیں۔ لہذا اپنے لڑکے کو رخصت کرانے کیلئے بھیج رہا ہے۔ آپ لوگ تیاری کر کے اندرا کو رام ناتھ کے ساتھ بھیج دیں۔ خط پڑھتے ہی بھائی کو غصہ بھی تو آگیا۔ ماں بھی تیز ہو گئی۔ اور کہنے لگی "آنے دو اسے کیسی کرتی ہوں رخصت — بچے جی کو شوق چرایا ہے"۔

"ہم نہیں رخصت کرینگے ماں۔ اندرا تو وہاں گھٹ گھٹ کر مر جائے گی۔ اُس سے کہنا بھیا ذرا ابھی نوکری کا انتظام کرو۔ گزارے لائق پیسے ملنے لگینگے۔ تو ہم خود تمہارے پاس چھوڑ آئینگے۔"

اندرا ٹکٹکی باندھ کر وید مدم نہ کشیدم کی مانند خاموش، یہ جلی کٹی باتوں کو سنتی رہی۔ اور دعا مانگتی رہی۔ کہ رام ناتھ کے آنے پر لوگ غصہ ترک دیں اور اُسے ہنسی خوشی رخصت کر دیں۔ لیکن ایسا نہ ہوا رام ناتھ آیا اور لوگوں نے اُس کا رُوکھا سُوکھا سا استقبال کیا۔

محلے کی عورتوں نے اُسکے پھلوں کے ٹوکرے اور کپڑوں پر ناک بھوں چڑھائی۔ اُسکے ماں باپ کو نکما اور کنجوس قرار دیا۔ پانچ سات روپے کے پھل تھے، مصنوعی ریشم کی ساری تھی۔ بھائی کے لئے ایک قمیص کا ٹکڑا تھا اور کچھ میوہ — جو کچھ غریب ماں باپ رام ناتھ کے ساتھ شگون کی چیزیں باندھ دی تھیں۔ بیچارے سے آیا تھا۔ اندرا کے لئے یہ بہت تھا۔ کیونکہ ان پھلوں اور کپڑوں میں محبت بھری ہوئی تھی۔ امارت کی نمایش اور مغلین

نہیں تھا۔ وہ تو صرف اب یہی چاہتی تھی کہ کسی طرح اُس کے ماں باپ اُسے رام ناتھ کے ساتھ رخصت کر دیں۔ مگر ماں نے محلہ کی عورتوں کی تنقید سنتے سنتے اپنی عزت کو ہاتھ سے جاتا ہُوا دیکھ کر رونا دھونا شروع کر دیا۔ بھائی نے باپ کو برا بھلا کہا۔ اور یہ سب ناٹک بیوہ دانستہ رام ناتھ کی موجودگی میں کھیلا گیا۔ بیچارہ غریب آدمی۔ گڑگڑانے لگا۔ اُس نے اپنی ساس سے کہا۔ "آپ کی عزت میری عزت ہے ماتا جی۔ والدین کے سر پر قرض چڑھ رہا تھا۔ ساری زندگی اُسے اتارتے رہے۔ میں نے مشکل سے میٹرک پاس کیا۔ سرکار میں ہم لوگوں کی پہنچ نہیں تھی۔ اس لئے یہی معمولی سی نوکری حاصل کر سکا۔ قرض مانگنا ہم لوگ چاہتے نہیں۔ اور نہ ہی آپ لوگوں کو تکلیف دینا چاہتے ہیں۔ والدہ بیمار رہتی ہیں آپ اندرا کو بھیج دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

"بیوی کا چاؤ ہے بھیّا جی تو قرض لیتے۔ مجھے معلوم نہیں ڈاکہ ڈال کر لاتے۔ جیب کاٹتے۔ ڈھنگ کا سامان لاتے۔ جیب کاٹتے۔ اس طرح میری مٹی تو خراب ہوتی برادری میں۔"

"مگر ماتا جی برادری کو تو خوش کرنا آسان کام نہیں۔"

"رہنے دو بھیّا، رہنے دو۔ میں اندرا کو نہیں بھیجنے والی۔ پہلے اپنے گھر کی حالت ٹھیک ٹھاک کر لو۔ اور آؤ تو اس طرح آؤ کہ برادری والے انگلی نہ اٹھا سکیں۔ سمجھے میں جب رخصت کروں گی اپنی بیٹی کو۔"

"اب تو بھیج دو ماتا جی اور کوئی موقعہ ہوگا۔ تو ہم لوگ برادری کے دکھاوے کے لئے بھی کچھ نہ کچھ کرینگے۔ پرماتما کرے ہمیں وہ دن نصیب ہوا۔"

"نہیں! نہیں! میں اپنی بیٹی کو ہرگز ہرگز رخصت نہیں کروں گی۔" اندرا کی ماں نے چھاتی پیٹنے اور سر کوٹنے کے آزمودہ نسخے کو عمل میں لانا شروع کر دیا۔ بھائی سازش میں شریک تھا۔ باپ بیوی کا غلام۔ خاموش دیکھتا رہا۔ رام ناتھ نے آخری بار نہایت ملائمت سے کہا "ماتا جی ضد نہیں ٹھیک ہوتی۔ آپ اندرا کو میرے ساتھ بھیج دیں۔ ماں کی عمر کے آخری دن ہیں۔ اُن کو کچھ خدمت ہوگئی تو دعا دینگی۔ اور ہمارے دن پھر جائیں گے۔" ضد کا انجام کبھی کبھی خراب بھی نکل آتا ہے۔ لیکن ماں پر بھوت سوار تھا۔ اُس نے اپنے داماد کی التجا کو ٹھکرا دیا۔ اور رام ناتھ بوریا بستر باندھ کر اکیلا ہی رخصت ہو گیا۔ اندرا اندھیرے کمرے میں اکیلی آنسو بہاتی رہی۔

× × × × × × × × × × × × × ×

رام ناتھ نے غریب آدمیوں کی مانند بے عزتی کو برداشت کر لیا۔ اُسے اندرا کا خیال تھا۔ وہ اپنے ساس سُسر کی مانند بے وقوف بن کر اندرا کی زندگی کو برباد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا اُس نے اگلے دو سالوں میں تین چار مرتبہ پھر اندرا کو رخصت کرانے کے لئے خط لکھے مگر اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ سنتے ہیں کہ اُس کی ماں سخت بیمار ہوگئی اور بستر مرگ پر دراز ہوگئی۔ اُس بھلی مانس عورت نے موت کے بستر پر لیٹے لیٹے اپنی بہو کے درشن کرنے کی خواہش کا اظہار کیا اور رام ناتھ نے فوراً تعمیل کی وہ پہلی گاڑی سے اپنی سسرال پہونچا اور ماں کی حالت بیان کرتے ہوئے اپنی ساس سے درخواست کی کہ وہ اندرا کو ہمیشہ نہیں کم از کم دو تین دن کے لئے تو بھیج دیں۔ تاکہ اُس کی ماں ناامیدی لئے ہوئے نہ مرے۔ اُس نے اپنی ساس کے آگے ہاتھ جوڑے۔ خوشامد کی گڑگڑایا کیونکہ ماں کی محبت ستا رہی تھی۔ لیکن اندرا کی ماں ایک سخت چٹان تھی اُس نے اپنی بے عزتی کا بدلہ ہمیشہ کی مانند صاف انکار سے دیا!

اندرا نے اس بار ہمت سے کام لیتے ہوئے ماں سے اپنا ارادہ ظاہر کیا "مجھے جانے دو ماں۔ میں ضرور جاؤں گی۔ مجھے کوئی روک نہیں سکتا۔ میں اُس گھر میں بیاہی ہوں،" اور وہ جانے کے لئے تیار بھی ہوگئی۔ لیکن بھائی اور ماں کے مضبوط ہاتھ پاؤں اُسکے لئے ایک مسئلہ بن گئے۔ رام ناتھ مایوس ہو کر لوٹ گیا۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ ایک کڑوی بات بھی کہتا گیا۔ "ماتا جی اگر میرے پتا جی نے دوسری شادی کا انتظام کر لیا۔ تو آپ لوگ ہی اس کے ذمہ دار ہونگے"

ہاں! دیکھیں گے وہ لوگ کیسے کرتے ہیں دوسری شادی۔

رام ناتھ چلا گیا۔ اندرا پاگل ہو اٹھی۔ اُس نے چاہا۔ کہ اُس کا بھائی اور ماں دونوں کا دل ایک دم چلتا چلتا بند ہو جاتے۔ گھر کی چار دیواری میں اتنے بڑے بڑے شگاف پڑ جائیں کہ وہ بھاگ کر سٹیشن پر پہنچ کر رام ناتھ کے قصبے کا ٹکٹ خرید گاڑی میں بیٹھ سکے اور اپنی سسرال پہنچ جائے۔ اور غریب رام ناتھ کی غریب ماں کی آرزو پوری کر سکے۔ لیکن وہ مجبور تھی۔ اُس کا جسم آگ کی طرح جل رہا تھا اور اُس کے بھائی اور ماں دونوں پتھر کی طرح سخت بنے ہوئے کسی طرح سے بھی پگھلنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

رام ناتھ کی ماں مر گئی۔ رام ناتھ نے سسر کو خط لکھا کہ گھر میں عورت نہ ہونے کے باعث کھانا پکانے کی تکلیف ہے۔ اور یہ کہ والد صاحب بیٹے کی دوسری شادی رچانے کی فکر میں مبتلا ہیں۔ بلکہ ایک جگہ تقریباً بات پکی بھی نظر آتی ہے۔ اگر آپ اندرا کو بھیج دیں تو میں اُن کو ایسا کرنے سے روک دونگا۔ نہیں تو میں دوسری شادی کرنے پر مجبور ہونگا۔

اور پہلی درخواستوں کی مانند یہ عرضی بھی ردی کی ٹوکری میں پھاڑ کر پھینک ڈالی گئی۔ اور اندرا کی آگ اور تیز ہو گئی۔ مگر اُس میں اب بھی اتنی تیزی نہ آپائی تھی۔ کہ وہ بھائی ماں اور ساتھ ہی عزت کو جھلس کر راکھ کر ڈالے۔ وہ مفلوج ہو گئی۔ اُس کا ذہن کچھ سوچ نہ سکا اُسے ماں باپ کا بڑھاپا دیکھتے دیکھتے اُن کی موت اور پھر اپنی بے بسی کا خیال آیا۔ بھائی کی شادی ہونے والی تھی۔ بھاوج آئے گی۔ ماں باپ مر جائینگے۔ تو پھر اُس کا کون سہارا ہوگا۔ لہٰذا اُس نے اپنی تعلیم کا سلسلہ پھر جہاں تک پہنچ کر منقطع ہوا تھا۔ اُس کے آگے شروع کر دیا۔ اور اب اتنی گنجائش بھی تو نہیں تھی۔ کہ وہ رام ناتھ کے گھر اکیلی چلی جائے اور لوگ اُس کا استقبال کریں۔

چند ہفتوں میں خبر ملی کہ رام ناتھ نے دوسری شادی رچالی ہے۔ بھائی، ماں، باپ سب پتھروں کی مانند خاموش ہو گئے۔ اور اندرا کو خوشی بھی ہوئی اور غم بھی۔ خوشی اس بات کی کہ رام ناتھ کے سُوکھے جیون میں پھر سے بہار تو آئے گی۔ دُنیا والے اُس کا مذاق تو نہیں اُڑائینگے اور کہینگے، بیٹا دیکھا امیر گھرانے میں شادی کرنے کا نتیجہ۔ بیوی کو بھی خاوند کے ساتھ رخصت کرنیکے قابل نہیں سمجھتے۔۔ سوچنا اور غم اس بات کا تھا۔ کہ وہ زندہ تھی۔ اور خواہ مخواہ رام ناتھ کے لئے اتنی بے عزتی کا باعث بنی تھی۔ اور مرنا اُس کے ہاتھ میں بھی نہیں تھا۔ ماں باپ کا گھر اُسے کاٹنے کو آتا تھا۔ لیکن اب وہ جائے بھی کہاں۔ اب سوائے تعلیم پوری کرنے اور اپنا پیٹ آپ پالنے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔

* * * * * * * * * * * * * * * *

پہلے اندرا کو اپنے قصبے کے ٹدل سکول میں ہی استانی کی ملازمت مل گئی۔ لیکن بھاوج کے طعنے اور بھاوج کے سامنے ماں باپ کی بے چارگی نے اُسے سخت ایذا پہونچائی۔ ماں اکثر یُوں رونا روتی۔ کیا بتاؤں اس کی گرہ تو پہلے ہی سخت تھی۔ لڑکا بھی ملا تو وہ بھی لچھن کا نہیں۔ اس لڑکی کے تو بھاگ ہی پھوٹ گئے۔ اب سکول پڑھانے جاتی ہے تو ویسے ہی دل بیٹھا جاتا ہے۔ جوان عورت ہے زمانہ خراب ہے۔ ہائے قسمت۔ خاوند مرد وئے نے دوسری شادی کرلی اور اب بلانے کا نام نہیں لیتا۔

بھاوج طعنے دیتی: اگر میں تمہاری جگہ ہوتی۔ تو گلے میں پھانسی کا رسہ ڈال کر لٹک جاتی۔

بھائی شرمندگی محسوس کرتا۔ اب اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو چلا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کی بہن نوکری نہ کرے۔ لیکن بیوی بہت سخت قسم کی تھی۔ اُس نے آتے ہی خاندان کی گندہ رگ کو پکڑ لیا تھا۔ اور اس طرح خاندان پر پوری طرح سے مسلط ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اپنی نند کو خوب کڑوے کسیلے طعنے دیتی تھی۔ اور خوش تھی۔ اور اندرا کے ماں باپ چُپ تھے۔ اب ماں کی ضد اور باپ کی بزدلی دونوں شرما چکی تھیں۔ لیکن وہ دونوں مجبور تھے۔ لوگوں نے اُن سے کہا بھی کہ وہ لڑکی کی دوسری شادی کر دیں۔ لیکن انہوں نے اس بات کو

بلا تھا۔ جتنا کہ اندرا کے بارے میں لوگوں نے غلط افواہیں پھیلانی شروع کر دیں۔

ابھی کچھ بات ضرور تھی۔ جو لڑکی ایک بار سسرال جا کر پھر دوبارہ نہیں گئی۔

اُسے خاوند کی کیا پروا۔ وہ تو خود کما سکتی ہے۔ بے چارے نے تنگ آ کر دوسری شادی کر لی۔

شادی کے وقت ہی عمر کافی تھی۔ لڑکی کے چال چلن کی وجہ سے کوئی رشتہ نہیں لیتا تھا۔ اور اب تو وہ آزاد ہو گئی ہے۔ جو من چاہے گا کرے گی۔

اندرا کے کان یہ باتیں سنتے سنتے پکنے لگے۔ ماں نے رائے دی کہ وہ نوکری چھوڑ دے۔ گھر پر ہی بھائی بھاوج کی جھڑکیاں سہتی رہے۔ اور اُن کے دستے ہوتے ہی روکھے سوکھے ٹکڑے کھائے۔ لیکن اندرا کا دل اب اپنے ماں باپ اور بھائی کے ٹکڑوں سے بیزار ہو چکا تھا۔ وہ اب دور کہیں دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ جہاں وہ اس قسم کی بزدلی سے دوچار نہ ہو۔ اور وہ زندگی کا بہادری سے مقابلہ کر سکے۔

اندرا نے دوسرے قصبے میں جا کر نوکری اختیار کر لی۔ اور اپنی بچپن کی سہیلی کی مدد سے ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لینے میں کامیاب بھی ہو گئی۔

یہ چار سال پہلے کی بات تھی۔ دوسری جنگ عظیم آخری مرحلوں پر تھی۔ اتحادی آگے بڑھ رہے تھے۔ بیکاری دور ہو گئی تھی۔ رام ناتھ نے بھی اچھی خاصی ترقی کر لی۔ وہ اب پینتیس روپیہ ماہوار کا کلرک نہیں تھا۔ بلکہ پانچ سو روپیہ ماہوار کا افسر۔ اُس کے دو تین بچے تھے۔ اندرا کے پاس یہ خبریں پہنچتی ہی رہتی تھیں۔ اسی لئے دوسرے قصبے میں آتے ہی جو پہلی بات اُس نے سوچی وہ یہ تھی کہ وہ ہمت کر کے رام ناتھ کے پاس ایک بار جائے تو سہی۔

ہمت کرتے کرتے دو سال اور بیت گئے۔ دوسری جنگ عظیم کا خاتمہ ہو گیا۔ اور ملک کی آزادی کے تذکرے ہونے لگے۔ لیکن اندرا کو ملک کی آزادی سے کیا سروکار۔ کیا ملک کی آزادی اُسے اپنے دکھ سے رہائی دلا سکتی تھی۔ یہ تو صرف سیاسی تبدیلی ہو رہی تھی سماجی انقلاب تھوڑے ہی تھا۔ کیا اپنا جھنڈا لہرانے سے اُس کے ماں باپ بھائی اور سماج کا دماغ بدل جائیگا۔ ہرگز نہیں۔ وہ تو پہلے کی مانند تنہا ہی رہے گی۔ ہندوستان میں سینکڑوں ہی سیاسی انقلاب آئے لیکن عورت کا درجہ وہیں کا وہیں رہا۔ رام ناتھ نے دوسری شادی ضرور کی۔ لیکن مجبور ہو کر۔ مگر وہ۔ اُسکی قسمت میں اکیلا رہنا ہی لکھا تھا کیا۔ شاید نہیں۔ ملک کی آزادی اور اپنے لہراتے ہوئے جھنڈوں کا رنگین تصور ذہن میں لئے ہوئے اندرا نے رام ناتھ کے گھر کا رخ کیا۔ اُس نے رام ناتھ کے بچوں کے لئے مٹھائی کھلونے اور دوسرے تحفے لئے اور اپنی سوتن کیلئے ایک ریشمی ساری خریدی اور سفر پر روانہ ہو گئی۔

رام ناتھ اندرا سے نہایت ملائمت سے پیش آیا۔ لیکن اُس نے اندرا کو اپنے گھر پر دوسری عورت کے ہوتے ہوئے مجبوری کا اظہار کیا۔ اُس نے کہا کہ وہ روپے پیسے سے مدد کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہے۔ لیکن دوسری بیوی اور تین بچوں کے ہوتے ہوئے وہ اُسے گھر میں رکھنے سے معذور ہے۔ اُس نے دوسری شادی سے پہلے اندرا کی ماں اور اندرا کے باپ سے درخواست پر درخواست کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ تب بھی وہ لوگ نہ مانے۔ اور اب وہ دوسری عورت سے وعدہ کر چکا ہے۔ اُسے نبھانا اُس کا فرض ہے۔ تین بچے بھی تو ہیں۔

اندرا خاموش تھی۔ اُسکے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اُس نے رام ناتھ کے پاؤں پکڑ کر اور گڑگڑا کر کہا۔ کہ وہ اگر اور کچھ نہیں ہو سکتا تو کم از کم ایک بات پر راضی ہو جائے۔ اُن تین بچوں میں سے ایک کو پالنے کے لئے ہی دیدے۔ میں بیٹے کی طرح بچے کو رکھوں گی میرا غم دور ہو جائیگا۔ کچھ تو کریں آپ میرے لئے۔

ہیں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کر سکتا کہ تم کو بھوکا نہیں مرنے دونگا۔ تم میرے پاس نہیں رہ سکتی۔ اپنے میکے میں رہو، یا کہیں اور میں ہر وقت مدد کیلئے حاضر ہوں۔ بس ـــ! رام ناتھ اب صاف گو اور انصاف پسند انسان بن گیا تھا۔ اُسے اندرا کی بربادی کا احساس ضرور تھا مگر دوسری بیوی اور بچے"..............

اندرا مایوس ہو کر وہاں سے لوٹ آئی۔ اور لڑکیاں پڑھانے کے کام میں مشغول ہوگئی۔ رام ناتھ بھی مجبور تھا۔ ماں باپ اور بھائی سب مجبور تھے۔ اُس کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ وہ مظلوم ہے۔ کیا وہ اُس اکیلے مکان میں اکیلی ہی وقت گزار دے گی۔ وقت کی تلواروں کے زخم اس کے ذہن پر کاری زخم لگاتے رہیں گے۔

پہلے سب جگہ آزادی کا چرچا تھا۔ پھر بھوک اور افلاس کے چرچے ہونے لگے۔ اگر آزادی کے معنے بھوکوں کو خوراک اور ننگوں کو کپڑا اور اندرا جیسی بے قصور لڑکی کو زندگی مہیا کرنا ہوتا۔ تو بھوک اور برہنگی کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی۔ پہلے بھی تو بہت سے انقلاب آ چکے تھے۔ اصلی انقلاب ابھی دور تھا۔

اندرا نے اپنے سر کو میز سے اوپر اٹھایا۔ جتنی سماجی اور سیاسی غلطیاں اس دنیا میں ہوئی ہیں۔ وہ ہرگز ہرگز ان کی ذمہ دار نہیں تھی وہ تو محض ایک عورت تھی۔ جس کا سماج اور سیاست میں کوئی دخل نہیں۔ تو پھر کیوں اپنے آپ کو سماج اور سیاست پر قربان کر دے۔ رام ناتھ آدمی تھا۔ اُس نے جب دیکھا اندرا کو اُس سے زبردستی دور رکھا جا رہا ہے تو اُس نے دوسری شادی کر کے اپنے جسمانی تقاضے کو پورا کر لیا۔ اور وہ عورت ہے۔ وہ عورت ہے اُسکے ماں باپ نے اُسے رام ناتھ سے دور دور رکھا ہے۔ تو اس میں اُس کا قصور کیا ہے۔ اور اگر اُن لڑکیوں کے ماں باپ جن کو وہ پڑھاتی تھی۔ اُنہیں رام ناتھوں سے دور رکھیں گے۔ تب بھی اس میں اُن معصوم کلیوں کا کیا قصور ہوگا۔ کلی کا کام ہے کھلنا۔ اُسے ضرور کھلنا چاہیئے۔ کسی کو کیا حق ہے کہ وہ کلی کو کھلنے سے روکے۔

اندرا نے محسوس کیا کہ چٹان آہستہ آہستہ اُوپر اٹھ رہی ہے۔ اُس چٹان کا بوجھ کم پڑتا جا رہا ہے۔ وہ ضرور ضرور اُس بھاری وزنی چٹان کے نیچے سے باہر نکل آئیگی۔

* * * * * * * * * * * * * * *

جب اندرا کی ماں کے پاس اندرا کا خط پہنچا۔ جس میں درج تھا کہ اُس نے ایک چالیس سالہ ادھیڑ عمر آزاد خیال شریف انسان سے شادی کر لی ہے۔ پہلی بیوی جس کی مر چکی ہے۔ تو اندرا کی ماں کا دل بیٹھ گیا۔

بھائی پڑھ رہا تھا۔ "میں نے اس بارے میں پہلے کافی سے زیادہ سوچ وچار کر لیا تھا۔ اور اب جب میں اس نئے گھر میں آگئی ہوں۔ تو سوچتی ہوں۔ میرا فیصلہ ٹھیک ہی تھا۔ آپ کی ـــ اندرا کی ماں نے تو دم نہیں توڑا۔ بیا گلوں کی طرح چھاتی کوٹی اور سر کو پھوڑ ڈالا۔ اور

(بقیہ صفحہ ۷۰)

چلی گئیں۔ اور ریحانہ نے اپنی ناک کو بند کر لے ہوئے نوکر سے کہا کہ بڑھیا کو رکشا پہ لاد کر اسکے گھر پہنچا دو۔ اور جمعدار سے پورا گھر دھلوانے کی تاکید کرتی ہوئی وہ رکشا پر بیٹھ گئی۔ بھلا اس طرح وہ کب تک ماری ماری پھرے گی۔ اور اس دن سے یہی ہو گیا کہ پیلے پیلے پت کے قے سے وہ ریحانہ کا گھر بھرنے لگی ـــ آخر ریحانہ سے صبر نہ ہو سکا۔ ارے یہ تم کو کیا ہو گیا ہے ؟ ـــ بیمار ہو تو ! پھر یہاں کیوں چلی آتی ہو ـــ ؟ یا میرے اللہ۔ یہاں نہ آیا کرو بھائی۔ دیکھو میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں ـــ یہ روپے لے لو اور سیدھی ہسپتال میں چلی جاؤ۔" اور وہ روتے پیٹتے کرتی ڈگمگاتی ہوئی دروازے سے نکل گئی۔ مگر دو دنوں کے بعد وہ لمبا پاٹ سا سایہ دروازے سے جھانکتے جھانکتے پھر اندر چلا آیا ـــ" کا ہین دولہن ـــ تم کو بال بچہ بڑھیں ہیں" ـــ اور اس وقت ریحانہ کو ایسا لگا جیسے وہ اپنے ان سارے فسانوں کو پھاڑ ڈالے۔ جس میں زخمی تھے، کراہیں تھیں اور ٹکڑے ٹکڑے کی ہوئی لاشیں ـــ

پریم پجاری

"سراب"

رضا اور جمیل کی شادی محبت کی شادی تھی۔ ازدواجی زندگی کے یہ دو سال اس طرح گذرے جیسے شادی کی رات اور اُس سے پہلا دن۔ رنگینیوں سے معمور، مسرتوں سے لبریز۔ حسن، جوانی اور محبت نے مل کر ان کی زندگی کو ایک رنگین کہانی بنا دیا تھا۔ رعنا کی تمناؤں کا مرکز فقط ایک ہستی تھی۔ اس کا محبوب جمیل۔ جمیل کی ہر آرزو کا منتہا صرف ایک ذات تھی۔ اس کی دل نواز رعنا۔

کہتے ہیں کہ حصولِ مقصود کے بعد دل میں خلش اور روح میں تڑپ باقی نہیں رہتی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ رعنا اور جمیل کے معاملے میں شاید انسانی فطرت کا یہ قانون ٹوٹ گیا تھا۔ وہی والہانہ شیفتگی جو ایک دوسرے کے لئے شادی سے پہلے تھی، آج شادی کے دو سال بعد بھی موجود تھی۔ گفتار و کردار کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو ان کی شورانگیز محبت کا آئینہ دار نہ ہو۔

اکثر ایسا ہوتا کہ گھر میں چلتے پھرتے یا ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آتے جاتے، جیسے ہی جمیل کی نظر رعنا پر پڑتی، وہ بے اختیار اُس کے گلے میں بانہیں ڈال دیتا۔ پیار کر لیتا پھر دونوں بیٹھ جاتے۔ بھول جاتے کہ کون کس کام کے لئے اٹھا تھا۔ بس وہی چاہت اور پیار کی باتیں۔ کبھی رعنا پیچھے سے آکر اچانک جمیل کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتی۔ وہ آہستگی سے اُس کے دونوں ہاتھوں کو کھینچ کر کبھی اپنے رخساروں سے مس کرتا، کبھی چومتا۔ کبھی اپنے سینے پر رکھ کر دباتا۔

کبھی رعنا بیٹھے بیٹھے اُس کے کاندھے پر سر رکھ دیتی اور اس کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ یہاں نہیں، کسی دوسری دنیا میں ہے۔ یا خواب دیکھ رہی ہے۔ غرض ان کی زندگی کچھ ایسی غیر معمولی ہم آہنگی کے ساتھ گذر رہی تھی کہ دیکھنے والے رشک کرتے۔ حیران ہوتے اور کبھی کبھی اسے بے اصل نمائش سمجھتے۔

جمیل کسی معزز سرکاری عہدے پر ممتاز تھا۔ اپنے محکمے کا افسر تھا۔ گیارہ بجے دفتر جاتا۔ ایک بجے گھر آکر رعنا کے ساتھ کھانا کھاتا۔ دو ڈھائی بجے دوبارہ دفتر جاتا اور عموماً پانچ بجے اور کبھی کبھی ساڑھے چار بجے ہی واپس آجاتا۔ اور پھر دوسرے دن گیارہ بجے تک عموماً دونوں ساتھ رہتے۔ رعنا کو یہ چند گھنٹوں کی جدائی بھی شاق گذرتی۔ اکثر ٹیلیفون کرتی۔ کبھی کھانے سے پہلے، کبھی جمیل کے دوبارہ گھر آنے سے پہلے۔

"بہت جی گھبرا رہا ہے۔ اب آجائیے نا! ہائے اللہ کب تک انتظار کریں؟"

"ابھی آتا ہوں میری جان! ابھی آتا ہوں، چند کاغذوں پر دستخط کرنے باقی ہیں۔"

"نہیں بس اب آجائیے۔ کل کیجئے گا دستخط نہیں تو میں خود آتی ہوں۔"

"اچھا ڈارلنگ ابھی آیا۔"

یہ تقریباً ہر روز کا معمول تھا

رات کو کھانا کھانے کے بعد کبھی کبھی رعنا کسی اُردو کے رسالے میں سے کوئی افسانہ یا کوئی اچھا سا مضمون پڑھ کر جمیل کو سناتی۔ پھر دونوں اس پر بحث کرتے۔ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔ مضمون پر تنقید کرتے کرتے کبھی خود مضمون نگار پر بھی تنقید کرنے لگتے۔ دونوں نے بہت اچھا ادبی ذوق پایا تھا مگر رعنا کو نظم کی بہ نسبت نثر سے زیادہ مناسبت تھی۔ اور نثر میں بھی وہ ایسے مضامین اور افسانے زیادہ

پسند کرتی تھی جن میں فطرتِ انسانی کے اسرار و رموز سے بحث کی جاتی یا نفسیاتی مسائل کی تحقیق ہوتی۔ وہ ایک گمنام ادیب کی بے حد مداح تھی جو "مجذوب" کے فرضی نام سے اور "مجذوب کی بڑ" کے عنوان سے اردو کے ممتاز رسالوں میں دانش و حکمت کی باتوں سے لبریز مضامین اور نفسیات کے نازک و لطیف نکتوں سے بھرپور افسانے لکھا کرتا تھا۔

ایک رات کو کھانا کھانے کے بعد جمیل نے کہا:

"وہ آپ کے مجذوب صاحب مدت سے نظر نہیں آتے"۔

"کیا آپ کو بھی ان کی "بڑ" پسند ہے؟"

"ڈارلنگ تم جس چیز کو پسند کرو وہ مجھے کیونکر پسند نہ ہوگی"۔

"تو پھر ابھی آپ کو سناؤں گی۔ آج ہی تو "سروش" کا سالنامہ آیا ہے۔ مجذوب صاحب نے اس میں ایک لمبی "بڑ" ہانکی ہے۔ سرخی دیکھ کر میں نے چھوڑ دیا۔ سوچا کہ آج رات کو ساتھ بیٹھ کر پڑھیں گے"۔

"تو پھر سناؤ"۔

رعنا نے میز پر سے "سروش" کا سالنامہ اٹھایا اور پڑھنا شروع کیا۔ جمیل پوری توجہ کے ساتھ سن رہا تھا۔

"مجذوب کی بڑ"

"محبت آخر ہے کیا۔ ایک جذبہ ہی تو ہے جس کا محرک جنسی میلان ہے۔ عام جنسی میلان جب شدت و افراط کے ساتھ کسی ایک ذات سے مخصوص ہو جاتا ہے تو ہم اسے محبت سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب یہ صورت ہے تو سچی اور جھوٹی محبت کیسی؟ پاک اور ناپاک محبت کے کیا معنی؟

بات دراصل یہ ہے کہ یوں تو قدرتی طور پر ہر چاہنے والے کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ محبوب کو تمام و کمال اپنا بنا لے۔ اس حد تک اپنا بنا لے کہ کوئی آرزو تشنۂ تکمیل نہ رہنے پائے۔ مگر یہ صورت ہر شخص کے لئے ممکن نہیں ہوتی۔ مذہب، اخلاق، قانون اور رسم و رواج نے بعض چیزوں کو جائز اور بعض چیزوں کو ناجائز قرار دیا ہے۔ یہی جائز و ناجائز کسی نہ کسی عنوان سے تکمیلِ تمنا کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں۔

"بعض لوگوں پر مذہب کا اثر اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ وہ کسی گناہ کے ارتکاب کی جرأت ہی نہیں کر سکتے۔ مگر دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔

"بعض لوگوں کو اپنی خاندانی شرافت کا احساس، اپنے ننگ و ناموس کا لحاظ، بدنامی و رسوائی کا اندیشہ، رسم و رواج کی رکاوٹیں، ملکی قانون کی پابندیاں اور کچھ دوسری مجبوریاں اقدامِ جرم سے باز رکھتی ہیں۔

"بعض لوگوں کو نہ مذہب کا چنداں پاس و لحاظ ہوتا ہے نہ وہ آئینِ اخلاق کی پروا کرتے ہیں۔ نہ بدنامی و رسوائی سے ڈرتے ہیں۔ اس کے باوجود کسی "معصیت" کے اقدام پر آمادہ نہیں ہوتے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ ان کے اندر خود جذبۂ محبت اتنا شدید نہیں ہوتا کہ وہ موانع کی ان زنجیروں کو توڑ ڈالیں اور دل کی پیاس بجھا لیں۔

بعض لوگوں میں ذاتی طور پر کسی خطرے میں پڑنے کی ہمت اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہوتی اس لئے وہ "جائز" اور "ناجائز" کے حصار میں پناہ لیتے ہیں۔

"اور بعض لوگ ضبطِ نفس کی ایسی غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں کہ جذبات کی آندھیوں اور خواہشات کے طوفانوں میں بھی اُن کا قدم مذہب، اخلاق، قانون اور رسم و رواج کے قائم کئے ہوئے جادۂ اعتدال سے نہیں بھٹکتا۔ ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہیں۔

"بعض لوگ امورِ محبت میں ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتے یا یوں کہئے کہ اپنی جنسی بھوک کی تسکین کے لئے کسی "ناجائز" فعل کے مرتکب نہیں ہوتے۔ اس لئے نہیں کہ یہ اشتہا انہیں ستاتی نہیں۔ یا "گناہ" کی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کو اُن کا جی نہیں چاہتا یا فی الحقیقت مذہب کے مقدس احکام کا پاس و لحاظ ان کا دامن تھام لیتا ہے۔ نہیں۔ بلکہ بعض دنیوی مجبوریاں انہیں جرم و گناہ کے اقدام سے باز رکھتی ہیں۔ مگر وہ ایسا ظاہر کرتے ہیں گویا مذہب کے احترام نے انہیں معصیت کے ارتکاب سے روکا ہے۔ یہ لوگ نہ صرف دوسروں کو بلکہ بعض اوقات خود اپنے نفس کو بھی دھوکا دیتے ہیں۔ احترامِ مذہب کا اظہار صرف اس لئے کیا جاتا ہے کہ دوسرے ان کی پاکیٔ طینت سے متاثر ہو کر ان کے نفس کی بزرگی کے قائل ہو جائیں

اور اس طرح وہ درحقیقت کسی عملِ خیر کا اقدام کئے بغیر دنیا کی نظر میں مقدس و محترم بن جائیں۔

یہ لوگ اپنی محبت کو "پاک محبت" کہہ کر اپنے دل کی چوریوں کو چھپاتے اور اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالتے ہیں۔ اور جو لوگ امورِ محبت میں جائز و ناجائز کی تمام قیود سے بے نیاز ہو کر دنیا و آخرت کی ذرہ برابر پرواہ کئے بغیر حصولِ آرزو کی خاطر ننگ و ناموس بلکہ ہر چیز کی بازی لگا دیتے ہیں اور تکمیلِ تمنا ہی کو حاصلِ زندگی سمجھتے ہیں، "پاک محبت" والے انہیں گنہگار، مجرم، بدکردار وغیرہ کے ناموں سے یاد کرتے ہیں اور اُن کی محبت کو ہدفِ ملامت بناتے ہیں۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ "پاک محبت" اور "ناپاک محبت" کی تفریق محض بے معنی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی مجبوری کی بنا پر معصیت کا اقدام نہ کر سکے لیکن اُس کا دل ارتکابِ گناہ کے لئے سراپا آرزو ہو تو کیا ہم اُسے پاک اور مقدس سمجھنے میں حق بجانب ہیں؟ پھر جب یہ بات ظاہر ہے کہ محبت دہر حال میں وہی جنسی میلان ہے تو پاک اور ناپاک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"آج تو آپ کے مجذوب صاحب بُری طرح بہک رہے ہیں۔ پاک اور ناپاک محبت کا فرق ہی مٹا دیا۔ گویا ہر محبت ناپاک ہے کیونکہ اُس کا محرک جنسی میلان ہے۔ ناپاک محبت کسی دلیل سے بھی پاک نہیں ہو سکتی۔ کم سے کم میرا تو یہی خیال ہے۔" جمیل نے رعنا کے زانو پر سر رکھ کر صوفے پر دراز ہوتے ہوتے کہا۔

"یقیناً پاک اور ناپاک محبت میں فرق ہے۔ میرے نزدیک تو صرف میاں بیوی کی محبت پاک محبت کہلانے کی مستحق ہے کیونکہ اس میں ہر آرزو کی تکمیل بھی ہو جاتی ہے اور انسان معصیت سے محفوظ بھی رہتا ہے۔"

اگر وہ ایک دوسرے کے دل کا حال جان لینے پر قادر ہوتے تو شاید مجذوب کے خیالات پر تبصرہ کرنے کی اُنہیں جرأت ہی نہ ہوتی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر یہ محسوس کر رہے تھے کہ مجذوب نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک ہی کہا ہے۔

"جنسی میلان جائز اور ناجائز کا پابند نہیں۔ پھر محبت میاں بیوی کے درمیان کیونکر محدود رہ سکتی ہے۔ بعض مخصوص حالات کے جمع ہو جانے پر محبت کا جذبہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے اس میں کسی کے ارادے اور اختیار کو دخل نہیں ہوتا۔ سماجی مصلحتوں کی بنا پر اگر ہم شادی کے بغیر محبت کے تقاضوں کی تکمیل نہ ہونے دیں تو یہ دوسری بات ہے مگر نفسِ جذبہ تو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہر حال ایک ہی رہے گا چاہیے اسے پاک کہو، چاہے ناپاک کہو۔"

رعنا اور جمیل دونوں کے دلوں میں بہ یک وقت اسی قسم کے خیالات آ رہے تھے اور دونوں ایک دوسرے سے اپنے دل کی حقیقی کیفیت کو چھپا رہے تھے۔ دونوں کو اندیشہ تھا کہ کہیں ایک کو دوسرے کے دل کا حال نہ معلوم ہو جائے۔

آخر جمیل نے کہا:۔

"اچھا آگے پڑھو، اور کیا فرماتے ہیں مجذوب صاحب۔"

رعنا نے پھر پڑھنا شروع کیا۔

"یہی حال سچی اور جھوٹی محبت کا ہے۔ محبت نہ سچی ہوتی ہے نہ جھوٹی۔ یا یوں کہیے کہ ہر محبت سچی ہے یا ہر محبت جھوٹی ہے۔ محبت اگر دیرپا ہو تو عموماً ہم اسے سچی محبت کہتے ہیں اور اگر جلد مٹ جائے تو وہ جھوٹی محبت کہلاتی ہے۔ مگر محبت کے دیر تک باقی رہنے یا جلد مٹ جانے کو اُس کے سچے یا جھوٹے ہونے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس اختلافِ حال کا سبب کچھ اور ہے۔ فراق محبت کی زندگی اور وصال اُس کی موت ہے۔ جس طرح منزل پر پہنچ جانے کے بعد سفر خود بخود ختم ہو جاتا ہے اور حرکت سکون میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح حصولِ مقصود کے بعد دل میں وہ خلش اور طبیعت میں وہ جوش و اضطراب باقی نہیں رہتا جو حصولِ مقصود سے پہلے ہوتا ہے۔

اب اگر کسی کو محبوب تک پہنچنے کے لئے بہت سی مشکلوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا اور مدتوں سرگرداں رہنا پڑا ہے تو اُس کے جذبات میں شدت اور گہرائی نسبتہً زیادہ ہو گی۔ اور اگر یہ مرحلہ بہ آسانی طے ہو گیا تو ظاہر ہے کہ شوق کی تسکین بھی جلد ہی ہو جائے گی۔

محبت کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو، تکمیلِ آرزو کے بعد محبوب میں وہ کشش باقی نہیں رہتی جو حصولِ تمنا سے پہلے تھی۔ اسی لئے محبت کی شادیاں اکثر ناکام ثابت ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ تنوع پسندی انسان کی فطرت ہے۔ اس لئے بھی کچھ مدت کے بعد طرفین کی طبیعتیں ایک

دوسرے سے سیر ہو جاتی ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:-

طبیعت کوئی دن میں بھر جائے گی

چڑھی ہے یہ ندی اُتر جائے گی

شادی کے بعد یا تسکینِ آرزو کے بعد جذبات کی اس چڑھی ہوئی ندی کا اُترنا لازمی ہے۔ محبت کی کار فرمائی تو یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ بعد کی زندگی میں زن و شوہر کی ایک دوسرے سے غیر معمولی وابستگی کا سبب محبت نہیں بلکہ حالات کا تقاضا اور اجتماعی مصالح ہوتے ہیں۔ اُسے محبت کا نتیجہ سمجھنا یقیناً غلط ہے۔ محبت کی عمر اتنی دراز نہ ہوتی ہے۔ نہ ہو سکتی ہے۔ جذبات کا ہنگامی جوش سرد ہو جانے کے بعد محبت کا ختم ہو جانا بھی لازمی ہے۔ اور یہی انسانی فطرت کا تقاضا ہے جب یہ صورت ہے تو سچی اور جھوٹی محبت میں فرق کر کے ایک کو سرا ہنا اور دوسری کو موردِ ملامت ٹھہرانا قصورِ فہم کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔

یہ حقیقت ہمیں کسی وقت نہ بھولنی چاہئے کہ کسی شخص کی محبت کو ہم سچی اور پاک محبت کہیں یا جھوٹی اور معصیت آلود محبت قرار دیں، اصل اس کی بہرحال وہی ایک جنسی میلان ہے اس لئے سچی اور جھوٹی یا پاک اور ناپاک محبت کے درمیان حقیقی اختلاف اور بنیادی فرق کوئی نہیں۔"

ختم کرنے کے بعد رعنا نے کہا:-

"مضمون کے اس دوسرے حصے سے تو میں قیامت تک اتفاق نہیں کر سکتی۔ کیا خود ہماری زندگی اور ہماری محبت اس کی قطعی تردید نہیں؟"

"یقیناً" جمیل نے زور دیتے ہوئے کہا "ممکن ہے دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہو جیسا مجذوب صاحب کا خیال ہے لیکن ہمارا ذاتی تجربہ تو اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہماری شادی کو آج پورے دو برس ہو گئے لیکن تکمیلِ آرزو سے کیا ہماری محبت کی شورانگیزیوں میں کسی قسم کا فرق آ گیا؟"

"نہ آیا ہے اور نہ انشاء اللہ جیتے جی آئے گا" رعنا نے جمیل کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

یہ سب کچھ تھا مگر دونوں اپنی اپنی جگہ پر اس بات کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے حقیقت پر پردہ ڈالا ہے اور قدرتی طور پر اُن کا ضمیر اُنہیں ملامت کر رہا تھا۔ مجذوب کی تحریر کے مطالعے سے رعنا کی طبیعت غیر معمولی طور پر متاثر ہوئی تھی۔ ایک مبہم سا خوف اُس کے سارے وجود پر طاری ہو گیا تھا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ کتنی ہی دیر تک دونوں خاموش رہے۔ اپنے اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے۔ ایک دوسرے کی حالت سے بے خبر۔ مگر درحقیقت دونوں کے خیالات میں کوئی فرق نہ تھا۔ اور دونوں کا احساس بھی کم و بیش یکساں ہی تھا۔

رات کو دونوں بہت بے چین سوئے۔ جمیل نے ایک پریشان خواب دیکھا اور گھبرا کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ رعنا اس وقت بے خبر سو رہی تھی۔ اس کے خوبصورت بال اُس کے گداز مرمریں بازوؤں پر بکھرے ہوئے تھے۔ عالمِ خواب میں اُس کی رعنائی کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔ سوتے میں ایک دل نواز مسکراہٹ اُس کے رنگین لبوں پر کھیل رہی تھی۔ شاید وہ کوئی خوش گوار خواب دیکھ رہی تھی۔ جمیل کو خدا جانے کس وہم نے گھیرا۔ اُس نے رعنا کا بازو پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا۔ رعنا گھبرا کر اُٹھ بیٹھی جمیل کو اپنے سامنے اور اپنا بازو جمیل کی گرفت میں دیکھ کر بہت گھبرائی بظاہر تو گھبرانے کی کوئی بات نہ تھی۔ جمیل نے اُسے تند سے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ بظاہر شک کی کوئی وجہ نہ تھی۔ جمیل کے اس طرزِ عمل سے اُسے حیرت ہونی چاہئے تھی۔ مگر نہیں اُسے حیرت نہیں ہوئی بلکہ وہ پریشان ہو گئی۔ وہ جمیل سے آنکھیں چار نہ کر سکی۔ جیسے اُس نے کوئی جرم کیا ہے۔ جیسے اس کا کوئی خوفناک راز افشا ہو گیا ہے۔ دونوں پریشان تھے۔ بہت پریشان۔ بہرحال کسی طرح صبح ہوئی۔

اُسی دن کسی سرکاری ضرورت سے جمیل کو دورے پر جانا پڑا۔ شام کو پلٹنے کا وعدہ کر کے وہ رعنا سے رخصت ہوا۔ بظاہر دونوں اس طرح ایک دوسرے سے جدا ہوئے جس طرح دو چاہنے والے بلکہ چاہنے والے جن کی طوفانی محبت ہنوز تسکینِ آرزو سے محروم ہو۔

جمیل کے جانے کے بعد رعنا کی طبیعت کو نہ سکون پذیر ہوئی۔ اُس نے آئینے میں اپنا منہ دیکھا۔ پھر بال درست کئے۔ سینٹ اسپرے اُٹھا کر چہرے اور گردن کو معطر کیا۔ پھر کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی اور لکھنا شروع کیا۔

افسر! میرے پیارے! میری زندگی کی یکتا آرزو! للہ بتاؤ تو، تم نے مجھے کیا کر دیا؟ میری پرسکون زندگی کو طوفانوں سے بھر دیا۔ محبت میرے لئے کوئی نیا تجربہ نہیں۔ میں ایک بار پہلے بھی محبت کر چکی ہوں۔ میرا خیال تھا کہ محبت کے متعلق میں سب کچھ جانتی ہوں۔ مگر اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کو میں نے محبت سے تعبیر کیا تھا شاید وہ محبت تھی ہی نہیں۔ دل میں یہ خلش، روح میں یہ تڑپ، طبیعت میں یہ ہیجان جس سے آجکل دوچار ہوں پہلے کبھی میں نے محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ میری آنکھیں تو خواب راحت کی خوگر تھیں۔ اور اب؟ ۔ اب تو ان میں جلن ہے۔ درد ہے۔ آنسو ہیں۔ میں سمجھتی [illegible] میرے لب صرف مسکراہٹوں کے لئے بنے ہیں۔ مگر آج!۔ آج تو فقط پیارے آہوں کے لئے وقف ہیں۔ پہلے تو دل سے اس طرح دھواں کبھی نہیں اٹھتا تھا۔ اُف! رگ رگ میں بجلیاں بھر گئی ہیں۔ سینہ تنور آتشکدہ ہے۔ مگر کتنی لذت ہے اس طرح جلنے اور جلتے رہنے میں۔ زندگی کی ساری راحتیں، ساری مسرتیں اس سوز و گداز پر قربان ہیں۔

آہ افسر! یہ تم نے کیا کر دیا؟ میری زندگی کے دھارے کا رخ ہی پلٹ دیا۔ ان چند مہینے میں میں کتنی بدل گئی۔ کیا سے کیا ہو گئی۔ اپنے انجام پر نظر کرتی ہوں تو دل لرز جاتا ہے۔ کانپ کانپ اٹھتی ہوں۔ پروردگار! میرا حشر کیا ہوگا؟ خدا کی گنہگار۔ بندوں کی مجرم۔ نہ بزرگوں کی عزت و حرمت کا پاس۔ نہ اپنے ننگ و ناموس کی پروا۔ شرافت و غیرت کے معنی بھول گئی ہوں۔ خودداری کا احساس مٹ چکا ہے۔ جان چھڑکنے والے شوہر کے ساتھ غداری کر رہی ہوں۔ دنیا میں تباہی۔ عاقبت میں روسیاہی۔ یہی میرے اعمال کی جزا ہوگی۔ اُف خدا!

مگر میں کیا کروں؟ آہ! جادوگر! تو نے میری روح کو تسخیر کر لیا ہے۔ میرا اختیار رہا وہ مجھ سے چھین لیا ہے۔ زندگی میں اب اس کے سوا اور کوئی آرزو ہی نہیں کہ میری ہستی تیری ذات میں گم ہو جائے۔

اللہ! میں کس قدر ریاکاری برت رہی ہوں۔ اس ڈر سے کہ کہیں انہیں کوئی شبہ نہ ہو جائے ان کے ساتھ اپنی والہانہ شیفتگی کا اظہار اس شد و مد سے کرتی ہوں گویا میری روح کا ذرہ ذرہ ان کی پرستاری کے لئے بیتاب ہے۔ بناوٹی محبت کے اظہار و نمائش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتی اور میری اس مکاری کا اثر بھی ان پر خاطر خواہ ہو رہا ہے۔ ہائے کتنے معصوم، کتنے نیک ہیں وہ۔ میرے فریب کو حقیقت سمجھ رہے ہیں۔ میرے اس طرزِ عمل سے ان کی محبت، ان کا اعتماد، ان کا خلوص پہلے سے ہزار گونہ بڑھ گیا ہے۔ میں یقین کے ساتھ جانتی ہوں کہ انہوں نے میرے سوا زندگی میں کسی سے محبت نہیں کی۔ محبت تو بڑی چیز ہے کسی کے ساتھ انہیں معمولی دل بستگی بھی پیدا نہیں ہوئی۔ ان کی مسرتوں کا سرچشمہ، ان کی آرزوؤں کا مرکز، ان کی زندگی کی کل کائنات صرف ایک میری ذات ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر جیتے ہیں۔ دو گھنٹے کے لئے دفتر جاتے ہیں اور گھر آتے ہیں تو میرے لئے اس درجہ بیتاب جیسے مدت سے مجھے نہیں دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے انہیں میری جدائی گوارا نہیں۔ ذرا دیر کے لئے آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہوں تو بے چین ہو جاتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر کہیں انہیں اس بات کا علم ہو جائے کہ میں . . . . آہ۔ یا تو خدانخواستہ ان کا دماغ الٹ جائے یا وہ خودکشی کر لیں۔

اب تک میں یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھا لیا کرتی تھی کہ اگر میں نے ان کے سوا کسی دوسرے سے محبت کی تو میرا اس میں کیا قصور؟ محبت تو ایک اضطراری جذبہ ہے جس میں اختیار کو دخل نہیں۔ پھر محبت تو یکسر معصوم ہے مادی آلودگیوں سے بالکل پاک۔ اس کا تعلق تو فقط روح سے ہے جسم سے نہیں۔ میرا جسم تو بہرحال انہیں کا ہے۔ محض روحانی محبت تو گناہ نہیں ہو سکتی۔ اس سے نہ مذہب کا قانون ٹوٹتا ہے نہ اخلاق کا۔ نہ سوسائٹی کے نظام میں اس سے خلل پڑ سکتا ہے۔ نہ کسی کی حق تلفی ہوتی ہے۔ غرض میں ہمیشہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دیتی رہی کہ میری محبت پاک اور معصوم ہے مگر "سرورش کے سالنامے میں" مجذوب کی بڑ کے عنوان سے تم نے محبت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر رات میری آنکھوں سے پردے اٹھ گئے۔ میں نے پاک، معصوم اور روحانی محبت کا جو ایک مرفعک محل چنا تھا وہ آنِ واحد میں مسمار ہو کر رہ گیا۔ کیا تمہارے لئے میری شیفتگی محض جنسی میلان کا نتیجہ ہے؟ نہیں افسر! ایسا نہ کہو۔ للہ ایسا نہ کہو میں برباد ہو جاؤں گی۔

میں تو کبھی ایک لمحے کے لئے بھی اس پر آمادہ نہیں ہوئی کہ اپنا جسم تمام و کمال تمہارے حوالے کر دوں۔ میں اسے گناہ، جرم اور خیانت سمجھتی رہی اور سمجھتی ہوں۔ مگر میں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتی کہ

میری انتہائی آرزو یہی تھی اور اس وقت بھی یہی ہے کہ میری ساری ہستی تمہاری ذات میں گم ہو جائے تم میرے سارے وجود پر کچھ اس طرح چھا گئے ہو۔ میرے قلب و روح کے ذرّے ذرّے میں اس طرح سما گئے ہو۔ کہ میں تمہارے بغیر اپنی جداگانہ ہستی کا تصوّر ہی نہیں کر سکتی۔ میرے اللہ مجھ پر رحم کر مجھے تباہی سے بچا لے۔

تم نے سچی اور جھوٹی محبت کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس کا خیال کر کے میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ کیا لازمی طور پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ تمہارا دل مجھ سے بھر جائے گا۔ آہ اختر! کیا تم بھی اسی رعنا سے، جسے اپنی زندگی کی یکتا آرزو کہتے اور سمجھتے ہو، بیزار ہو جاؤ گے۔ خدا نہ کرے کہ میں اس ناقابلِ برداشت روحانی عذاب کو جھیلنے کے لئے اس دنیا میں زندہ رہوں کاش جس وقت میرا جسم پہلی بار تمہارے آغوش میں آسودہ ہو۔ شدتِ مسرّت سے اُسی وقت میری روح پرواز کر جائے۔ اگر میری یہ آرزو پوری ہو جائے تو میں سمجھوں کہ میں نے اپنے حاصل زندگی کو پا لیا۔

محبت کو زندہ رکھنے اور پائیدار بنانے کی تدبیر بھی تم نے بتا دی ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ "فراقِ محبت کی زندگی اور وصال اس کی موت ہے۔" تو پھر کیوں نہ ہم زندگی بھر ایک دوسرے سے جدا رہیں؟ قرب کی نوبت ہی کیوں آئے جو محبت کو صدمہ پہنچے۔ مگر آہ۔ یہ بھی تو اب میرے اختیار میں نہیں۔ برداشت کا پیمانہ لبریز ہو چکا۔ ہے شکیبائی کی اب تاب نہیں۔ اختر! تمہاری جادو بھری آنکھوں کی قسم! جدائی کی اذیت اب موت کی اذیت سے کسی طرح کم نہیں۔ پھر موت کی اذیت تو کیا اس دن کی اذیت ہوتی ہے۔ ایک لمحے میں گذر جاتی ہے۔ مگر یہ عذاب تو میری روح پر مسلسل ہے کب تک اس جاں کنی کے عالم میں گذاروں۔ میں تو آخری فیصلہ کر چکی ہوں۔ تمہارے قرب کی چند روح پرور ساعتوں کے بدلے میں اگر مجھے ابدی عذاب کے شکنجے میں مبتلا ہونا پڑے تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں۔ اگر میں تمہیں صرف اتنی دیر کے لئے پا سکوں کہ اپنی روح کی تڑپ اور دل کی جلن تمہیں دکھا سکوں تو خدا کی قسم! اپنا سب کچھ کھو کر، سب کچھ مٹا کر ان ساعتوں کو خریدنے کے لئے بخوشی آمادہ ہوں۔

رات میں نے تمہیں خواب میں دیکھا۔ کس طرح؟ یہ نہیں بتا سکتی میں کس قدر مسرور تھی۔ اچانک انہوں نے مجھے جھنجھوڑا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی جس وقت ہماری آنکھیں چار ہوئیں میں سہم کر رہ گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے انہوں نے مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا ہے۔ اُن کی آنکھوں سے بدگمانی ٹپکتی تھی۔ میں ڈر گئی۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ خدایا اگر کہیں سچ مچ وہ مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیں۔ تو کیا ہو۔ اُف خدا۔

تمہارے مضامین اور افسانے وہ بھی بے حد پسند کرتے ہیں چنانچہ رات انہوں نے کہا "وہ آپ کے مجذوب صاحب مدت سے نظر نہیں آتے۔" اس پر میں نے تمہارا مضمون پڑھ کر انہیں سنایا اور دیر تک ہم اس پر اظہارِ خیالات کرتے رہے۔ میں نے جھوٹ موٹ تمہارے خیالات کی تردید کی۔ انہوں نے سچے دل سے میری تائید کی۔ مگر ایک بات ہے۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ خدانخواستہ انہیں مجھ پر کسی قسم کا کوئی شبہ ہے لیکن جب کبھی تمہارا ذکر آتا ہے یا تمہارا کوئی مضمون پڑھ کر انہیں سناتی ہوں تو وہ کچھ پریشان سے ہو جاتے ہیں۔ خدا جانے اس کا کیا سبب ہے؟۔

آج وہ باہر گئے ہیں۔ شام کو واپس آئیں گے۔ اگلے ہفتے انہیں کسی سرکاری کام سے چند روز کے لئے کلکتہ جانا ہے۔ راستے آج کل محفوظ نہیں۔ سفر میں خطرہ ہے۔ پھر کلکتہ میں خون و قتل و خون کا بازار گرم ہے اس لئے مجھے ساتھ نہیں لے جائیں گے ورنہ پہلے تو کبھی مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں گئے۔ دورے پر بھی ہمیشہ ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایک بار میں نے کہا تھا "اس میں آپ کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔" انہوں نے کہا۔ "ہاں کچھ زحمت تو ضرور ہوتی ہے مگر کیا کروں ایک لمحے کے لئے بھی تم سے دوری کسی حال میں گوارا نہیں۔"

تو مطلب میرے کہنے کا یہ ہے کہ آئندہ اتوار کے بعد کئی دن میں بالکل تنہا ہوں گی۔ بالکل تنہا اور بالکل آزاد۔ زندگی میں ایسا موقع شاید پھر کبھی نہ آئے گا۔ شاید کیا یقیناً نہیں آئے گا۔

اللہ! کیسے کٹیں گے انتظار کے یہ آٹھ دن اور آٹھ راتیں ملاقات کے تصوّر ہی سے میرا تمام جسم سنسنا رہا ہے۔ جذبۂ مسرّت سے دل کا عجب عالم ہے۔ اچھا خدا حافظ۔

تمہارے لئے سراپا آغوش

تمہاری اپنی رعنا

جس وقت رعنا نے یہ خط لکھ کر تمام کیا جمیل ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں اکیلا، خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ ریل تیزی سے اڑی چلی جا رہی تھی۔ اُس نے اپنا اٹیچی کیس کھول کر پنسل اور کاغذ نکالا اور ایک خط کا مسودہ تیار کرنا شروع کیا:

"جس نے مجھے زندگی کی حقیقی مسرتوں سے روشناس کیا۔ جس نے مجھے دل کا درد اور روح کا گداز بخشا۔ جس نے میری زندگی کو چاندنی، پھولوں اور نغموں کا مجموعہ بنا دیا۔ میں اُسے کیا کہہ کر خطاب کروں؟ اُس کے نام سے زیادہ خوبصورت کوئی لفظ مجھے معلوم ہی نہیں۔

"شہلا" کتنا پیارا، کتنا رومانی، کتنا شاعرانہ نام ہے۔ ادھر قلم سے یہ لفظ نکلا، ادھر وہ غزالی آنکھیں سامنے آگئیں۔ آنکھیں نہیں مستیوں کے دو قرابے۔ قرابے نہیں مستیوں کے دو سمندر۔

شہلا! کتنا خوش نصیب ہے وہ انسان جو تمہارے جسم کا مالک ہے۔ مگر جب سوچتا ہوں کہ جسمانی مسرتیں تو بہت ہی بے ثبات، بہت ہی ناپائیدار ہوتی ہیں۔ اُس سے کہیں زیادہ خوش قسمت تو میں ہوں۔ جسے تم نے اپنی روح کی خلوتوں میں جگہ دی ہے۔

تم اندازہ نہیں کر سکتیں شہلا کہ تمہارا خط پا کر فرطِ مسرت سے میرا کیا حال ہوا۔ مگر اس خیال سے مجھے بیحد اذیت ہے کہ تم آج تک میری بے تیاس محبت کو شک کی نظر سے دیکھتی ہو۔ رعنا کی محبت کے طعنے آخر کب تک دیئے جائیں گے۔ رعنا کے حسن و جمال کا آئینہ دکھا کر کب تک مجھے بہلایا بلکہ بہکایا جائے گا۔ رعنا کی والہانہ پرستاری یاد کرا کے کب تک مجھے شرمندہ کیا جائے گا۔

نہ میں نے کوئی بات تم سے چھپائی۔ نہ کسی حقیقت سے انکار کیا۔ پھر ان طعنوں سے کیا حاصل۔ بیشک مجھے رعنا سے محبت تھی۔ بیشک لوگ رعنا کو تم سے زیادہ حسین کہتے اور سمجھتے ہیں۔ بیشک رعنا آج بھی مجھے ایک بت کی طرح پوجتی ہے۔ مگر ان تمام باتوں سے یہ حقیقت تو نہیں مٹ سکتی کہ تمہاری ساحرانہ آنکھوں کی بے پناہ کشش نے مجھے رعنا سے چھین لیا۔ قصور نہ تمہارا ہے نہ میرا۔ قدرت کو یہی منظور تھا۔

تو پھر تقدیر کو کون بدل سکتا ہے، یہی ہونا تھا۔ جو ہوا۔

کیا میں نے تمہیں لڑکپن میں نہیں دیکھا تھا؟ کیا میں نے تمہیں جوانی میں نہیں دیکھا تھا؟ کیا شادی سے پہلے تم سے ملنے اور کچھ وقت تمہارے ساتھ گذارنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا؟ کیا تمہاری اور نیاز کی شادی میں میری کوششوں کو دخل نہیں؟ کیا آج سے تین سال پہلے یہ ممکن نہ تھا کہ میں تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لیتا؟ مگر جھوٹی خوشامد مجھے پسند نہیں، درحقیقت اُس وقت میں نے کبھی تمہارے اندر کوئی خاص کشش، کوئی خاص بات محسوس ہی نہیں کی تھی۔ تمہاری جادوگر آنکھوں کی ساحرانہ کشش کا پہلے پہل مجھے اُس دن احساس ہوا جب تم اور نیاز بڑے دن کی چھٹی میں چند روز کے لئے ہمارے یہاں آئے تھے۔

مجھے یکایک ایسا معلوم ہوا جیسے میری آنکھوں سے پردے اٹھ گئے۔ اُس دن تم وہ شہلا نہ تھیں جسے میں نے اُس دن سے پہلے سینکڑوں بار دیکھا تھا۔ اُف! تمہاری سیاہ آنکھوں کی بے پناہ کشش میرے لئے قیامت ہو گئی۔ میرا دل بے اختیار تمہاری طرف کھنچنے لگا اور دو تین ہی دن میں ہم دونوں ایک دوسرے سے کتنے قریب ہو گئے۔

تم مجھے رعنا کی محبت کے طعنے کیا دیتی ہو۔ کیا خود تم نے کبھی نیاز سے محبت نہیں کی؟ کیا اُس دن تک تمہیں نیاز سے محبت نہیں تھی۔ پھر اُس دن کیوں بے اختیار تمہارا دل جمیل کی طرف کھنچنے لگا تھا۔ جس جی تو تمہارے نیاز تھا تم نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن کیا محبت کی نظر بھی چھپ سکتی ہے؟ جو بات تمہاری زبان نے مجھ سے نہیں کہی، وہ تمہاری آنکھوں نے مجھے بتا دی۔ دلوں کی خاموش گفتگو آنکھوں ہی کے ذریعہ تو ہوا کرتی ہے۔

شہلا! تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ یہ چار مہینے میں نے کس ذہنی خلفشار میں گذارے ہیں۔ خدا شاہد ہے تمہارے خطوں کا سہارا نہ ہوتا تو شاید مجھے جنون ہو جاتا یا کوئی مہلک مرض میرا خاتمہ کر دیتا۔ میری مصنوعی زندگی ایک زبردست فریب، ایک عظیم الشان جھوٹ ہے۔ میں حد سے زیادہ رعنا سے محبت کا اظہار کرتا ہے اور بے حد شرمندہ ہوتا ہوں۔ وہ معصوم بھولی لڑکی جس نے دنیا میں آنکھ کھول کر صرف مجھی کو دیکھا، مجھی کو چاہا،

(بقیہ بر صفحہ ۱۱۲)

اے حمید

برف گرنے تک

پچھلے کئی دنوں سے برف نہیں گری۔ آسمان پر ہر وقت چھایا رہنے والا گہرا غبار غائب ہو چکا ہے اور چمکیلے سورج کی درخشانی پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ دن بھر روشن اور پُرسکون دھوپ میں چیلیں اپنے پَر تولے وادیوں کے اوپر منڈلاتی رہتی ہیں۔ اور مسلسل برفباریوں سے ٹھٹھرے ہوئے جسموں کو گرماتی ہیں۔ چنار کے درختوں میں ننھے ننھے سُرخ شگوفوں نے قمقمے سے جلا رکھے ہیں اور چیڑھ دھیمی دھیمی خنک مہک دینے لگے ہیں۔ خوبانی، بادام۔ بگگوشے اور آلوچوں کے درخت گلابی، نیم گلابی اور سپید شگوفوں سے لد گئے ہیں اور مکانوں کی ڈھلوانی چھتوں، چھجوں اور بجلی کے کھمبوں پر جمی ہوئی برف پگھل چکی ہے۔ دن اگرچہ سرد ہوا چلتی ہے مگر نیم گرم دھوپ میں، گہرے نیلے آسمان تلے وہ بڑی خوشگوار محسوس ہوتی ہے اور خنک جھونکے شانوں کو ہمدرد دوستوں کی طرح پیار سے تھپتھپاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ لیکن رات کو کافی ٹھنڈ ہو جاتی ہے اور بستر میں گرم پانی کی بوتلیں رکھ کر سونا پڑتا ہے۔ شام کے وقت جب سنہری دھوپ کی چمک ماند پڑ جاتی ہے اور نچان کی وادیوں میں ہلکی ہلکی دھند جالا سا بُننے لگتی ہے تو رات کے مرطوب اور خاموش اندھیرے مکانوں، درختوں اور ڈھلوان پر اُگے ہوئے صندل کے گنجان جنگلوں کو گھیر لیتے ہیں۔ اور اُوپر بلند پہاڑوں کی برف آلود چوٹیوں سے پھسلتی ہوئی ہواؤں کے سرد جھونکے بند کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکراتے ہیں اور اُن پر شبنم سی بکھیرنے لگتے ہیں۔ نیلے آسمان پر چمکیلے ستاروں کی قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں اور بند دروازوں کے عقب میں نیم روشن گرم کمرے چائے اور تمباکو کی لطیف خوشبو سے مہک اُٹھتے ہیں۔ اور دھیمی دھیمی آوازوں میں محبت کی پُرسکون حرارت اور چاشنی پیدا ہو جاتی ہے۔ دھیرے دھیرے ان آوازوں پر خوابوں کے سائے جھک جاتے ہیں اور خواب گاہوں کی روشنیاں اور مدھم ہو جاتی ہیں اور باہر ٹھنڈی نیلی رات کا حُسن نکھرنے لگتا ہے اور ستاروں کی ٹولیاں نامعلوم منزل کی جانب اپنا سفر جاری رکھتی ہیں اور صندل کے جنگلوں کی طرف سے آنے والی خوشبو چیڑھ کی مہک سے ہم آغوش ہو جاتی ہے۔ ناشپاتی، سیب اور آلوچوں کے شگوفے اپنی ریشمی پلکیں موند لیتے ہیں۔ درختوں تلے گہرے تاریک سائے سرگوشیاں سی کرنے لگتے ہیں اور برف آلود پہاڑی بلندیوں سے آنے والے برفیلے جھونکے جب چیڑھ کے نوکیلے جھومروں اور چنار کی نیم خوابیدہ ٹہنیوں کو چھو کر گزرتے ہیں تو وہ جھومنے لگتی ہیں اور ناچنے لگتی ہیں۔ ستارے اپنی بوجھل پلکیں اٹھائے عروسِ شب کا یہ ازلی و ابدی رقص دیکھتے رہتے ہیں جس میں کوئی دائرہ نہیں ہوتا، کوئی قوس نہیں بنتی، کوئی خم نہیں، کوئی پیچ نہیں، کوئی ساز نہیں، کوئی ڈانس نہیں ۔۔۔۔ بے آواز، بے ساز، خاموش و پُراسرار رقص، جھومر جھول رہے ہیں، ٹہنیاں جھوم رہی ہیں، پتے سرسرا رہے ہیں،

سر ۔۔۔۔۔۔ سر ۔۔۔۔۔۔ سر ۔۔۔۔۔۔

جیسے نشے میں ڈوبی ہوئی خنکی سے چُور رقاصہ گھاس پر چل رہی ہو، جیسے محبت کے گرم لمس پر گوٹہ لگے ریشمی آنچل سرک رہے ہوں۔ جیسے برف کی سپید سپید کلیاں گر رہی ہوں ۔۔۔۔۔ سر ۔۔۔۔۔ سر ۔۔۔۔۔ رقص جاری ہے۔ رقص نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔

لیکن پچھلے کئی دنوں سے برف نہیں گری اور ٹیمبر کافی ہاؤس کے خوش شکل پٹھان بیرے کا خیال ہے کہ برف اب نہیں گرے گی کیونکہ

بہار شروع ہو چکی ہے۔ اس بیرے کا رنگ سُرخ و سپید ہے اور قد کاٹھ بے حد موزوں ہے۔ اُس کی مضبوط کمر، چوڑے شانوں اور بھورے رنگ کی آنکھوں کو دیکھ کر اُس پر کافی ہاؤس کے مالک کا گمان ہوتا ہے جو نفرِ بجا بیروں کی وردی پہنے ہوئے ہو۔ مگر جب ٹپ لینے کے لئے اُس کی مضبوط کمر جھک جاتی ہے اور ہونٹوں پر احمقانہ تبسم نمودار ہوتا ہے تو خواہ مخواہ محسوس ہوتا ہے جیسے وہ پیدا ہی اس کام کے لئے ہوا ہو۔ شخصیت کا یہ نمایاں تضاد کافی ہاؤس میں بھی موجود ہے۔ باہر سے دیکھنے پر اس پر ریل گاڑی کا گمان ہوتا ہے لیکن اندر بیٹھ کر آپ کو محسوس ہو گا کہ آپ کسی بحری جہاز کے لانچ میں بیٹھے ہیں۔ جہاں جھکی ہوئی نیچی چھت کا روغن چمک رہا ہے اور کھلی کھڑکیوں پر سبز رنگ کے پردے ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ یہ کافی ہاؤس اوپر بستی کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے واقع ہے۔ کافی ہاؤس کی تمام چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں کا رُخ سڑک کی جانب ہے۔ ہر کھڑکی کے ساتھ ایک میز اور سپید گدی کی تین کرسیاں پڑی ہیں۔ ہر میز پر پیتل کے پھول دانوں میں رنگ برنگ کے پھول مسکرا رہے ہیں۔ آخری کھڑکیوں کی طرف ابھی ابھی دو آدمی آ کر بیٹھے ہیں۔ ان میں ایک بے حد لاغر اور مریل سا ہے۔ اُس کا رنگ ہلدی کی مانند ہے اور گنجے سر کی کنپٹیوں پر چند ایک سفید بال چمک رہے ہیں۔ وہ دونوں ہاتھ بھورے رنگ کے اوور کوٹ میں دبائے ہوئے ہے اس کی چاندی کی موٹھ والی آبنوسی چھڑی اس کے گھٹنے سے لگی ہے۔ وہ بڑی اداس نگاہوں سے نیچے سڑک پر آنے جانے والوں کو تک رہا ہے۔ دوسرے آدمی کا رنگ سیاہی مائل ہے اور بھُوسلے ہوئے بھدّے چہرے پر چیچک کے گہرے داغ دور سے صاف دکھائی دے رہے ہیں اُس کی سفید دھاری دار نیلی اچکن کی اوپر کی جیب میں گھڑی کی طلائی زنجیر لٹک رہی ہے۔ وہ جب سے یہاں بیٹھا ہے کئی بار ناک صاف کر چکا ہے۔ اور بیرے کی آنکھ بچا کر اپنی کرسی کے پیچھے تھوک چکا ہے۔ بیرا کاونٹر کے پیچھے کھڑا اُن کے لئے کافی تیار کر رہا ہے۔

میری پیالی میں کافی کا آخری گھونٹ رہ گیا ہے۔ پائپ میں بھری نائی کا مرطوب تمباکو دھیمے دھیمے سُلگ رہا ہے اور اس کی بو خوشگوار فلیور کے ساتھ کافی کی تلخ گرم مہکوں میں مخلوط ہو رہی ہے۔ سڑک پر سہ پہر کی مانند دھوپ میں لوگ بے فکری سے چل پھر رہے ہیں۔ کسی وقت ایک آدھ کشمیری مزدور سامان سے لدے ہوئے رکشا کو اوپر کی طرف کھینچے لئے جاتا نظر آتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اڈے پر ابھی ابھی کوئی بس آئی ہے اور میدانوں کی گرمی سے بھاگے ہوئے لوگوں کا ایک اور ٹولہ پہاڑوں پر موسم گزارنے آن پہنچا ہے نہ جانے یہ لوگ اپنے ساتھ اس قدر سامان کیوں لاتے ہیں۔ بستر ہی بستر، صندوق ہی صندوق، پنگوڑے، ٹیفن کریز، واشنگ ٹب، منہ دھونے والے بیسن، حقے، لوٹے، کتابیں، چار پائیاں، بکوڈ، سوٹ کیس، اٹیچی کیس، اور ان میں فراک، ریشمی رومال، عطر، خوشبو دار تیل، سیار ڈے کی ہاتھوں کو لگانے والی کریم، منہ کو لگانے والی سنو، نینوں کے دوپٹے، ساٹن کی شلواریں، گرم کوٹ، بے شمار ٹائیاں، ہینگنگ سٹیس، پاؤنڈز، کوٹی، مدورج، ابوننگ ان پیرس، لندن، نیو یارک، رسلے ہوئے تولیے، لمبے چوڑے، اُبھردار جن سے شاور باتھ لینے کے بعد سارا جسم لپیٹ لیا جاتا ہے۔ شاور باتھ لیتے ہوئے کتنا مزہ آتا ہے۔ پانی نرم نرم پھوار خواب آلود گنگناہٹ سے جسم پر برستی ہے۔ جیسے ان گنت ننھے ننھے، نرم نرم ہونٹ بدن کو چوم رہے ہوں۔ جیسے ساون کی ہلکی جھڑی لگی ہو اور جسم بھیگ رہا ہو اور رکشا کھینچنے والے ہاتو کا جسم بھی بھیگ رہا ہے پانی سے، نمکین پانی سے۔ پہاڑیوں پر نمکین پانی زیادہ استعمال کرنا چاہیے ہاتو نمکین شاور باتھ لے رہا ہے! آہا! کتنا مزا آتا ہو گا اُسے ....
جیسے ان گنت ننھے ننھے نرم نرم ہونٹ ...... جیسے ساون کی جھڑی ...... اور جیسے پسینے کے ...... بیل رکشا اوپر کھینچے لئے جا رہا ہے۔
اس کا دم پھولا ہوا ہے اور وہ ہانپ رہا ہے پیچھے ایک اور ٹولی اوپر چلی آ رہی ہے۔ کچھ نوجوان خوش پوش لڑکے، کچھ برقع پوش نوجوان لڑکیاں، سوٹوں کے رنگ ٹائیوں اور ٹائیوں کے رنگ جوتوں سے میچ کر رہے ہیں لیکن گفتگو خوبصورت چہروں سے میچ نہیں کر رہی برقع اڑ رہے ہیں، شلواریں پھڑ پھڑا رہی ہیں، غرارے لہرا رہے ہیں، نقاب اُٹھ رہے ہیں، چہروں پر پاؤڈر کے پھیکے غبار، ہونٹوں پر لپ سٹک کی یاقوتی تہیں، سُرخ، گلابی، گہرے سُرخ ہونٹ، پنجابی بولتے ہوئے، اُردو بولتے ہوئے۔ انگریزی بولتے ہوئے، فقرے، ہنسی، مذاق، قہقہے، آوازیں، خوشبو، تیں،

رقص، سرور .... سرور .... لیکن بے ہنگم، پُرشور، پُر پیچ،

'آئی لائیک بل ٹوپس'

'آئی ہیٹ پلینز'

'ہیلو یو ڈرٹی گرل'

'ڈیم وِدیُو فُولش ....!

ٹولی آگے نکل گئی ہے اور رکشا کھینچنے والا بیل اوپر چڑھائی پر چوک والا موڑ مُڑ گیا ہے۔ اور میرا پائپ دھیمے دھیمے سُلگ رہا ہے۔ سامنے والے گرجاگھر کے پاس دیوار کے درخت تلے ایک بوڑھا راستے سے ٹیک لگائے، آنکھیں بند کئے چھوٹی سی چٹائی پر بیٹھا تسبیح پھیر رہا ہے۔ پاس ہی نگین چبوترے پر ایک نائی اپنے گاہک کا سر مونڈ رہا ہے۔ استرے کا نگین دستہ اُس کی آخری دونوں انگلیوں سے باہر نکلا ہوا ہے اور رگھسا ہوا پھل سرد سر کی آواز سے گاہک کی کھوپڑی پر چل رہا ہے۔ گرجاگھر کے پچھواڑے، راہب خانے کی دیوار کے ساتھ بیچ کی باڑھ لگی ہے۔ ساتھ ہی چھوٹی سی کھائی ہے۔ اس کھائی میں سے ابھی ابھی ایک پٹھان اٹھا ہے اور وہ اب کنارے پر بازار کے ساتھ کھڑا ازار بند ہاتھ میں تھامے، بازار کی طرف منہ کئے ڈھیلا کر رہا ہے۔ گرجاگھر کے مینار کی صلیب پر بیٹھا ہوا تنہا کالا کلوٹا پہاڑی کوّا، گردن ہنہوڑائے عجیب انداز سے پٹھان کو تک رہا ہے۔ وہ کیا دیکھ رہا ہے؟ وہ کیا سمجھنے کے لئے اپنے ننھے سے دماغ پر زور ڈال رہا ہے؟ اب جانور بھی انسانوں کو یوں گستاخانہ گھورنے لگے ہیں۔ شاید انہیں ابھی تک علم نہیں ہوا کہ انسان ترقی کے تمام مدارج طے کر چکا ہے اور اب وہ پورا مہذب بن گیا ہے، لیکن یہ مکار کوّا اتنا بے شرم کیوں ہے؟ اُسے پتہ نہیں انسان ڈھیلا کر رہا ہے، آخر جانور جو ٹھہرا، کالا کلوٹا، مکار جانور، بے شرم بے حیا جانور۔ شی، شی!! اُڑ جا، اُڑ جا، اُدھر مت دیکھ، اِدھر بندہ ہے، اُدھر گرجا ہے، اِدھر شاہ دربار ہے، نہیں اُڑتا؟ نہیں جاتا؟

ڈیم وِدیُو فُولش ....

گرجے کی دیواروں سے چمٹی ہوئی بیل میں ہری ہری پتیاں نکل رہی ہیں۔ گوتھک طرز کا لمبا اونچا دروازہ بند ہے۔ اور اُس کے اوپر انگور کی بیل نے گھونگھٹ سا ڈال رکھا ہے۔ بیل کے سبز چوڑے چوڑے پتوں میں کہیں کہیں سیاہی مائل گہرے قرمزی رنگ انگوروں کے گچھے لٹک رہے ہیں۔ بیل کا ایک سرا تاگے سے باندھ کر مینار کی طرف لے جایا گیا ہے۔ چوڑے پتے صرف چھت تک پہنچ سکے ہیں۔ یہ بیل نہ جانے مخروطی مینار کی صلیب تک کب پہنچے اور کب وہاں قرمزی انگوروں کے گچھے روشن دھوپ میں چمکیں۔ مسلسل برفباری کی وجہ سے صلیب کا رنگ سیاہ ہو رہا ہے اور کوّا بدستور گردن جھکائے نیچے تک رہا ہے۔ ... بے شرم جانور! گرجے کے صحن والے پلاٹ کی نرم لچکیلی گھاس ابھی تراشی نہیں گئی۔ پلاٹ کے وسط میں ٹُنگ کا چھوٹا سا درخت ہے جس کی ٹہنیاں سفید شگوفوں سے لدی پھندی ہیں۔ کسی وقت ہوا کا جھونکا ذرا تیزی سے گذر جاتا ہے تو شگوفوں کی نازک پتیاں جھڑ جھڑ کر نیچے گرنے لگتی ہیں اور گھاس کے سبز خوشوں پر کہکشاں سی بن گئی ہے۔ پلاٹ کے چاروں طرف خاردار جنگلہ ہے۔ جنگلے کے پرلی طرف قدرے اونچی جگہ پر خوبانیوں کے درختوں تلے دو تین بھیڑیں پتھروں کے درمیان، اُگا ہوا گھاس چر رہی ہیں۔ کسی وقت وہ قدم قدم چلتی خاردار جنگلے کے قریب آ کر پلاٹ کے ہرے بھرے گھاس کو للچائی ہوئی نگاہوں سے تکتی ہیں اور گرجے کے بند دروازے کی طرف منہ کر کے ایک آدھ بار ممیاتی ہیں اور پھر واپس مُڑ جاتی ہیں۔

'عیلےٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا'

'معصوم بھیڑوں کو میرے قریب آنے دو۔ وہ عبادت کرنے آتی ہیں'

اور گرجاگھر کے پادری نے خاردار باڑھ لگواتے ہوئے کہا تھا۔

"معصوم بھیڑوں کو دور ہی رہنے دو۔ وہ پھولوں کا ستیاناس کرنے آتی ہیں۔"

لیکن معصوم بھیڑیں بڑی ڈھیٹ ہیں۔ ان کے ضمیر بالکل مردہ ہو گئے ہیں۔ وہ پھر بھی گرجے کے بند دروازے کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر میاتی ہیں اور ناامید ہو کر واپس مڑ جاتی ہیں۔ اور نہ جانے کب تک یونہی ..... آتی رہیں گی اور واپس مڑتی رہیں گی.....

معصوم بھیڑیں خوبانیوں کے درختوں تلے گھاس چر رہی ہیں۔ بوڑھا آنکھیں بند کئے ٹاٹی پر بیٹھا تسبیح پھیر رہا ہے۔ کھائی کنارے بازار کی طرف منہ کئے پٹھان ابھی تک ڈھیلا کر رہا ہے اور کتا اسے بار بار دیکھ رہا ہے۔ نائی کا کھنڈا استرا گاہک کے آدھے سر کا صفایا کر چکا ہے۔ اور گرجا گھر کے اوپر ـــــ ٹیلے پر، سامنے والے کاٹیج ماؤنٹ ویو میں ٹھہری ہوئی تینوں لڑکیاں اپنے لان میں نکل آئی ہیں۔ ان کی سہ پہر کی چائے کا وقت ہو چکا ہے۔ وہ جب سے اس کاٹیج میں آئی ہیں سہ پہر کی چائے اپنے لان میں بید کے درخت کے قریب بیٹھ کر پیتی ہیں اور انہیں یہاں آئے چند ہی روز ہوئے ہیں۔ آخری برف باری کے موقع پر وہ یہاں نہ تھیں۔ ماؤنٹ ویو برفیں پگھلنے سے پہلے پہاڑ کی دوسری کوٹھیوں کی مانند بند پڑا تھا۔ ان دنوں جبکہ برف لگاتار گرتی تھی اور دن رات برف کے طوفان وادیوں میں چیخا کرتے تھے۔ ماؤنٹ ویو کے نوکران برآمدے میں دو ایک کشمیری کنبے مقیم تھے۔ عورتوں اور آدمیوں نے مل کر برآمدے کو تینوں اطراف سے نمدوں سے ڈھانپ دیا تھا۔ مگر نمدے پھٹے ہوئے تھے اور جگہ جگہ سے میلی روئی باہر جھانک رہی تھی۔ رات کو جب برف گرتی تو تیز ہوائیں فراٹے بھرتی برآمدے میں گھس جاتیں اور ان بوڑھی کشمیری عورتیں پھٹے پرانے فرن پہنے دونوں ہاتھوں سے برف باہر پھینکتی دکھائی دیتیں۔ رات بھر ان کے بھوکے ننگے بچے سردی میں روتے رہتے۔ عورتیں انہیں جھڑک جھڑک کر چپ کرانے کی کوشش کیا کرتیں اور مرد دونوں کو گالیاں دیتے رہتے۔ سارا دن نمدوں کے سوراخوں میں دھوئیں کے گاڑھے مرغولے باہر نکلا کرتے اور مرد باہر برف میں گھٹنوں تک دھنسے کلہاڑیوں سے جھاڑیوں کو کاٹتے رہتے۔ شاید جلانے کے علاوہ انہیں کھاتے بھی تھے۔ کیونکہ دن بھر سوائے جھاڑیاں کاٹنے کے انہیں اور کوئی کام نہ ہوتا تھا۔ جھاڑیاں بڑی مفید ہوتی ہیں۔ ان میں تمام طاقتور وٹامن موجود ہوتے ہیں۔ جب ہی وہ آپس میں خوب لڑا کرتے تھے اور کبھی کبھی ہاتھا پائی تک بھی نوبت پہنچ جاتی اور یہ لڑائی ہمیشہ جھاڑیوں کی کٹائی اور انہیں تقسیم کرنے پر ہوتی تھی۔

لیکن جب پہاڑوں پر برفیں پگھلنا شروع ہو گئیں اور آلوچوں، خوبانیوں، ناشپاتیوں اور سیب کی برف میں بھیگی ہوئی ننگی ٹہنیوں پر سفید، گلابی اور سرخ شگوفے پھوٹنے لگے اور دن روشن اور راتیں چمکیلی ہو گئیں اور نیچے ـــــ نیچے گنجان شہروں، تنگ گلیوں، گندے مکانوں اور مکانوں کے تاریک بلوں میں رہنے والے بیمار مدقوق چوہوں نے گرمی گرمی پکارتے ہوئے پہاڑوں کا رخ کیا تو ماؤنٹ ویو کاٹیج کے برآمدے میں جھولتے ہوئے پھٹے پرانے نمدے لپیٹ دیئے گئے۔ برف میں گھٹنوں تک ڈوب کر کاٹی ہوئی جھاڑیوں کے گٹھے باندھ لئے گئے۔ چولہے ڈھے گئے اور غلیظ فرنوں والی عورتیں، روتے بسورتے ٹھٹھرتے ہوئے بچے اٹھائے اپنے کرخت چہروں والے مردوں کے پیچھے پیچھے نیچے اتر گئیں۔ نیچے گرجا گھر تھا، اس کا بند دروازہ تھا اور صحن والے پلاٹ میں اگی ہوئی گھاس تھی اور اس کے ارد گرد خاردار جنگلا تھا۔ عورتیں اور مرد جنگلے کے پاس پہنچ کر پل بھر کے لئے رکے ویران نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور پرلی طرف دیودار کے درختوں کی طرف چل پڑے۔ بھیڑوں کو دور ہی رہنے دو۔ یہ ہری ہری گھاس کا ستیاناس کر جاتی ہیں۔ اور بھیڑیں درختوں کے عقب میں غائب ہو گئیں۔ گنجان کی چراگاہوں میں اتر گئیں۔ اور ان چراگاہوں سے بھی نیچے ـــ بہت نیچے، گنجان شہروں کی سنگین چار دیواری میں رہنے والی بھیڑیں اوپر آ گئیں۔ اور ماؤنٹ ویو کی سبز کھڑکیوں پر ہلکے سبز جالی دار پردے لہرانے لگے۔ ڈرائنگ روم کا فرش قالین کی دبیز تہہ سے ڈھک گیا۔ پھول دار صوفے آتشدان کے قریب کھسک آئے اور ان پر نرم گرم کشن اور کارنس پر چینی کے پھولدان اور پھولدانوں میں خوبانیوں کی پھولوں بھری ٹہنیاں سج گئیں۔ برآمدے میں لٹکتے ہوئے گملوں میں خاردار گھاس کے لمبے خوشے باہر

جھولنے لگے۔ لان کی گھاس ہموار کی گئی اور وہاں بید کی سبز کرسیوں کے درمیان تپائی پر تیل کے رکھ دان میں عنبری ناگن کے سگریٹ بجھنے لگے۔ آتش دان میں دھڑا دھڑ کھنگلے اور لکڑیاں جلنے لگیں اور ان کا دھواں نمدوں کے سوراخوں کی بجائے دودکش میں سے نکلنے لگا۔ اور دن ڈھلے جب سنہری دھوپ میں گہرے نیلے آسمان تلے خنک ہوا پھولوں کی خوشبوؤں سے گرانبار ہو کر صندل کے جنگلوں میں جھومنے لگتی تو تین لڑکیاں شاندار لباس پہنے، لان میں سیب کے درخت کے پاس کرسیوں پر آکر بیٹھ جاتیں۔ اور ایک موٹی عورت تپائی پر چائے کا سامان چننے لگتی۔ وہ تینوں لڑکیاں اس وقت بھی سنہری دھوپ کی مدہم چمک میں کرسیوں پر بیٹھی ہیں۔ موٹی عورت ابھی چائے کا سامان نہیں لائی۔ ہوا دھیرے دھیرے چل رہی ہے اور سیب کی ٹہنیاں بے معلوم انداز میں جھول رہی ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکی جس نے ساٹن کی سفید شلوار، سفید قمیص اور گلے میں نیلوں کا نارنجی دوپٹہ ڈال رکھا ہے گود میں ہلکے نیلے رنگ کی اُون کا گولہ لئے سلائیوں سے کچھ بُن رہی ہے گھونگریالے بال اُس کے گول گول شانوں کو چھو رہے ہیں۔ دوسری لڑکی کا رنگ گورا اور سرخ ہے قد چھوٹا اور بال گہرے سیاہ ہیں جنہیں اس نے عجیب انداز سے اکٹھا کر کے گردن پر گوندھ رکھا ہے۔ یہ لڑکی نیلے باڈر والی سلیٹی رنگ کی ساڑھی میں ملبوس ہے اور آرام کرسی پر نیم دراز اخبار کا مطالعہ کر رہی ہے۔ تیسری لڑکی کا رنگ بالکل زرد ہے۔ وہ بڑی دبلی پتلی لاغر سی ہے اور بسنتی رنگ کا غرارہ اُس کے اپنے رنگ سے خوب میچ کر رہا ہے بھورے رنگ کے بالوں کی دو لٹیں اس کے کندھوں سے ہوتی ہوئی چھاتیوں پر پڑی ہیں۔ ماتھے پر بالوں کے بڑے بڑے لف دو بھوری چٹانیں سی بنا رہے ہیں۔ اس کے ہونٹوں پر لپ سٹک کا احمریں رنگ دور سے دمک رہا ہے اور وہ اُداس نگاہوں سے سیب کی شگوفوں سے لدی ہوئی ڈالیوں کو دیکھ رہی ہے اور عنبری ناگن کے ہلکے ہلکے کش لے رہی ہے۔ موٹی خادمہ دروازے پر نمودار ہوتی ہے۔ اُس کے ہاتھ میں چائے کے سامان سے بھرا ہوا ٹرے ہے۔ وہ ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی اُن کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ہلکے زرد رنگ کی پھولدار چائے دانی خوبصورت نازک پلیٹوں میں چمکتا ہوا آلوچے کا مربہ، ہلکے زرد رنگ کی چیکوسلاویکی پیالیاں اور ان میں گرتی ہوئی گرم خوشبودار، سنہری چائے، نرم گھاس، سیب کے شگوفے، سنہری دھوپ، نیلا آسمان، پھولوں کو چھو کر آتی ہوئی ہوا کے مہکے ہوئے پُرسکون جھونکے نیم روشن خوابگاہیں، قالین، کُشن، آتشدانوں میں دہکتی ہوئی آگ، اور عنبری ناگن کی خوشگوار مہک —— انسان کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے وہ کشمیری کنبے، وہ جھاڑیوں کی کٹائی پر جھگڑنے والے مرد، وہ گندے فرنوں والی عورتیں اور روتے ہوئے غلیظ بچے یہاں سے کیسے چلے گئے تھے ؟

بدذوق ..... غیر آرٹسٹ ..... نان سینس .... شاید وہ نیچے وادیوں میں نکل گئے ہوں۔ شاید انہوں نے جنگل میں کسی جگہ چیڑھ کے درختوں تلے دری نمدے لگا کر چھوٹا سا گھر بنا لیا ہو اور رات کو عورتیں بچوں کو چپ کراتی ہوں اور مرد انہیں موٹی موٹی گالیاں دے رہے ہوں اور جھاڑیوں کی کٹائی پر ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو رہے ہوں اور چولہوں میں آگ سلگ رہی ہو نمدے کے سوراخوں سے گاڑھے دھوئیں کے مرغولے نکل رہے ہوں۔ دھواں، جھونکیں، پھر دھواں، اور کھانسی اور موت ...... یہ لوگ کتنی جلدی دنیا کے دُکھوں سے نجات حاصل کر جاتے ہیں —— خوش قسمت لوگ، آزاد لوگ! حسین چہرہ ہے!! رومانی گدگدیئے —— !!!

چولہے میں آگ نہیں جل رہی۔ ٹین کی زنگ آلود بالٹیوں میں پانی گرم نہیں ہو رہا۔ دھوئیں میں دم گھٹا جا رہا ہے۔ پانی ابھی گرم ہو جائے گا۔ اور ہلکے زرد رنگ کی چیکوسلاویکی پیالیوں میں سنہری اور خوشبودار چائے گرنے لگے گی۔ نازک پلیٹوں میں آلوچے کا لذیذ مربہ پڑا ہو گا اور گندے فرنوں والی عورتیں اور کرخت چہروں والے مرد تپائی کے اردگرد جمع ہو جائیں گے اور وہ پودوں کی جڑیں رغبت سے کھانا شروع کر دیں گے .... درختوں اور پودوں کی جڑیں بڑی طاقتور ہوتی ہیں۔ شروع شروع میں انسان یہی کھایا کرتے تھے اور وہ دیر تک زندہ رہا کرتے تھے۔ وہ لوگ بڑے مضبوط تھے اور چیکوسلوویکیہ کی پیالیاں بڑی خوبصورت ہوتی ہیں۔ جہاں کی پیالیاں اتنی خوبصورت ہیں وہاں

کے لوگ کیسے ہوں گے۔ اے گندے فرن والی غلیظ عورت! چیکوسلوکیہ چلو، وہاں کی پیالیاں بڑی خوبصورت ہوتی ہیں، وہاں چولہوں میں گیلی لکڑیاں نہیں جلتیں، اور دھواں نمدوں کے سوراخوں کی بجائے دودکشوں میں سے ہوکر گزرتا ہے اور اخیر دسمبر کی راتوں میں جب برف کے طوفان وادیوں میں چیختے ہیں اور چٹانوں کے ٹوٹ کر گرنے کی مہیب آوازیں آتی ہیں تو لوگ برآمدوں میں پھٹے ہوئے نمدوں کے پیچھے ٹھٹھر ٹھٹھر کر مرنے کی بجائے بند کمروں میں آتشدانوں کے قریب بیٹھے ہوتے ہیں گرم و پُرسکون کافی سے لبریز پیالیاں ان کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں اور زبان پر حسین ترین شہزادیوں اور جنگجو جرنیلوں کی عشقیہ داستانوں کا ذکر ہوتا ہے۔ لیکن تم چیکوسلوکیہ کیسے جا سکتی ہو، ابھی تمہیں آگ جلانا ہے ابھی لکڑیاں گیلی ہیں، ابھی کھنگلے ملدار ہیں، ابھی پانی گرم نہیں ہوا۔ ابھی دھوئیں میں دم گھٹ رہا ہے۔ زور سے پھونکو شاید ایکدم شعلہ بھڑک اٹھے اور دھوئیں کا سیاہ غبار چھٹ جائے اور پھر پانی کھولنے لگے اور پیالیوں میں سنہری چائے گرنے لگے اور سیب کے شگوفے مسکرا اٹھیں اور آلوچے کا مرتبہ پھول، خوشبو، روشنی، قہقہے، زندگی، رقص، شادابی، فرحت........

ماونٹ ویلیو کے عقب میں ذرا اوپر جاکر ایک ٹیلے پر چیڑھ کے جھرمٹ تلے سینی ٹوریم کی سرخ ڈھلوانی چھتیں صاف نظر آ رہی ہیں۔ سینی ٹوریم کی تقریباً تمام کھڑکیوں کے پٹ کھلے ہیں اور صحن کے باغ میں چند ایک مریض۔ کندھوں پر سرخ کمبل ڈالے۔ بنچوں پر بیٹھے ہیں۔ وہ سکڑے ہوئے سے ہیں اور اپنی نحیف گردنیں جھکائے ٹکٹکی باندھے ٹہنی میں گھومتی پھرتی بھیڑوں کو تک رہے ہیں، ایک نرس برف ایسے سفید لباس میں ان کے قریب ہی درختوں کے درمیان تنی ہوئی الگنی پر سفید سفید گیلے رومال پھیلا رہی ہے۔ نرس کا جسم بیحد دُبلا ہو رہا ہے۔ کسی روز یہ بھی گیلے رومال پھیلاتی ہوئی سینی ٹوریم میں داخل ہو گی پھر کبھی کبھی سرخ کمبل شانوں پر ڈالے باہر نکلا کرے گی اور بنچ پر بیٹھ کر اپنی نحیف گردن جھکائے ٹہنی میں گھاس چرتی ہوئی بھیڑوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھا کرے گی پھر کسی شام کو چپ چاپ سو جائے گی اور اس کا جسم رات کی دلگداز خاموشی میں سینی ٹوریم کے پچھواڑے دفن کر دیا جائے گا۔ برفباری کے دنوں میں سارا دن سینی ٹوریم کے دروازے بند رہتے تھے اور رات کو کھڑکی کے گدلے گدلے شیشوں میں سے بیمار روشنیاں جھانکا کرتی تھیں۔ انہیں دیکھکر قبرستان میں رات کے وقت چلنے والے مدہم لیمپوں کا خیال آجاتا تھا۔

ایک مریض کمبل کو شانوں پر درست کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے۔

"منھی پھر بیمار ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر اسے میرے پاس بھیجنا چاہتے ہیں۔ یعنی ان کا خیال ہے کہ وہ بھی —— میرا مطلب ہے اُسے بھی پہاڑی آب و ہوا کی ضرورت ہے!"

اس کے ساتھی مریض کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ہے وہ ایک پرانے کتبے کی مانند ہے جو کسی قبر کے سرہانے لگا ایک طرف کو جھک سا گیا ہو —— سرد، بے جان، بے روح......

"اس سے کیا ہو گا؟ پہاڑ کی آب و ہوا کیا کرے گی؟ اونہہ!"

شاید اس کے بھینچے ہوئے ہونٹوں پر زہر پھیل رہا ہے، شاید وہ اپنے پھیکے، پژمردہ ہونٹ کاٹ رہا ہے اور ماونٹ ویلیو کے لان میں سلیٹی رنگ کی ساڑی زرد رنگ کا لذیذ کیک کاٹ رہی ہے اور اس کے ہونٹوں میں مربّے کی مٹھاس رچی ہوتی ہے۔

"کل ڈیڈ بھی آ رہے ہیں۔ وہ اپنی کار پر آئیں گے۔ آہا خوب سیر کریں گے!"

ہاں ہاں! خوب سیر کریں گے۔ خوب مربّہ کھائیں گے۔ خوب تسبیح پھیریں گے۔ خوب ڈھیلے کریں گے، اور خوب سر منڈائیں گے

...... یہ کوا ابھی تک صلیب پر بیٹھا نیچے پٹھان کو کیوں دیکھ رہا ہے ؟

بے حیا جانور!

سڑک پر ایک اور ٹولا نمودار ہوا ہے ۔ شاید یہ آخری موٹر سائیکل ہیں ۔ برقعے ، ریشمی ، نیلے کالے ، قرمزی ۔۔۔ نقاب اُٹھے ہوئے ، گرے ہوئے ، ڈھلکے ہوئے ۔ شلواریں ، ساڑھیاں ، پتلونیں ، شیروانیاں ، اور کوٹ چسٹر ، گرم چادریں ، باتیں ، باتیں اور باتیں .... گنجے سر ، چھڑیوں کے سہارے سے چلتے ہوئے جھکے جھکے بوڑھے جسم ، دھنسی ہوئی ویران آنکھیں ، سوکھے ہوئے چہرے ، زرد گالوں پر اُبھری ہوئی ہڈیاں ، بھکی آوازیں ، پژمردہ قہقہے ، سوگوار ہنسی ، میدانوں کی بھیڑیں ، قربانی کی بھیڑیں ، گلیوں کے چوہے ۔۔۔ سنگین چھتوں تلے سارا دن رجسٹروں پر جھکے رہنے والے مریض ۔ بہی کھاتوں کو ساتھ لے کر تجوریوں کے سائے میں سونے والے بیوپاری ، پھولی ہوئی توندیں ، ہانپتے نتھنے ، مٹیالے چہرے ۔۔۔ اکھڑے اکھڑے سانس !

’ڈاکٹر صاحب کھانا ٹھیک سے ہضم نہیں ہوتا ۔‘

’میاں صاحب یہ گرمیاں پہاڑ پر گذاریں ‘

’ڈاکٹر !۔۔ اب تو ہلکی ہلکی کھانسی بھی شروع ہوگئی ہے ‘

’حضور ! پہاڑ پر تشریف لے جایئے ۔‘

’ڈاکٹر صاحب ۔ مجھے بھوک کیوں نہیں لگتی ، حالانکہ میں ہر روز صبح شام کا رپر سیر کو جانا میری عادت میں داخل ہے ۔‘

’ملک صاحب ! سیزن پہاڑ پر کاٹیں ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ‘

اور اب سب ٹھیک ہو گیا ہے کیونکہ سب مریض پہاڑ پر جمع ہو گئے ہیں اور پہاڑ ہی ایک ایئر کنڈیشنڈ ہسپتال بن گیا ہے ۔ پہاڑ کی صاف ستھری ہوا میں ہزاروں بیماریوں کے جراثیم سرایت کر گئے ہیں ۔ ہوائیں بیمار ہو گئی ہیں ، انہیں ہلکی ہلکی کھانسی رہنے لگی ہے ، اب وہ کونسے ہسپتال میں جائیں ؟ وہ کس پہاڑ پر گرمیاں گذاریں ؟

برقعے ، پتلونیں ، شلواریں آگے نکل گئی ہیں ۔ اب ایک ہاتو رکشا کھینچے چلا آ رہا ہے ۔ رکشے پر سامان کا انبار لدا ہے ۔ ہاتو اُسے جنگل کھینچ رہا ہے ۔ ایڑی چوٹی کا زور لگانے سے اُس کی گردن پر رگیں تنی ہوتی ہیں اور رینڈلیوں کی مچھلیاں اُبھر آتی ہیں ۔ کنپٹیوں کی نسیں پسینے میں شرابور ہیں ، وہ کمر جھکائے ۔ ہانپتے ہوئے یوں رکشا اوپر کھینچ رہا ہے جیسے اُس پر سامان نہیں بلکہ ساری دنیا لدی ہے ۔ اس دنیا کے تمام سنگین شہر لدے ہیں اور ان شہروں کے ہزاروں ، لاکھوں ، کروڑوں انسان ، مٹی کے ، لوہے کے ، سونے کے انسان سوار ہیں اور وہ اکیلا تن تنہا ، انہیں کھینچے لئے جا رہا ہے ۔ یہ ہاتو انسان نہیں ہو سکتا ، یہ یقیناً کوئی پہاڑی بیل ہے ۔ جو اپنے مالک کے ڈر سے بخوشی ہر کام سرانجام دے رہا ہو ۔ اسے بے زبان پہاڑی بیل ! تو صرف اس سڑک پر ہی نہیں ہے ۔ تو تو چوتھائی دنیا کے ہر شہر ، ہر سڑک ، ہر گلی ، ہر گھر میں ہے ۔ تو کتنے خلوص سے لوہے اور سونے کے آدمیوں کا بوجھ چپ چاپ کھینچے لئے جا رہا ہے جب تک سڑکوں کی اونچ نیچ باقی ہے ، جب تک دنیا میں اترائی چڑھائی موجود ہے ، تیری پیٹھ پر یہ ناقابلِ برداشت بوجھ لدا رہے گا اور تیری کمر جھکی رہے گی اور تیری پیشانی کا پسینہ تیری پنڈلیوں پر بہتا رہے گا اور تو پالتو جانور کی طرح اسی انداز میں ہانپتا ۔ کانپتا کبھی اوپر چڑھتا رہے گا اور کبھی نیچے اترتا رہے گا اور میدانوں کا پسینہ پہاڑوں کی طرف اور پہاڑوں کے پتھر میدانوں میں لڑھکتے رہیں گے ۔ کسی چشمے میں تجھے اپنے سینگوں کے نیزے دکھائی نہیں دیتے ، تیرے بدن پر ہر جگہ نوکیلے سینگ نہیں نکل آتے اسے کم عمر بیل ! پھر تو رکشا چھوڑ کر ایک دم تن کر کھڑا ہو جائے گا ۔ اور رکشے پر لدا ہوا سارا سامان ، سارا لوہا ، اور سارا سونا نیچے میدانوں کی طرف لڑھک جائے گا اور پھر پہاڑوں پر بہت بڑا لینڈ سلائیڈ ہو گا اور چٹانیں ٹوٹ کر وادیوں میں گر پڑیں گی

اور ہر شے ہموار ہو جائے گی، ہر شے ٹھیک ہو جائے گی، پھر کھانا بھی ہضم ہوا کرے گا، پھر بھوک بھی خوب چمکا کرے گی .... لیکن ابھی نہیں ہے —— ابھی جس چشمے میں تو نے اپنے سینگوں کے نیزے دیکھے ہیں، اس کا پانی گدلا ہے اور اس کی سطح ناصاف ہے، ابھی ٹیمز کافی ہاؤس اور ماؤنٹ ویو کے درمیان گرجا حائل ہے اور گرجے کے صحن کو خاردار جنگلے نے گھیر رکھا ہے۔ ابھی پٹھان نے ڈھیلا ختم نہیں کیا اور چنار کے تنے سے ٹیک لگائے بوڑھا کشمیری آنکھیں بند کئے تسبیح پھیر رہا ہے اور میرا پائپ بجھ گیا ہے۔

کافی بھی تو ختم ہو گئی ہے۔ ٹیمز کی کافی کتنی خوشگوار ہے اور خاص طور سے کریم کافی کا ذائقہ تو بیحد لذیذ ہوتا ہے۔

بیرا —— بیرا کافی اور لاؤ۔

'بہت اچھا صاحب'۔

صاحب بہت اچھا ہے مگر پٹھان بیرا بہت اچھا نہیں ہے۔ وہ آخری کھڑکیوں والی میز کے گرد بیٹھے خاموش گاہکوں سے جھک کر ٹپ لے رہا ہے، اور سلام کرنے کے بعد دانت نکالے احمقوں کی طرح ہنس رہا ہے۔ ہنسو، ہنسو، ہنسنا ہی زندگی ہے مگر مت جھکاؤ اس کی مضبوط کمر میں یہ لچک کس نے پیدا کر دی ہے بخششیں کی دونی نے؟ یہ دونی اس قدر وزنی ہے کہ اٹھاتے ہوئے آدمی کی کمر جھک جاتی ہے؟ اگر اس بیرے کو جھکنا ہی تھا تو یہ اس قدر تنومند کیوں تھا، دیودار کے درخت تو کبھی نہیں جھکتے، وہ اکھڑ جاتے ہیں مگر سر نہیں جھکاتے —— شاید یہ دیودار نہیں بید مجنوں ہے —— لیکن مجھے اس سے کیا، وہ بید مجنوں ہو یا بید لیلٰے۔ مجھے پائپ سلگانا چاہئے۔

ابھی کوئی دم میں گرم گرم کافی آنے والی ہے۔ آج تو کافی کا فلیور غضب کا ہے۔ وہ پہاڑی بیل رکشا سمیت اوپر چوک میں پہنچ گیا ہے یہاں سے وہ کسی تنگ سی پہاڑی سڑک پر ہو جائے گا اور درختوں کے سایوں میں کسی سپرنگ لاج، پائن ٹاپس یا سنو ولا کے آگے رکشا روک لے گا اور کسی پتھر پر بیٹھ کر پسینہ پونچھے گا، قمیص سے ہوا کرے گا اور پھر سارا سامان ایک ایک کر کے اندر لے جائے گا۔

اُوا، اسے کس طرح اٹھاتا ہے، سڈیم فول یہ ریڈیو ہے، او تم بالکل گدھا ہے۔

اور جب صاحب بہادر گدھے کے ہاتھ میں چونی دے گا تو گدھے کو ساری دنیا قوس قزح کے رنگوں میں ڈھلتی نظر آئے گی اور گدھا خوشی خوشی اپنے گھر کی راہ لے گا اور پھٹا ہوا نمدہ اٹھا کر بیوی سے کہے گا۔

'نیاز بُو، بادی دیکھ میں کیا لایا ہوں۔ اٹھ چائے تو بنا دے'۔

نیاز بُو۔ گندے، خزاں اور بجھے ہوئے بدبودار بالوں والی نیاز بو، کشمیر کی شہزادی اپنے سرتاج کے لئے ٹین کے سیاہ کالے ڈڈ گے میں پانی گرم کرنا رکھ دے گی۔ گیلی چھانگڑیاں سلگنے لگیں گی، پھونکیں، دھواں، کھانسی، موت!

یہ لوگ کتنی جلدی دنیا کے دکھوں سے نجات پا جاتے ہیں —— خوش قسمت لوگ!!

کافی ہاؤس میں کچھ اور لوگ اگر ادھر ادھر بیٹھ گئے ہیں۔ گنجے سر والا مدقوق آدمی بدستور خاموش نگاہوں سے سڑک پر کنارے والے درختوں کو تک رہا ہے۔ چیچک کے داغوں والا اس کا ساتھی اس دوران میں کئی بار ناک صاف کر چکا ہے اور بیرے کی آنکھ بچا کر کرسی کے پیچھے تھوک چکا ہے۔ میرے ساتھ والی میز پر ایک سندھی تاجر بغیر پھندنے کی گہری سرخ ٹوپی والا سر ہلا ہلا کر اپنے پنجابی بیوپاری دوست سے تازہ ترین تجارتی حالات پر تبصرہ فرما رہا ہے۔ پنجابی بیوپاری سندھی تاجر کی پیالی میں کریم انڈیلتے ہوئے بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہا ہے۔ کون کہتا ہے سندھی اور پنجابی آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ کافی ہاؤس میں تو اس وقت وہ دو بھائیوں کی طرح بیٹھے ہیں۔ جن کا آپس میں کوئی اختلاف نہ ہو، جو ہر بات پر متفق ہوں۔ سندھی تاجر کی سانولی رنگت میں ہلکے نیلے پن کی آمیزش ہے اس کی گول گول آنکھیں ایسے پتھر ہیں جو کسی جوہڑ کی تہہ میں پڑے ہوں۔ سرد اور بے حس! ——

"سالا اب کراچی مارکیٹ بھی ڈاؤن ہو رہا ہے۔ لاہور (لاہور) مارکیٹ تو ایک دم گر گیا ہے ــــ کھال اور سوڈے کا بھاؤ کمیال ہے اور ابھی چڑھے گا، سالا ہمارے پاس تو اس کا کافی سٹاک جمع ہے۔ ابھی اور سٹاک کرے گا۔

کرے گا، ضرور سٹاک کرے گا، ابھی سالا ایل کو سینگ نہیں لگا، ابھی کشمیری ہاتو نے تسبیح پلیٹ کر آنکھیں نہیں کھولا۔ ابھی ضرور سٹاک کرے گا۔
لیکن کھیال ہے کہ جلدی ہی بہت بڑا لینڈ سلائیڈ ہو گا اور سالا ایل کو سینگ لگ جائے گا اور بوڑھے کشمیری کے ہاتھ سے تسبیح گر پڑے گا اور پھر ہر جگہ کا مارکیٹ ایک دم گر جائے گا۔ پھر سٹاک نہیں کرے گا، پھر کبھی سٹاک نہیں کرے گا.........."

کاؤنٹر کے پاس والی میز پر ایک اچکن پوش بزرگ کے سامنے ایک برقعہ پوش خاتون بیٹھی چپس کھا رہی ہیں۔ محترمہ نے نقاب الٹ رکھا ہے لیکن منہ پر پھیلے ہوئے مہاسوں کے بدنما دھبے پوری طرح دکھائی نہیں دے رہے۔ صرف ایک آنکھ میں دنبالہ دار کاجل کی مڑی ہوئی لکیر اور تھوڑا تھوڑا امنڈا ہوا ابرو دکھائی دے رہا ہے۔ یہ آنکھ شاید پتھر کی ہے کیونکہ ڈیلا بالکل حرکت نہیں کر رہا اور دیر سے میز والے راکھد ان کو دیکھ رہا ہے۔ محترمہ کی آواز میں بلا کا بھدا پن ہے۔

"ناج کے ابا! یہاں تو سردی نے بُرا حال کر رکھا ہے۔ اور یہ تلے ہوئے آلو ہیں کیا؟
تو یہ دن ہیں یہ بُو کیسی ہے؟ ــــ ہائے میں تو خواہ مخواہ
پہاڑ پر آ گئی۔"

محترمہ! صرف آپ ہی نہیں آپ کا خاوند بھی خواہ مخواہ آ گیا ہے۔ ہر شخص یہاں خواہ مخواہ آ گیا ہے۔ انہیں ہسپتالوں میں جانا چاہئے تھا۔ پہاڑوں کی عظیم بلندیوں پر اُگنے والے پُراسرار جنگل، چنار اور چیڑ کے مرطوب سایوں میں سے لہرا کر گزرتی ہوئی نازک پگڈنڈیوں سپید، گلابی، سرخ۔ اور ہلکے زرد پھولوں، شگوفوں اور غنچوں سے لدے پھندے آلوچے، ناخ، سیب اور بگنگ کے درخت۔ ہری ہری نازک بیلوں کے گھونگھٹ میں چھپے ہوئے انگوروں کے قرمزی گچھے، پتھروں پر سے اُچھلتا ہوا چشموں کا شفاف پانی، برف آلود چوٹیوں پر منڈلانے والے دودھیلا بادل، رات کے ماتھے پر ستاروں کے جھومر، بیداغ اور پاکیزہ ہوا، پھولوں کی پتیوں کی مانند گھومتی ہوئی برف کی پُراسرار سرگوشیاں، کاٹی ہاؤس کی کھڑکیوں میں سے اندر داخل ہونے والے بادلوں کی مرطوب دھند ــــ یہ چیزیں ان کھوکھلے، بے روح اور بے حس آدمیوں کے لئے نہیں ہیں۔ یہ بیمار اور روگی ہیں۔ انہیں تو اس وقت آنا چاہئے تھا جب یہاں کی ہر شے برف میں چھپی ہوئی تھی۔ جب ہر طرف برف ہی برف تھی، سرد، بے جان اور منجمد برف۔ جب اس پہاڑ پر کسی بڑے ہسپتال کی نرس کا شبہ ہوتا تھا۔ اُس وقت نرس ان بیماروں کی خاطر خواہ تیمار داری کر سکتی تھی کیونکہ وہ ڈیوٹی پر تھی۔ لیکن اب تو نرس نے اپنا برف ایسا سرد لباس اتار کر رنگ برنگ پھولوں والی ریشمی ساڑھی پہن لی ہے۔ ہونٹوں پر روج کی ہلکی ہلکی تہہ جمالی ہے، بالوں میں ننھی ننھی خوش رنگ کلیاں اڑس لی ہیں۔ اور وہ دوشیزۂ بہار کے ساتھ خیابانوں میں گلگشت کر رہی ہے۔ اب یہ لوگ یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔

سالا پہاڑ کا مارکیٹ بھی ایکدم گر گیا ہے......

....

نچلے بازار کی پیچ در پیچ پتھریلی اور ڈھلوانی گلیوں میں دوکانیں کھل رہی ہیں۔ نائیوں، کنجڑوں، بساطیوں، دھوبیوں، کچی مونٹی روٹی اور کھی گانوں کے پلاٹ بیچنے والوں کی دوکانیں ــــ گائے، بکرے اور مرغی کا گوشت بیچنے والوں اور رنڈیوں کی دوکانیں ــــ سب کچھ کھل گیا ہے چنانچہ سب دوکانیں کھل رہی ہیں۔ رنڈیوں کی دوکانیں گوشت بیچنے والوں کے ساتھ ہی ہیں۔ یہاں پہنچنے کے لئے ایک لمبے ڈھلوانی بازار کو عبور کر کے دوسرے بازار میں سے گزرتے ہوئے ایک تنگ و تاریک گلی میں جانا پڑتا ہے۔ اس گلی میں بےحد سیل ہے۔ یہاں ہر وقت

عجب قسم کی بو پھیلی رہتی ہے۔ جیسے قریب ہی کسی جگہ مردے کو نہلایا جا رہا ہو یا ہوا میں مشک کافور گھل رہا ہو۔ یہاں جھکے ہوئے شکستہ مکانوں کے چھجے نیچے کی طرف مڑ گئے ہیں اور مسواک اور گھر پاشی کی مدد سے ہر دوکان کے دروازے پر وہاں بیوپار کرنے والی کا نام لکھا ہوا ہے۔ کمیٹی والے اس گلی کی نالیاں صاف کرا لیتے ہیں۔ رنڈیوں کی صحت کا بھی کمیٹی کو خیال رکھنا پڑتا ہے، آخر وہ بھی تو ٹیکس بھرتی ہیں۔ لیکن کمیٹی کی صفائی اور سطح سمندر سے کئی ہزار فیٹ کی بلندی پر رہنے کے باوجود ہر عورت کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے موجود ہیں، ہونٹ خزاں نصیب پتیوں کی طرح مرجھا کر سوکھ گئے ہیں اور چہرے پر مفلسی اور بیماریوں کے منحوس سائے منڈلاتے رہتے ہیں۔

اس گلی کی سیڑھیاں اتر جانے پر دوسری طرف چلے ہوئے مکانوں کا ویران سلسلہ ہے۔ ان بغیر چھتوں اور بغیر دروازوں کے مکانوں میں ڈلہوزی، چمبہ، مسوری اور نینی تال سے آئے ہوئے پہاڑی مزدوروں نے اپنے گھر بنائے ہوئے ہیں۔ ان گھروں میں وہ اپنے پرانے لحافوں، گھاس پھوس کے بستروں، مٹی اور ٹین کے برتنوں اور اپنی بھوکی ننگی بچیوں اور بیویوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ ٹین کے جھولتے ہوئے چھپر، ننگے پاؤں، پھٹے ہوئے ہاتھ پاؤں، ٹھنڈے لحاف، ٹھنڈے چولہے، دھنواں، دھنواں ـــ مرد صبح کو اپنی عورتوں سے لڑ جھگڑ کر باہر نکل آتے ہیں اور موٹروں کے اڈوں پر اس انتظار میں جا بیٹھتے ہیں کہ کوئی لاری آئے اور وہ اپنے مالک کا سامان اٹھا کر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔ وہ رات کو تھک ہار کر گھر لوٹ آتے ہیں اور اگر کوئی مزدوری نہ ملی ہو تو پھر لڑائی جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک گھر ایک جہنم ـــ اور یہاں کتنی جہنم ہیں، ان آباد کھنڈروں کی شکستہ دیواروں سے جب رات کو سرد ہوائیں اپنا سر ٹکراتی ہیں تو ایک دردانگیز شیون سا بلند ہوتا ہے، جھولتے ہوئے چھپر شور مچانے لگتے ہیں اور پھٹے ہوئے لحاف میں گھسا ہوا پورا خاندان ٹھٹھرنے لگتا ہے۔ بچے رونا شروع کر دیتے ہیں۔ عورتیں انہیں چپ کراتی ہیں۔ مرد پہلو بدل بدل کر فحش گالیاں سناتے ہیں۔

بھوکے جانور ٹھٹھرتے رہتے ہیں اور تیز ہواؤں کا شیون بلند سے بلند تر ہو جاتا ہے ـــ وہ کھنڈرات سے ٹکرا کر چیختی ہیں۔ چلاتی ہیں،

شاں اوں ـــ شاں ـــ شاں ـــ

آ ـــ وُ ـــ آ وُ ـــ آؤ، نکلو، نکلو، باہر آؤ، باہر نکلو۔ میں تمہیں ہمیشہ جگاتی رہوں گی۔ میں تمہیں کبھی نہ سونے دوں گی۔ تاوقتیکہ تم پھٹے ہوئے لحاف جلا نہ دو اور دیواروں کو ڈھا نہ دو اور باہر نہ نکل آؤ ـــ

آؤ ـــ آؤ ـــ شاں ـــ شاں ـــ!!

ہواؤں کا یہ پیغام وہ روز سنتے ہیں اور ایک دوسرے کو فحش گالیاں دے کر پھر سو جاتے ہیں۔ لیکن یہ پیغام کھنڈرات سے چل کر کارٹ ماونٹ روڈ تک پہنچتے پہنچتے بالکل تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہاں پہاڑی ہوائیں سرد آہوں کی مانند گزرتی ہیں۔ یہاں ان کا شور خواب آلود لوریوں میں بدل جاتا ہے۔

سو جاؤ، سو جاؤ، یہی وقت سونے کا ہے، باہر چنار اوس میں بھیگ گئے ہیں اور اندر آتشدان میں آنچ مدھم پڑ گئی ہے۔ اور نیند کی پریاں اپنے پر پھیلائے سو گئی ہیں، ـــ

سو جا، سو جا، راج کماری سو جا، ......:

آباد کھنڈروں میں کبھی کبھی رات کو مٹی کے دیے ٹمٹمایا کرتے ہیں اور اوپر والی گلی میں رنڈیوں کی دوکانیں بجلی سے بقعۂ نور ہوتی ہیں۔ یہ تیز روشنی مٹی کے مدھم دیوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور ان پناہ گزین کنبوں سے کئی دیے ان منور دوکانوں میں آ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بجھ چکے ہیں۔ ان دیوں میں جب تیل ختم ہو جاتا ہے اور بجلی کے قمقمے روشن ہو اٹھتے ہیں۔ دیے ہر روز بجھتے ہیں اور بجلی کے قمقمے ہر رات

جلتے ہیں، اور یہی قمقمے ماؤنٹ ویو میں بھی رات کو روشن ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے ذرا نیچے روشن ہوتے ہیں اور دوسرے اوپر ٹیلے پر جاکر۔ اور ماؤنٹ ویو میں اُن قمقموں کو مختلف قسم کے شیڈز سے ڈھانپا جاسکتا ہے۔ پھر اُن کی روشنی مدھم پڑ جاتی ہے۔ جیسے چوری چھپے سہمے سہمے جل رہے ہوں۔ دُور سے آدمی کچھ نہیں دیکھ سکتا مگر قریب پہنچنے پر ہر شے صاف نظر آنے لگتی ہے۔ ان بازاروں اور تنگ پتھریلی گلیوں کے آخر پر جاکر نیچے وادیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ دُور کہیں ایک جگہوں پر درختوں کے جھنڈوں کے درمیان سفید مٹی سے پُتے ہوئے مکان سنہری دھوپ میں چمک رہے ہیں۔ پہاڑی ڈھلوانوں پر کھیتوں کی ہری بھری سبز چھیاں پر کہیں کہیں اکا دُکا کسان ہل چلا رہا ہے۔ اوپر سے دیکھنے پر وہ بالکل کھلونا معلوم ہو رہا ہے، جس میں کوک بھر دی گئی ہو۔ اور جو خود بخود آہستہ آہستہ حرکت کر رہا ہو ــــــ جموں کے ابھرتے ہوئے سلسلہ ہائے کوہ میں جنگلی برف آلود چوٹیاں دھند میں ڈوبی ہوئی ہیں، ماؤنٹ ویو کاٹیج کے لان میں بیٹھی ہوئی تینوں لڑکیوں شام کی چائے پی چکی ہیں۔ موٹی خادمہ برتن اندر لے گئی ہے۔ بھڑکیلے رنگ کے غرارے والی دبلی پتلی لڑکی نرم گھاس پر خراماں خراماں ٹہل رہی ہے۔ دھوپ کا رنگ گہرا سنہری ہو کر نارنجی چمک اختیار کر رہا ہے۔ مغربی پہاڑیوں کی غیر ہموار چوٹیوں پر منڈلانے والے دودھیا بادل شفق کی آگ میں ڈوب کر لالہ گوں ہو رہے ہیں۔ سیب کی ڈالیاں مرطوب اندھیروں کا لمس محسوس کرکے سمٹ سی گئی ہیں۔ لڑکی دھیمے دھیمے سگریٹ پی رہی ہے اس کے مدوّر شانوں پر چھوٹتے ہوئے بھورے بالوں کے گچھوں میں ڈوبتے سورج کی ترچھی کرنیں آگ سی لگا رہی ہیں۔ ساٹن کی شلوار والی لڑکی لان کے پرلے کنارے پر ایک سنگین چبوترے پر کھڑی ذرا جھک کر نیچے پتلی لمبی سڑک کو دیکھ رہی ہے جو چیڑھ کے درختوں کے بیچوں بیچ گزرتی ہوئی اوپر سینی ٹوریم کو چلی گئی ہے۔ سرخ دوپٹے والی لڑکی نے پھر سے اخبار کا مطالعہ شروع کر دیا ہے۔ اُس کا سگریٹ اس کی نازک اور لمبی انگلیوں کے درمیان سُلگ رہا ہے اور اُس کی نگاہیں اخبار پر جھکی ننھے ننھے الفاظ کا تعاقب کر رہی ہیں۔

برطانیہ میں زبردست مالی بحران، امریکہ نے مزید قرضہ دینے سے انکار کر دیا۔ برطانیہ نے پونڈ کی قیمت کم کر دی۔ تیسری جنگ عظیم کی تیاریاں، حفاظتی کونسل نے تین اور ملکوں کو جنگی سامان دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ڈالر، سٹرلنگ، قرضے، ہڑتالیں قحط، وبائیں، بھوک، جنگ ــــــ

وال سٹریٹ میں کاٹن کا بھاؤ چڑھ گیا، سن انیس سو ساٹھ میں بوئی جانے والی فصل کا سودا ہو رہا ہے، فلسطین کے لاکھوں مہاجر عرب شام کی سرحدوں پر بھوکوں مر رہے ہیں اور امریکہ نے بیس ٹن زائد گندم سمندر میں بہا دی ہے اور وال سٹریٹ میں سونے کا بھاؤ تیز ہو رہا ہے، سٹاک کرو، سٹاک کرو، ہیلو! ہیلو! خرید لو! خرید لو! سارا سونا خرید لو!!!

ہم بھوکے ہیں، ہم ننگے ہیں، ہم انقلاب چاہتے ہیں،

خرید لو! خرید لو! خرید لو!

یہ ہماری زندگیوں کا سوال ہے، وقار کا سوال ہے، عزت کا سوال ہے،

بیچ دو! بیچ دو! ــ ہیلو! ہیلو!!

وال سٹریٹ نے زمین کی طنابیں کھینچ لی ہیں، دھرتی کا سارا رس چوس لیا ہے، ٹیلیفونوں پر ملکوں کے سودے ہو رہے ہیں، چشمے سوکھ رہے ہیں، زمینیں بنجر ہو رہی ہیں، کھیتوں میں دھول اڑ رہی ہے۔ ہر طرف موت ایسی ویرانی، جمود، خاموشی، سناٹا طاری ہے۔ وال سٹریٹ میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور مشرق کی ہر گلی پر قبر کی لحد کا گمان ہوتا ہے۔

وال سٹریٹ ۔ کال سٹریٹ ۔ ڈیم یو دبو!

. . . .

اب شام کے مرطوب سائے وادیوں میں اترنے لگے ہیں اور سورج مغربی کناروں پر سرمئی غبار چھوڑ کر پہاڑیوں کی اوٹ میں چھپ گیا ہے۔ کھائی کے کنارے ڈھیلا کرنے والا پٹھان چلا گیا ہے۔ اور گرجے کی صلیب پر بیٹھا ہوا اکیلا جانور بھی اڑ چکا ہے۔ نائی اپنے گاہک کا سر مونڈ کر استرے، قینچیاں چمڑے کے تھیلے میں بند کر رہا ہے۔ بوڑھا کشمیری تسبیح خوانی کے بعد ڈھلوان کے پتھروں پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا نیچے سڑک اتر رہا ہے۔ سینی ٹوریم کے باہر بیٹھے ہوئے سرخ کمبلوں والے لاغر مریض اندر جا چکے ہیں۔ ہسپتال کی تمام کھڑکیاں بند ہیں۔ گرجا گھر کے دروازے پر انگور کی بیل کا گھونگھٹ منظر بہ منظر تاریک ہو رہا ہے اور قرمزی انگوروں کے گچھے سیاہ دھبوں کی مانند نظر آ رہے ہیں۔ گنج کی باڑھ سے اوپر گھاس چرتی بھیڑوں کو ایک کمسن لڑکی سونٹی سے ہنکائے اوپر لیے جا رہی ہے۔ نچلے بازار میں شور دھیما پڑ رہا ہے

ماؤنٹ ویو کا لان ویران ہے۔ غرارہ، شلوار، دوپٹہ، کوئی نہیں۔ اب وہاں کوئی نہیں۔ تپائی پر گلدان میں آلوچے کی لمبی پھولدار ٹہنیاں اوس میں بھیگ رہی ہیں۔ لڑکیاں خواب گاہ میں جا چکی ہیں۔ کمروں کے تمام دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔ باہر سردی بڑھ رہی ہے۔ اوس گر رہی ہے اور اندر آتشدان میں آگ سلگ اٹھی ہے۔ کھڑکیوں پر ریشمی پردے گرا دیے گئے ہیں۔ خواب گاہ کے دریچوں اور روشندانوں سے نکلتی ہوئی مدھم سبز روشنی میں گھاس پر رینگنے والی مرطوب دھند اجاگر ہو رہی ہے۔ ہوا ٹھنڈی ہو گئی ہے اور اس میں جنگلی پھولوں کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ ہر سانس زندگی کا ادلین سانس محسوس ہو رہا ہے۔ سڑک کے کنارے دور دور کھڑے بجلی کے کھمبوں پر بتیاں جل اٹھی ہیں۔ ادھر ادھر اوپر نیچے، ہیرنگ لاج، ایل ویو، پائن ٹریس اور سنی ویو کے بند کھڑکیوں اور روشندانوں پر قبرستان میں جلنے والے لیمپوں کا شبہ ہو رہا ہے۔ چنار کے درخت شروع شب کے سایوں میں دھندلے، ویران اور خاموش ہیں۔ سبزہ زاروں میں ملائم دھند سی اٹھنے لگی ہے۔ چیڑھ اور صنوبر کے جنگلوں میں سناٹا طاری ہے۔ ان جنگلوں میں خاموش اور بے زبان زندگی کا آغاز ہو رہا ہے۔ وہ زندگی جو دن کے اجالوں میں نظروں سے اوجھل تھی رات کے ویران سناٹوں میں بیدار ہو گئی ہے اور شگوفوں کا منہ چوم رہی ہے اور اس کا پرسکوں لمس دھرتی کو خوشبو، رنگ اور حسن سے مالا مال کر رہا ہے۔ ماؤنٹ ویو کے دریچے نیم روشن ہیں۔ وہ تینوں لڑکیاں اندر کیا کر رہی ہوں گی؟

زمین سے کئی ہزار فیٹ کی بلندی پر جب باہر سرد رات میں اوس گر رہی ہو اور نیلے آسمان پر ستارے منتظر رہتے ہوں تو گرم خواب گاہوں میں آتشدان کے قریب قالین پر بیٹھی ہوئی لڑکیاں بے حد حسین معلوم ہوتی ہیں۔ پھر دھیمی آوازوں میں ان سُنے گیتوں کے سُر جاگ اٹھتے ہیں۔ گرم دستانوں میں بوجھل پلکوں تلے محبت کی چمکیلی قندیلیں فروزاں ہو جاتی ہیں اور گرم اور لوچدار جسم پتوں میں چھپے ہوئے پھول بن کر مہکنے لگتے ہیں اور پھر روشنیاں ڈوبنے لگتی ہیں، اندھیروں کے نرم و ملائم ہاتھ پیشانی کو چھوتے محسوس ہوتے ہیں، قندیلیں بجھنے لگتی ہیں، ان سُنے گیتوں کے سُر خواب آلود سایوں میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور آتشدان میں آگ مدھم پڑ جاتی ہے، بتیاں گل ہو جاتی ہیں اور ہر سمت خاموشی چھا جاتی ہے — اور باہر نیلے ستاروں کی چھاؤں میں کائنات کا رقص تھم جاتا ہے، پھول سو جاتے ہیں، گیت سو جاتے ہیں، کھو جاتے ہیں، ڈوب جاتے ہیں، مر جاتے ہیں ....

اٹھو اٹھو — میں تمہیں جگانے آئی ہوں!

سو جاؤ، سو جاؤ — یہی سونے کا وقت ہے .....!!

ہواؤں کا یہ پیغام ماؤنٹ ویو سے لے کر نچلے بازار کی رنڈیوں کے ڈربوں تک گونجتا رہتا ہے۔ جلے ہوئے کھنڈروں میں بسنے والے کشمیری کنبوں تک یہ پیغام پھٹے ہوئے نمدوں سے ہو کر پہنچتا ہے، اور اس کی ڈراؤنی آواز پر غلیظ لحاف میں ٹھٹھرتے ہوئے بچے ڈر کر رونے لگتے ہیں۔ مائیں انہیں مارتے ہوئے چپ کراتی ہیں۔ اور مرد ٹوٹتی نیند میں فحش گالیاں بکنے لگتے ہیں۔ دن بھر سامان سے لدا ہوا رکشا کھینچنے اور رات کو تنگ و تاریک کوٹھڑی میں نیاز بو کی آغوش میں بھوس پر سو جانے والا ہاتو بے زبان بیل یہ پیغام نہیں سنتا۔ ہوائیں دروازے سے سر پٹخ رہی ہیں۔

اٹھو! اٹھو! سو سالہ نیند میں ڈوبے ہوئے بیل اٹھو! یہ اٹھنے کا وقت ہے!!

اور بیل کسی وقت نیند میں بڑبڑا اٹھتا ہے۔

"بولو صاحب! بخشش صاحب!"

بیل سو رہا ہے، وہ گہری نیندمیں کھویا ہوا ہے۔ میلے کچیلے فرن والی بنیاز بلو اس کی آغوش میں ہے۔ نیچے گرم گرم بھوس ہے۔ اوپر پھٹا ہوا لحاف ہے۔ اس کے اوپر جھکی ہوئی سیاہ چھت ہے۔ اور چھت کے اوپر ماؤنٹ ویو ہے۔ ماؤنٹ ایورسٹ ہے۔ درمیان میں کافی ہاؤس ہے۔ سندھی تاجر ہے، پنجابی تاجر ہے، گرجا گھر ہے۔ خاردار جنگلہ ہے۔ بیل کو ان سب سے گذر کر ماؤنٹ ویو تک جانا ہے۔ ماؤنٹ ایورسٹ تک پہنچنا ہے، اور بیل سو رہا ہے —— سونے دو، سونے دو۔

سوجا! گنجی کھوپڑی اور چپٹے تلوؤں والے بیل سوجا! کھوجا! مرجا!!

کافی ہاؤس تقریباً خالی ہو چکا ہے۔ سردی بڑھ رہی ہے۔ میرا پائپ بجھ گیا ہے۔ کھلی کھڑکی میں سے اوس میں بھیگی ہوئی سرد ہوا میری پیشانی اور شانوں کو چھو رہی ہے۔ پتھر کے ڈیلے والی محترمہ کی میز خالی ہے۔ سندھی اور پنجابی تاجر لاہور اور کراچی کی مارکیٹیں ڈاؤن کر کے جا چکے ہیں۔ ماؤنٹ ویو کو کہرے کی لطیف چادر نے ڈھانپ رکھا ہے۔ بند دریچوں میں روشنیاں بجھ چکی ہیں۔ تینوں لڑکیاں سو رہی ہوں گی۔ ان کی آنکھیں بند ہوں گی، یاقوتی ہونٹ نیم وا ہوں گے۔ اور گرم لحافوں کے اندر ننھے منے دل کی دھڑکنیں ایک دوسری سے ہم آہنگ ہونگی۔

یہ میری پلکیں کیوں بوجھل ہو رہی ہیں؟ میرے خیال میں مجھے اب چلنا چاہئے۔ مجھے بھی سوجانا چاہئے۔

سوجا، سوجا اے پڑھے لکھے بیل! تو بھی سوجا!!

(بقیہ صفحہ ۹۹)

مجھی کو اپنی تمناؤں کا مرکز بنایا جس کی والہانہ شیفتگی، بے کنار محبت اور پرستارانہ خلوص کی مثال مشکل ہی سے ملے گی جب محبت کے جذبے سے بے اختیار ہو کر اپنی ساری ہستی کو میرے اندر جذب کر دینا اور میری روح میں سما جانا چاہتی ہے تو میرے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس کی پرشور محبت اور پرخلوص فریفتگی کے جواب میں کم سے کم اتنی ہی سرگرمی کا اظہار کروں جو کبھی درحقیقت صرف اُسی کے لئے مخصوص تھی۔

ڈرتا ہوں کہ اگر میری طرف سے اظہارِ محبت میں کمی ہوئی اور خدانخواستہ اسے میرے متعلق ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو اس کا نازک دل ٹوٹ جائے گا۔ وہ اس صدمے کو ہرگز برداشت نہ کر سکے گی۔ یقیناً کچھ کھا کے سو رہے گی۔ یہ سب قسمت کی ستم ظریفیاں ہیں۔ بہرحال ہم واقعات سے گریز نہیں کر سکتے ان کا مقابلہ کرنا ہی پڑے گا۔ جی چاہے اسے معصیت کہو۔ جی چاہے جرم کہو۔ جی چاہے بدراہی کہو مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور بُری طرح چاہتے ہیں۔ میرے بغیر تمہاری زندگی بے کیف اور تمہارے بغیر میرے لئے جینا ایک مستقل عذاب ہے۔

مان لیا کہ رعنا خوبصورت ہے۔ تمہارے بقول تم سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔ مگر شہلا! حُسن درحقیقت نام ہے پسند کا۔ وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ:۔ ع۔ مجھ کو تو تم پسند ہو، اپنی نظر کو کیا کروں

تو میں اپنی نظر کو کیا کروں۔ تمہارے سوا اب مجھے دنیا میں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ خدا جانے اس خوفناک محبت کا انجام کیا ہوگا۔ شہلا! صبر و برداشت کی قوت اب بالکل ختم ہو چکی ہے۔ للہ درمیان سے یہ غیریت کے حجاب اٹھا دو اور میری تشنہ کام روح کو نوشین حیات پلا کر محبت اور زندگی کو جاودانی بنا دو۔

اگلے اتوار کو میں کلکتہ آ رہا ہوں۔ رعنا سے بہانہ کیا ہے کہ سرکاری کام سے جا رہا ہوں۔ زندگی میں پہلی بار اُسے اکیلا چھوڑ رہا ہوں۔ جانتا ہوں کہ تنہائی میں وہ بے حد گھبرائے گی اور میری یاد اُسے بہت ستائے گی مگر کیا کروں، مجبور ہوں۔ اچھا جانِ آرزو، آئندہ دو شنبے تک رخصت، بہت سا پیار۔ آج فقط زبانی اور اس دن سے پھر کچھ۔ خدا حافظ۔"

تمہاری آرزو میں جینے والا
تمہارا ہمیشہ تمہارا
جمیل

ایک پنجابی نظم

امرتا کور

اج آکھاں وارث شاہ نوں!

گذشتہ سال جب ہمارے اکثر ادیب اور شاعر رو رو کر، چیخ چیخ کر انسانوں کی لرزہ خیز تباہی پر اپنے جذبات غم و الم کا مظاہرہ کر رہے تھے اس وقت چپکے سے ایک عورت اُٹھی اور چند آنسو بہا کر واپس چلی گئی۔ یکایک دنیائے ادب پر ایک سناٹا سا چھا گیا۔ رو رو کر ہنگامہ بپا کرنے والوں نے دیکھا کہ ان کی اشکباری، ان کا درد و کرب اور اُن کی چیخیں شدت و خلوص میں ان چند آنسوؤں کے سامنے کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتیں۔ کیونکہ انہوں نے دُور سے لاشوں کو دیکھا ہے۔ لاشوں کے درمیان میں سے نہیں گذرے مگر اس عورت نے اپنی ماؤں، بہنوں اور بھائیوں کی خونچکاں نعشوں کو اپنے سینے میں سمیٹ کر، اور سب کا دکھ انتہائی شدت سے محسوس کر کے آنسو بہائے ہیں۔ یہ آنسو صرف ایک عورت کے آنسو نہیں ہیں۔ کچلی ہوئی انسانیت کے آنسو ہیں جو بے اختیار امرتا کور کی آنکھوں سے ٹپک پڑے ہیں۔

فسادانی ادب کے موضوع پر سوز و گداز کے اعتبار سے پنجابی کی یہ نظم — ایک شاہکار ہے۔ ہماری "آنکھوں دیکھی کہانی" کا سب سے دردناک ٹکڑا ہے، اور اسی لئے ہم افسانہ نمبر کی کہانیوں میں اس "کہانی" کو بھی جگہ دے رہے ہیں! (ادارہ)

اج آکھاں وارث شاہ نوں کِتے قبراں وِچوں بول

تے اج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول

اک روئی سی دِھی پنجاب دی تے توں لکھ لکھ مارے بین

اج لکھاں دِھیّاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن

اُٹھ دردمنداں دیا دردیا، اُٹھ تک اپنا پنجاب

اج بیلے لاشاں وِچھیاں تے لہو دی بھری چناب

کِسے نے پنجاں پانیاں وِچ دِتی زہر رلا

تے ایس زہر نے دھرت نوں دِتا پانی لا،

وِہو وِلسّی وا پھیر بَن بَن وگّی جا

اوہنے ہر اِک بانس دی ونجھلی دِتی ناگ بنا،

ناگاں کِیلے لوک منہ بس پھر ڈنگ ای ڈنگ

پلو پلی پنجاب دے نیلے پے گئے انگ

گلیوں ٹُٹے گیت پھیر، تکلیوں ٹُٹی تند

ترنجنوں ٹُٹیاں سہیلیاں، چرخڑے گھوکر بند

سنے پینگ اج ٹاہنیاں پِپلاں دِتیاں توڑ

سنے سیج اج بیڑیاں لُڈن دِتیاں روڑھ

اج سبھے کیدو بن گئے حُسن عشق دے چور

اَج کِتھوں لیائیے لبھ کے وارث شاہ اِک ہور

اج آکھاں وارث شاہ نوں توہیں قبراں وچوں بول

تے اَج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول

سنتوکھ سنگھ دھیر

میرا اُجڑا پڑوسی

جرنیلی سڑک پر چار میل لمبا قافلہ اپنے نئے وطن کو جا رہا تھا۔ میں کہیں باہر سے اپنے گاؤں واپس آ رہا تھا۔ میری منزل کوئی دو میل اِدھر تھی۔ قافلے کے پاس ہماری لاری کا کوئی پرزہ خراب ہو گیا۔ مسافر لاری سے اتر کر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ اور ڈرائیور انجن کا پردہ اٹھا کر نقص ڈھونڈنے لگا۔

سڑک کی بائیں پٹڑی پر سست رو چھکڑے بے اختیار چیخ رہے تھے جیسے کہ وہ پہیے زمین میں دھنسے جا رہے ہوں۔ بھوکے پیاسے اور ہانپتے ہوئے بیلوں کی گردنوں پر پُورے کنبے کا بوجھ لدا ہوا تھا۔ بے چاروں کی حالت بہت خراب تھی۔ دھول ان کے پاؤں سے اڑ اڑ کر ہوا کی لہروں میں پھیل رہی تھی!

بیلوں کی گردنیں گھنگھروؤں سے محروم تھیں۔ ہاں جب کوئی بچہ بلک اٹھتا تھا تو فضا میں ریں ریں کی آواز رینگنے لگتی تھی۔

چھکڑوں پر سے لاشوں کی مانند انسانی پنجر عجیب اُداس، ویران نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ ان کے زرد چہرے دھول سے خاکی رنگ اختیار کر چکے تھے۔ سڑی گلی زندگی پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور فضا میں تعفن کی لہریں پھیل رہی تھیں۔

میں نے چاہا ان خانماں بربادوں کو آخری بار ذرا نزدیک ہو کر دیکھ لوں۔ چنانچہ دو قدم چل کر ٹوٹی پھوٹی سڑک کی دائیں پٹڑی پر آ گیا۔ یکایک سامنے چھکڑے کی قطار رک گئی۔ شاید قافلہ ٹھہر گیا تھا۔ میں سڑک پر آ گیا۔ اور ایک ایک چھکڑے کو دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔

جب کسی چھکڑے پر سے اداس آنکھیں مجھے دیکھنے لگتیں تو میرے سینے میں ایک تیر سا پیوست ہو جاتا۔ یہ نظریں فوراً میرے چہرے سے ہٹ جاتیں۔ یقیناً ان لوگوں کو میری آنکھوں میں خون آلود بھالے نظر آتے ہوں گے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ میری طرف دیکھ بھی نہیں سکتے تھے! میں سڑک سے ہٹ کر کچی پٹڑی پر آ گیا۔

اچانک ایک گاڑیبان نے مجھے پہچان لیا۔ اس کی نگاہیں مجھ پر جم گئیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو گئی۔ اس نے چھلانگ لگائی اور میری جانب بڑھنے لگا۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اور ایک چیخ سی اس کے حلق سے بے اختیار نکل گئی۔

"اوہ دُلّے — بہت کمزور ہو گیا ہے یار۔ پہچانا بھی نہیں جاتا"

دُلّے کی آواز نے چھکڑے پر نڈھال پڑی ہوئی زینب کو چونکا دیا۔ باپ کا رونا سنکر بیٹیاں قبروں میں جاگ پڑتی ہیں!

"آبا — با — آ جا"

زینب نے مردہ اور نڈھال آواز میں کہا۔ اس نے ابھی تک مجھے پہچانا نہیں تھا اور سمجھ رہی تھی کہ اس کا باپ موت کے منہ میں جا رہا ہے

"دُلّے — بس بھائی۔ اب ہم کوئی بات کریں" یہ کہہ کر میں نے دُلّے کے شانے کو جھٹکا دیا۔ اس کی آستینیں آنسوؤں سے تر ہو گئی تھیں اس نے آہ بھر کر کرتے کے میلے کچیلے دامن سے ناک اور آنکھیں پونچھ کر تھکی ہوئی سرخ آنکھوں سے میری جانب دیکھا پھر ذرا گردن پھیر کر کمزور لہجے میں اپنی بیٹی سے کہا

"بیٹا زینب سنتوکھ سنگھ کھڑا ہے۔ اپنا پڑوسی۔ دیکھ لے نا آخری بار —"

میرا نام سن کر زینب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دُلّا ہمارے گاؤں کا راکھا گوجر تھا۔ ایک ہی گلی میں رہنے کی وجہ سے ہمارا خاص پڑوسی تھا۔ اسکے ساتھ خاندانی بزرگوں کے وقت سے چلے آ رہے تھے۔ ہمارے پچھواڑے مویشیوں کے باڑے کے ساتھ اس کی بکریوں کا باڑہ تھا۔ میرا باپ بتایا کرتا ہے دُلّے کے تائے سبحان نے اسے ایک بار کہا تھا۔ ساون سنگھ! تیرا اور ہمارا مال کوئی دو نہیں۔ تو سو جایا کر۔ بے فکری سے ہم تیرے جانوروں کی حفاظت کرینگے —— "

اسکے بعد ہم نے کبھی اپنے مویشیوں کی حفاظت نہیں کی تھی!

زینب میری بہنوں کی گہری سہیلی تھی۔ صبح ہی صبح چرخیاں کاتنا، ایک جگہ بیٹھ کر ساون کے گیت گانا، جھولے جھولنا، سینا پرُنا ان کے دلچسپ مشاغل تھے۔ یہ بڑی خوبصورت پٹاریاں بناتی تھیں اور ہماری رنگ برنگ کی دریاں ان کی آرزوؤں کی رنگین تصویریں تھیں زینب کا جہیز میری بہنوں نے مل کر تیار کیا تھا۔ اور اب زینب میری بہنوں سے مل کر ان کا جہیز تیار کر رہی تھی۔ زینب کو میں نے ہمیشہ اپنی سگی بہن سمجھا تھا۔ اس نے بھائی کے بغیر مجھے کبھی نہیں بلایا تھا اگر کبھی میری کسی بہن سے الجھ پڑتی تھی تو مجھ سے فیصلہ نہ ہو سکتا تھا کہ کسے قصوروار کہوں اور کسے جھڑکوں —— جب زینب کی ڈولی جانے لگی تھی تو میری بہنوں نے رو رو کر جدائی کے گیت گائے تھے۔ یہ گیت اب تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے! اسکے باپ اور بھائی نے اپنی پگڑیوں کے کناروں پر لٹکتے ہوئے سروں سے آنکھیں پونچھی تھیں۔ وہ بے شک اکھڑ تھے۔ مگر لڑکیوں کو وداع کرتے وقت بڑے بڑے حوصلے والے لوگ بھی آنسو نہیں ضبط کر سکتے! زینب اپنے ماموں کے بازوؤں میں —— اسکے گلے سے چمٹی ایک عجیب تھرتھراتی لے میں اوں اوں کرکے رو رہی تھی۔ یہ رونا عورت زندگی میں ایک ہی بار روتی ہے۔ اسکے آنسو دیکھ دیکھ کر میرا دل اندر ہی اندر گھلتا جا رہا تھا جیسے لہروں کے چھونے سے دریا کے کنارے گھل جاتے ہیں۔

اب زینب مجھے اجنبی سمجھ رہی تھی۔ جیسے اسکے دل سے یقین اٹھ چکا ہو۔ اسکے دل میں خوف تھا، ڈر تھا، شبہ تھا۔ میرے سینے میں چھریاں سی چلنے لگیں۔ بہن کو آج بھائی پر بھروسہ نہیں رہا۔ آج زینب میرے سائے سے بھی ڈر رہی تھی۔

اچھا سنتو کھ! تو مل گیا —— " دلے کے سینے میں اسکا دل دھڑک رہا تھا۔

" یہ زمانے کا ڈھنگ ہے —— دُلّے! فضا ہی بدل چکی ہے، اچھے بھلے انسان درندے بن گئے " میں نے کہا

" اللہ ہی جانتا ہے سنتو کھ! ہم نے تو کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا —— ہم بے گناہ تھے "

" ہاں وہ نوراں، جینا، قیمی، گوہر اور فاطماں نظر نہیں آئیں " میں نے پوچھا۔

" اس بھاگڑ میں بچوں کو کس نے سنبھالا ہے " یہ کہتے ہوئے اس کی آواز کانپ اٹھی۔ " اچھا شکر ہے اس مالک کا "۔ دُلّے نے آسمان کی جانب ادب سے اشارہ کرکے کہا —— دُور —— بلندی پر کونجوں کی ایک قطار پرواز کرتی ہوئی گاؤں کی طرف جا رہی تھی۔ دُلّے کی آنکھوں میں ایک عجیب مایوسی سی پیدا ہو گئی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اگر میں کونج بن جاؤں، اپنے گاؤں میں اڑتا پھروں تو کون روک سکے گا مجھے۔ میرا کیا مذہب ہو گا —— میری جان کو کوئی خطرہ نہ ہو گا۔

قطار دور نکل گئی!

دُلّے نے لمبی آہ بھری۔

بٹیا زینب! تو بھی بات کر لے۔ بھائی کھڑا ہے۔ دُلّے نے اپنی بیٹی سے کہا۔

زینب کی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان موجزن ہو گیا

" بھیا تو ہمیں بچا لے: ہم تیرا مذہب قبول کرتے ہیں "

" بہن آج میرا کوئی مذہب نہیں ہے۔ اگر میرا کوئی مذہب ہوتا تو تم لوگ میری آنکھوں کے سامنے کبھی نہ اجڑتے میرا کوئی مذہب نہیں میرا کوئی دھرم نہیں

" بھیا —— اچھا " زینب نے میری طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ جیسے وہ اندھیرے میں کوئی کھوئی ہوئی کرن تلاش کر رہی ہو۔ مگر جھٹ اس کی آدھ بجھی آنکھوں پر گرد آلود پپوٹے ابھر آئے۔ اس نے جانا۔ بہن کو گھرا تے دیکھ کر بھائی نے کراہ

بند کر لئے۔

"اچھا سنتو کھ! گاؤں کے چوپال کو سلام کہنا۔ ہمارے گھر کا خیال رکھنا — میرے گھر کی چھت کمزور ہے۔"

"تیرے گھر کی چھت —" میں کہتے کہتے رُک گیا میں اسے کیونکر بتاتا کہ اسکے جاتے ہی اس کی چھت سے نیلی زبانوں والے آتشیں شعلے نکلنے لگے تھے جن میں تیری کمزور چھت کی کڑیاں تڑاتڑ کرکے ختم ہو گئیں۔

ہم سڑک کی کچی پٹڑی سے اتر کر ڈھلوان پر آ گئے۔ محافظ فوجیوں کی ایک لاری آدھی کچی اور آدھی پکی سڑک پر آ رہی تھی گھڑ گھڑ کرتی ہوئی لاری ہمارے قریب سے گزر گئی۔ دھوئیں کا ایک خاکی بادل زمین سے اٹھ کر خلا میں پھیلنے لگا۔ دور تک اس اڑتے ہوئے بادل پر سے سنگینوں کی تیز نوکیں چمکتی گئیں۔

بادل تھک کر گر پڑا

"اچھا سنتو کھ! انشاء اللہ پھر کبھی ملیں گے"

"ضرور ملیں گے دتے! تو اداس نہ ہو۔ آخر ہم انسان ہیں"

"مگر مجھے امید نہیں"

"تو ناداں ہے ناخن سے کبھی گوشت الگ نہیں ہوتا۔ یہ تو سب انگریز نے شرارت کی ہے ہم بدھو ہیں — ہم جاہل ہیں — ہم —" میرا دل بھر آیا۔

اس وقت میری جیب میں تین روپے سات آنے تھے۔ سوا روپیہ مجھے کرایہ دینا تھا۔ میں نے دو روپے بہن کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

"بھائی — رہنے دے۔ تکلیف نہ کر"

"لے لے میری بہن تکلیف کا ہے کی کیا میں تمہارا بھائی نہیں ہوں۔"

میرا دل گلے میں آ گیا۔ میں بول نہ سکا۔ مجھے بہن کا چہرہ یوں نظر آ رہا تھا۔ جیسے دھندلے شیشے میں سے دیکھ رہا ہوں۔

"اچھا بھائی! سندو اور نکی کو سلام کہنا" زینب نے میری بہنوں کو سلام دیا" اور ان گلی کوچوں کو جن کی طرف میرا دل بیتاب ہو ہو کر بھاگا جا رہا ہے۔ ہمارے پچھواڑے کے باغیچے میں آم کے پودے کی جڑ میں پانی دیتے رہنا — میں نے بڑے شوق سے یہ پودا لگایا تھا۔ اسکے نرم نرم پتے کہیں سوکھ کر جھڑ نہ جائیں —

زینب کہتی گئی اور میری آنکھوں سے آنسو بہتے گئے

شام کا تھکا ہوا سورج مغربی کنارے پر جھک گیا شکست خوردہ سایے زمین پر رینگنے لگے۔

چھکڑوں کی لمبی قطار میرے قریب سے گزرتی — گزرتی گئی — پامال قافلہ دور ہوتا گیا۔ اور چھکڑوں میں سے نکلتی ہوئی چیخ مدھم ہوتی گئی!

٭ ٭ ٭

نئے زاویے

عظیم افسانہ نگار کرشن چندر کے حسن انتخاب کے وہ کارنامے جن پر اردو ادب کو ناز ہے۔ "نئے زاویے" دو جلدوں میں چھپے ہیں اور مسلّم نقادوں کا کہنا ہے کہ اتنا اچھا انتخاب آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ ان دو جلدوں میں اردو کے تمام فنکاروں کے شاہکار شامل ہیں جنہیں آپکے دکھوں اور مسرتوں کا پورا پورا احساس ہے

نئے زاویے جلد اول ۔/۱۶/۔ نئے زاویے جلد دوم ۔/۱/۶

میرزا ادیب

کچھ زیادہ عرصہ نہیں صرف تین سال پہلے وہ گلاب کا ایک شگفتہ پھول تھی جو بادِ بہاری کے میٹھے نغمے سُن سُن کر جھوم رہا ہو۔ جھوم جھوم کر مسکرا رہا ہو۔ مگر اب نہ تو اس کی آنکھوں میں عالمِ شباب کی حیات افروز درخشندگی تھی اور رخساروں میں مچلتے ہوئے سرخی غازہ کی بہار پر وہ رنگینی دیکھنے والوں کی حیرت زدہ نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ وہ جوانی کی منزل سے گذر کر بڑی تیزی کے ساتھ دورِ کہولت میں داخل ہو رہی تھی۔ خاں صاحب کے گھر کی اونچی اونچی دیواروں نے اُسے اس طرح پیس ڈالا تھا کہ اس تھوڑے سے عرصے میں اُس کے جسم سے صرف شگفتگی اور توانائی ہی رخصت نہیں ہوئی تھی بلکہ دل سے اُمنگیں اور ولولے بھی جاچکے تھے کبھی اس کی زندگی میں تڑپ ایک طوفانی کیفیت موجزن رہا کرتی تھی لیکن اب تو وہ ندی کی کائی جمی سطح تھی جس میں کوئی لہر نہیں اُٹھتی تھی جس میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ وہ صبح اٹھتے ہی کام میں مشغول ہو جاتی اور شام تک اس طرح مشغول رہتی کہ اسے کسی بات پر دم بھر کے لئے غور کرنے کی بھی فرصت نہ ملتی اور آخر اسے غور کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس کی زندگی میں تھا کیا جس پر غور کرتی۔ خاں صاحب دوسری عورتوں کی طرح اسے بھی دل بہلاوے کا ایک ذریعہ بنا کر لائے تھے۔ چنانچہ جب تک زینو پر جوانی کی بہار چھائے رہی وہ اُسے مزے لے لے کر چکھتے رہے اور جب وقت کے ٹھنڈے سانس نے اس کی رگوں میں دوڑتے ہوئے شعلے پر برف کی سی تہ جما دی تو وہ بیوی سے ایک خادمہ بن کر رہ گئی — ایک خادمہ جس کا مقصدِ حیات صرف یہ تھا کہ صبح سے لے کر شام تک کام کرتی رہے اور جب کام کرتے کرتے بالکل تھک جائے تو گھنٹوں خاں صاحب کے پاؤں دباتی رہے اور پھر لاش کی طرح چارپائی پر گر پڑے —— تمام دن بے حد مصروف رہنے کے بعد شام ہوتے ہوتے وہ اس قدر تھک جاتی تھی کہ ایک قدم اٹھانا بھی اس کے لئے دوبھر ہو جاتا تھا مگر اس وقت یکایک اس کے ذہن میں ایک چنگاری سی بھڑک اُٹھتی اور وہ بے اختیار صحن سے باہر آکر پیپل کے درخت کے نیچے کھڑی ہو جاتی اور چند لمحوں کے لئے اس ندی کو دیکھنے لگتی جو درختوں کی لمبی قطار کے پرے، شام کے دھندلکے میں بجلی کی طرح لہراتی ہوئی نظر آیا کرتی تھی۔ اس کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں اور وہ سرد آہ بھر کر، دوپٹے کے دامن سے آنسو خشک کرتی ہوئی، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی، صحن میں سے گذر کر اپنے کمرے میں چلی جاتی اور خانصاحب کی آواز کا انتظار کرنے لگتی — یہ واقعہ قریب قریب ہر روز ہوتا تھا لیکن گھر میں کسی کو بھی اس کی خبر نہیں تھی۔ خانصاحب کو پورا یقین ہو چکا تھا کہ اب اس کی زندگی میں کچھ بھی باقی نہیں رہا، اور خانصاحب کے گھر کے باہر ہر شخص سمجھ چکا تھا کہ زینو اپنے ماضی سے کٹ چکی ہے اور اب اس کے دل و دماغ پر ماضی کا ہلکا سا سایہ بھی موجود نہیں ہے — اُن دنوں خانصاحب بہت پریشان نظر آتے تھے کیونکہ چند دن سے ان کے ہر طرف پھیلے ہوئے کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جو آج تک نہیں ہوا تھا اور خانصاحب رات کو دیر تک گاؤں کے دوسرے زمینداروں سے بات چیت کرتے رہتے تھے، اس لئے زینو کو صحن سے باہر ٹھہرنے کا زیادہ وقت مل جاتا تھا اور وہ دیر تک وہاں کھڑی رہتی تھی —!

اُس دن ابھی شام نہیں ہوئی تھی۔ زینو معمول کے مطابق درخت کے نیچے پہنچ کر ندی کو دیکھنے لگی۔ درختوں کے پرے ندی کے پانی کی پتلی لکیر کے اوپر ڈوبتے ہوئے سورج کی شفق آلود کرنیں جھلملا رہی تھیں۔ زینو اس پتلی سی لکیر کو دیکھتی رہی، کئی لمحے دیکھتی رہی اور پھر بغیر کسی ارادے کے، بغیر کچھ سوچے سمجھے آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگی۔ اُس کے پاؤں بار بار گیلی مٹی میں دھنس جاتے تھے، بے خبری کے عالم میں اسے بار بار ٹھوکر

گئی تھی۔ لیکن اس کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ وہ برابر قدم اٹھاتے جا رہی تھی — آگے ہی آگے بڑھتے جا رہی تھی! — رحمان اپنے کھیت سے بیلوں کی جوڑی واپس گھر لے جا رہا تھا۔ بیلوں کی گھنٹیاں بجیں تو زینو چونک سی گئی۔ یقیناً رحمان اس سے پوچھے گا۔ وہ اس وقت تنہا کہاں جا رہی ہے۔ مگر رحمان نے یہ سوال نہیں کیا۔ اس کی آنکھوں میں طنزیہ مسکراہٹ تھی اور وہ کہہ رہا تھا: "کیوں زینو! آجکل تمہارے خانصاحب تو بڑے زوروں پر ہیں — ہیں نا؟"

زینو نے اس کے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ آخر وہ کہہ بھی کیا سکتی تھی۔ خانصاحب جانیں اور ان کے مزارع۔ اسے بھلا اس بات سے کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ اور جب رحمان ہنستا ہوا بیلوں کو ہانکنے لگا تو زینو پہلے کی نسبت تیزی سے قدم اٹھانے لگی —!

کچھ دور جا کر اُسے محسوس ہوا کہ وہ گھر سے کافی دور نکل آئی ہے ایک جگہ رک کر اُس نے مڑ کر دیکھا۔ خانصاحب کے مکان کی دیواریں درختوں کے پیچھے زمین کی طرف جھکی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اس نے نفرت کے عالم میں وہاں سے نگاہیں ہٹا لیں اور اپنے سامنے دیکھنے لگی۔ ایک بڑھے خمیدہ قد درخت کے نیچے چند کسان بیٹھے بڑے جوش میں باتیں کر رہے تھے۔ یہ باتیں خان صاحب کے خلاف تھیں۔ اس کے سارے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ یہ کسان چند دن پہلے اپنے مالک کے خلاف ایک لفظ تک نکالنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتے تھے مگر اب اس کے خلاف لڑنے کا باقاعدہ پروگرام بنا رہے تھے۔ ان کی حالت میں یہ تغیر کیوں رونما ہو گیا تھا، وہ کیوں یکدم بدل گئے تھے۔ ان میں یہ جرأت کہاں سے آ گئی تھی۔ یہ سوال اس کے ذہن میں ہیجان پیدا کرنے لگے، مگر جیسے اس کی نظر ندی پر پڑی یہ سوال ریت میں جذب ہونے والے پانی کی طرح اس کے ذہن میں تحلیل ہو کر رہ گئے۔ وہ وہاں سے چل پڑی اور تھوڑی دیر کے بعد ندی کے کنارے پر پہنچ گئی۔

چاند پانی کی لہروں کو چیرتا ہوا ادھر اُدھر اپنی روشنی پھیلا رہا تھا ہوا تھم تھم کر چل رہی تھی۔ وہ ایک پودے پر ہاتھ رکھ کر ٹھہر گئی۔ اس کے سینے میں ایک اضطراب سا برپا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک لرزش سی طاری تھی۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر آنکھوں میں آنسو نہیں آتے تھے جیسے آنسوؤں کے سیلاب کے آگے دیواریں حائل ہو گئی ہوں! اسی اثنا میں درخت کا ایک پتا کنارے کے قریب پانی میں گرا اور تیرتا ہوا آگے بڑھنے لگا — یہ پتا کچھ دور جا کر کاغذ کی ایک ناؤ بن گیا جو پانی کے تھپیڑے کھا کھا کر تیر رہی تھی۔ وہ کشتی کو دیکھنے لگی۔ کشتی ہچکولے کھانے لگی، اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور زمین پر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں کے بعد سینے کا بوجھ ہلکا ہو گیا اور وہ نیم وا آنکھوں سے پانی کی سطح پر دو قریب قریب اڑتے ہوئے پرندوں کے سائے دیکھنے لگی۔ ان دونوں سایوں میں فاصلہ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ ایک سایہ غائب ہو گیا۔ زینو کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور اس کی دھلی ہوئی آنکھوں میں چند آنسو اس طرح ٹپک پڑے جس طرح بارش ہو جانے کے بعد کسی جگہ رکے ہوئے پانی کے قطرے ہوا کے جھونکے سے نیچے گر پڑیں — اچانک اُسے محسوس ہوا کہ کسی نے "زینو" کہہ کر پکارا ہے۔ ابھی ابھی ایک ننھا سا آواز اس کے ذہن میں گونج اٹھی ہے — یہاں کون آ سکتا ہے۔ خانصاحب کا کوئی نوکر ہو گا۔ اور کون ہو سکتا ہے۔ مگر یہ اُس پر کون جھکا ہوا ہے — یہ کون ہو سکتا ہے؟ — یہ کس کا ہاتھ ہے — یہ گرم گرم ہاتھ۔ وہ اٹھ بیٹھی اور سامنے جھکے ہوئے چہرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔

"فتوں!"

"ہاں زینو!"

"تمہیں ہو — تم — تم؟"

اس کی رگ رگ میں ہلچل سی مچ گئی۔ اُس نے فتوں کا ہاتھ پکڑ لیا ابھی تک اُسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا تھا۔ ابھی تک حیرت مسرت پر چھائی ہوئی تھی۔ کیا یہ وہی ہستی تھی جو تین سال ہوئے اس کی زندگی کے افق پر شہاب ثاقب کی طرح ٹوٹ کر وقت کی اتھاہ گہرائیوں میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی تھی۔ کیا یہ وہی فتوں تھا جس نے آخری مرتبہ آنکھوں سے آنسوؤں کی بوچھار ہٹا کر کہا تھا۔ "زینو! میں تم سے، تمہارے گاؤں سے ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں — اب کبھی واپس نہیں آؤنگا۔ خدا حافظ!" اور وہ چلا گیا تھا کبھی واپس نہ آنے کا ارادہ لے کر چلا گیا تھا اور وہ خانصاحب کے مضبوط، آہنی بازوؤں میں جکڑ لی گئی تھی۔ ان بازوؤں نے اس کی حسرتوں اس کی رعنائیوں کے تمام پھولوں کو مسل دیا تھا، کچل کر پرے پھینک دیا تھا — اور —

"فتوں!"

"کیا ابھی تک تم نے مجھے پہچانا نہیں ہے؟"

"میں تمہیں نہیں پہچانوں گی تو کس کو پہچانوں گی۔ آخر تم آ گئے — تم آ ہی گئے!"

اور زینو کا سر نمتوں کے سینے سے جا لگا۔ رکے ہوئے آنسو طوفان بن گئے۔

"زینو دل کو قابو میں رکھو۔ کیوں رو رو کر جی ہلکان کئے جا رہی ہو۔ اب آنسو پونچھ ڈالو"

زینو کے آنسو رک گئے لیکن اُس نے سر نہ اٹھایا۔ اس نے اپنی بانہیں اپنے محبوب کے شانوں پر پھیلا دیں۔

"تم بڑی ہوشمند لڑکی ہو۔ تم صبر و ضبط سے کام لینا جانتی ہو" نمتوں نے اس کے خشک بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"اب میں کچھ بھی نہیں جانتی — اب میں کچھ بھی نہیں جان سکتی"

"یہاں بیٹھ جاؤ زینو!"

زینو نے تڑپ کر سر ہٹا لیا۔ نمتوں کے لہجے میں اجنبیت جھلک رہی تھی۔

"زینو! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے!"

وہ اسے گھور گھور کر دیکھنے لگی جیسے کچھ سمجھ نہیں رہی یا سمجھ رہی ہے تو اس پر اعتبار کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

"تمہارے پاس وقت نہیں اور میری زندگی ختم ہو رہی ہے۔ خدا کے لئے مجھے یہاں سے لے چلو — میں سسک سسک کر مر جاؤں گی"

"حوصلہ کرو!"

"حوصلہ کروں" کیا اب وہ حوصلہ کرنے کے قابل ہے۔ نمتوں کس دل سے یہ الفاظ کہہ رہا ہے — وہ چپ چاپ اسے دیکھنے لگی۔ اُس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں۔ نمتوں! میرے محبوب! تم میری زندگی کی رونق تھے، میری زندگی کی حرارت اور روشنی تھے۔ تمہارے جانے کے بعد میری زندگی ایک ویرانہ بن گئی تھی۔ میں ایک ایسا تنکا بن کر رہ گئی تھی جسے پانی کی کوئی لہر کنارے سے ہٹا کر نہ جانے کہاں سے کہاں لے گئی ہو۔ میں غریب تھی۔ تم بھی ایک غریب اُستاد تھے۔ خانصاحب کی دولت نے مجھے تم سے چھین لیا۔ مگر تم میرے تھے۔ شادی کے بعد بھی میرے ہو اور ہمیشہ میرے رہو گے یہ شادی ایک فریب ہے، ایک دھوکا ہے۔ بھلا بچپن کے رفیق بھی کبھی جدا ہو سکتے ہیں — میں تمہیں ہر روز یاد کیا کرتی تھی — اب تک یاد کرتی رہی ہوں۔ اب تم کہہ رہے ہو حوصلہ کرو۔ میں حوصلہ کر سکتی ہوں — تم حوصلہ کر سکتے ہو — ؟ کیا تم بدل گئے ہو، کیا شہر میں کسی لڑکی نے تمہارا دل چھین لیا ہے — ؟

زینو کی خاموش نگاہیں سوال کرتی رہیں اور نمتوں چپ چاپ کھڑا رہا۔

"بیٹھ جاؤ زینو!"

زینو بیٹھ گئی

"میں تمہیں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔ ذرا حوصلے سے کام لو!"

"کیا تم مجھے لے جا نہیں سکتے؟ اگر تم نہ آتے تو میں بقیہ زندگی گل سڑ کر کسی نہ کسی طرح ختم کر ہی دیتی مگر اب تم آ گئے ہو تو تنہا جا نہیں سکتے — میں ساتھ چلوں گی — جہاں کہو گے وہاں چلوں گی۔ ہم وہاں پہنچ جائیں گے جہاں اس منحوس زمیندار کی دولت کا سایہ تک نہیں پڑ سکے گا!"

زینو کو یقین تھا کہ یہ الفاظ سن کر اس کا محبوب اسے بازوؤں کی قوس قزح میں لے لیگا۔ مگر یہ دیکھ کر اُسے سخت حیرت اور مایوسی ہوئی کہ نمتوں خاموش بیٹھا رہا اور اس لکڑی کو دیکھتا رہا جس کا کچھ حصہ زمین کے اندر دھنسا ہوا تھا۔ اور جسے بہلے جانے کی پانی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

"میں تمہیں لے جانے کے لئے نہیں آیا۔ میں تمہیں کہیں بھی نہیں لے جا سکتا!" نمتوں نے پلٹ کر زینو کو دیکھا اور صاف آواز میں یہ الفاظ کہہ کر اس کے اور قریب ہو گیا۔

زینو حیران و ششدر نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"زینو! ہمیں بچپن ہی میں ایک دوسرے سے محبت تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمیں ایک دوسرے سے کوئی طاقت بھی جدا نہیں کر سکے گی۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ ہم نے جو کچھ سوچا تھا۔ جو کچھ سمجھا تھا۔ وہ بچپن کی معصومیت تھی۔ میں غریب مدرس تھا۔ اس لئے تمہیں تمہارے والدین سے حاصل نہ کر سکا۔ زمیندار دولتمند تھا۔ اس لئے وہ تمہیں مجھ سے چھین کر لے گیا۔ تمہاری جدائی میرے لئے ناقابل برداشت تھی اس لئے شہر چلا گیا۔ زندہ تو بہرحال رہنا تھا۔ اس لئے ایک کارخانے میں ملازم ہو گیا۔ تمہیں معلوم

نہیں وہ دن، وہ راتیں میں نے کس طرح تڑپ تڑپ کر گذاری ہیں ۔ جدائی نے میرا کیا حال کر رکھا تھا۔ اکثر جی چاہتا تھا کہ یہاں آؤں اور اپنی جان پر کھیل کر تمہیں کسی نہ کسی طریقے سے لے جاؤں۔ شاید میں اپنا یہ ارادہ پورا بھی کر لیتا کہ انہی دنوں کارخانے کے ملازموں نے تنخواہ کم ہو جانے پر ہڑتال کر دی۔ ہڑتال کرنے والوں میں میں بھی تھا۔ ہم نے بیکاروں کی انجمن بنائی۔ اس انجمن میں صرف وہی مزدور نہیں تھے جنہیں ہمارے کارخانے سے جواب مل گیا تھا بلکہ وہ لوگ بھی تھے جو عرصے سے بیکار تھے اور فاقے پر فاقے کر رہے تھے۔ زینو! اس وقت زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ کس طرح غریبوں، کسانوں، مزدوروں کے خون کے قطرے سونے چاندی کی اینٹیں بن بن کر سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور زمینداروں کے گھروں میں جمع ہو رہے ہیں اور کس طرح دن رات محنت کرنے والے مزدور بھوکے مر رہے ہیں۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ہمارے سماج میں دو طبقے ہیں۔ ایک کام کرنے والے اور دوسرے گھوڑ گھوڑ کر کام کرنے والوں کو لوٹنے والے۔ مجھے تم یاد تھیں مگر اس وقت تمہارے ساتھ ان عورتوں کی شکلیں بھی سامنے آگئیں جو تمہاری طرح غربت کی چکی میں پس کر جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی چوکھٹ پر جا گری تھیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جب تک ہمارا سماج ہزاروں لوگوں کو بھوکا رکھ کر صرف ایک شخص کے ہاں دولت کے ڈھیر لگاتا رہے گا۔ یہاں ہر قسم کا ظلم ہوتا رہے گا۔ یہاں لوگ بھوک سے مرتے رہیں گے۔ یہاں جہالت پھیلتی رہے گی۔ یہاں محبت سسکتی رہے گی اور میں اس جماعت کے ممبروں میں شامل ہو گیا جو موجودہ سماج کو بدل ڈالنا چاہتے ہیں۔ جو ایک زینو کو نہیں ہزاروں لاکھوں زینوؤں کو جوبن کی چاردیواری سے باہر نکالنا چاہتے ہیں۔ جو سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور زمینداروں سے ظلم کرنے کی طاقت چھین لینا چاہتے ہیں۔ جب یہ سماج بدل جائیگا تو ہر انسان آزاد ہو جائے گا محبت آزاد ہو جائے گی۔ اس وقت کوئی سرمایہ دار نہ ہو گا۔ کوئی جاگیردار نہ ہو گا۔ کوئی شخص بھی دوسرے کی محبت کو نہیں کچل سکے گا۔ میں اور میرے ساتھی اس دور کو جلد سے جلد لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ دور آکر رہیگا ۔ ضرور آکر رہے گا۔"

نتھو کی پرجوش آواز خاموش ہو گئی۔ زینو ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھ رہی تھی۔ ندی کا پانی ڈھلتی ہوئی کلاری سے بدستور الجھ رہا تھا۔ فضا میں پرندوں کی ایک لمبی قطار کا سایہ پانی پر پڑا اور دم بھر میں غائب ہو گیا۔ زینو نے پانی سے نظریں ہٹا کر پرندوں کو دیکھا۔ درختوں کے جھنڈ کے اوپر ساتھ ساتھ اڑے چلے جا رہے تھے ۔ وہ اڑتے رہے اور تاریکی میں ڈوب گئے!

"میں چھ ماہ سے یہاں ہوں۔"

"چھ ماہ سے؟" زینو کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔

"چھ ماہ سے چھپ کر کام کر رہا تھا۔ میرے ذمے کام یہ تھا کہ یہاں کے کسانوں کو بیدار کروں، انہیں ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی تلقین کروں، انہیں بتاؤں کہ ان کے بنیادی حقوق کیا ہیں اور زمیندار کو کوئی حق حاصل نہیں کہ ان کی محنت کا پھل خود کھائے۔ میرے ساتھ یہاں میری جماعت کے اور لوگ بھی ہیں۔ سب یہی کام کر رہے ہیں۔ اور آج ہماری ہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ کسانوں نے اپنے مطالبات پیش کئے کھیتوں میں کام کرنا بند کر دیا ہے۔"

"تم چھ ماہ سے یہاں ہو؟" زینو نے دوبارہ پوچھا

"ہاں ۔ تم حیران ہو کہ اتنے لمبے عرصے میں تم سے کیوں نہ ملا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ میرے سامنے میرا مقصد تھا۔ اب یہ مقصد بہت حد تک پورا ہو گیا ہے۔ اور میں آج پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا۔ اگر آج تم اتفاق سے نہ آجاتیں تو میں کل پیغام بھیج کر تمہیں بلا لیتا۔ میری آرزو یہی ہے کہ تم اپنے دل سے مایوسی دور کر دو اور اس آنے والے دور کا انتظار کرو جب ہر انسان ظلم سے نجات حاصل کرے گا۔ مصیبت کے دن باقی ہیں۔ لیکن ان دنوں کے بعد جب نئے دور کی چمکیلی صبح نمودار ہو گی تو ہم آزاد ہونگے۔ ہم ہر ظلم سے نجات حاصل کریں گے ۔!"

نتھو کی آواز میں کوئی لرزش نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں ایک نئی روشنی سے چمک رہی تھیں۔ زینو نے پہلے کبھی اس کی آنکھیں ایسی روشن نہیں دیکھی تھیں!

"میں اب یہاں نہیں رہوں گی۔"

"تو کہاں جاؤ گی ۔ میں جس مقصد کے لئے اپنی زندگی وقف کر چکا ہوں اس کی راہ سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹونگا۔ دوسرے اب میرا ابھرو سہ کیا ہے۔ گرفتاری کے وارنٹ نکل چکے ہیں۔ کون جانے

کب گرفتار ہو کر جیل میں ڈال دیا جاؤں۔ کیا تم نہیں چاہتیں کہ جاگیردار غریب کسانوں پر جو ظلم کر رہے ہیں وہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیئے جائیں۔ آئندہ کسی نمتوں کو کسی [illegible] سے جدا ہو کر نہ جانا پڑے۔ آئندہ کسی زینو کو زمیندار کی چار دیواری میں گھل گھل کر نہ مرنا پڑے۔"

زینو کے ہونٹ خاموش رہے مگر اس کی آنکھیں اثبات میں جواب دے رہی تھیں۔

"اگر تمہاری یہ آرزو ہے تو تم ہماری مدد کر سکتی ہو!"

"میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"

"زینو! تم ابھی تک حقیقت کو نہیں سمجھ سکیں۔ میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا۔"

"پھر ـــ؟"

"پھر؟"

"ہاں پھر کیا ہوگا؟"

"زینو پہلے یہ بتاؤ۔ اپنی زندگی کا میں نے جو مقصد بنا لیا ہے وہ تمہیں پسند ہے؟"

"یہ مقصد کس کو پسند نہیں ہوگا؟" زینو بولی۔

"تو زینو! سنو، کسان بیدار ہوتے جا رہے ہیں۔ تم عورتوں کے دلوں تک یہ پیغام پہنچا سکتی ہو۔ تم انہیں سمجھا سکتی ہو کہ زمینداروں کے ظلم کے خاتمے کا وقت آ پہنچا ہے۔ انہیں کسی حالت میں بھی دبنا نہیں چاہئے۔ جب تم یہ کام شروع کرو گی تو تمہیں صرف اپنی ناکام محبت ہی کا دکھ یاد نہیں رہے گا بلکہ تمہارے دل میں اوروں کا دکھ بھی سما جائے گا۔ ان لوگوں کا دکھ جو رات دن محنت کرنے کے باوجود روٹی اور کپڑے کو ترستے رہتے ہیں، جو اپنے بچوں کو اچھی غذا نہیں دے سکتے، جو ساری عمر زمینداروں کے ادنیٰ غلام بنے رہتے ہیں، جو محبت کے دکھ اٹھاتے ہیں جن سے ان کی محبوبائیں چھن جاتی ہیں۔ جو پہلے سانس سے آخری سانس تک قرضے کے بوجھ تلے دبے رہتے ہیں!"

زینو کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ اور اس کی جھکی ہوئی گردن اکڑ گئی تھی!

"مجھے آج رات اس گاؤں سے چلے جانا چاہئے اور اس وقت تمہیں مشورہ کرنا ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے!"

"تم جا سکتے ہو۔"

"زینو!" نمتوں کی آواز میں مسرت کی لرزش تھی۔

"مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا ضرور کروں گی!"

چند منٹ کے بعد جب زینو لوٹی تو اس کے دماغ میں ایک نئی امنگ، ایک نیا ولولہ موجزن تھا۔ راستے میں اسی بوڑھے درخت کے نیچے کسان جمع تھے۔ وہ بائیکاٹ جاری رکھنے کا عہد کر رہے تھے ـــ زینو کو یوں محسوس ہوا جیسے نمتوں نے جس آنے والے دور کا ذکر کیا تھا۔ وہ آ پہنچا ہے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اپنے مکان کے صحن میں داخل ہو گئی۔

خانصاحب ابھی تک زمینداروں اور پولیس کے سپاہیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ وہ کوٹھے پر چلی گئی اور جب اپنی چارپائی کے قریب کھڑے ہو کر اس نے درختوں کے پرے دیکھا۔ نور کی پتلی لکیر صبح کے وقت افق سے بہتی ہوئی روشنی کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اس کی رگ رگ میں ایک تیز، شدید، ہمہ گیر لہر دوڑ گئی!

ن م راشد

اِنتظاریہ

ایران میں اجنبی

[ن م راشد "ایران میں اجنبی" کے نام سے تین قطعوں (CANTOS) کی ایک طویل نظم لکھ رہے ہیں۔ اس نظم میں گذشتہ جنگ کے زمانے میں اُن کے قیامِ ایران کے تاثرات ہیں۔ اس سے پیشتر اس نظم کے چند قطعات بعض معاصرین نے شائع کئے ہیں۔ ہم ذیل میں اس کا گیارھواں قطعہ شائع کر رہے ہیں۔ یہ قطعہ اُس زمانے کی تالیف ہے جب ایران جنگ کے باعث سخت سیاسی اور اقتصادی فشار کی حالت میں تھا۔ ادارہ]

وزیرِ معارف، علی کیانی نے

"شمشیرِ ایراں" کا تازہ مقالہ پڑھا،

اور محسن فرخزاد کی تازہ "تصنیف٭" دیکھی،

جو طہران کے سب تماشا گھروں میں

کئی روز سے قہقہوں کے سمندر بہانے لگی تھی۔

تو وہ سر کھجانے لگا،

اور کہنے لگا:

"لو اسے کہہ رہے ہیں،

علی کیانی کی تازہ "جنایت"!

بھلا کونسا ظلم ڈھایا ہے میں نے

جو بانو رضا بہبانی سے

اتنی ہزار اور دس دیال

٭ تصنیف: سیاسی طنز جو گائی جاسکے

اپنا حق جان کر

راہداری کے بدلے لیتے ہیں ؟

خدائے توانا و برتر

وزارت ہے وہ دردِ سر

جس کا کوئی مداوا نہیں ہے !

رضا بہبانی

ولایت سے ڈگری طبابت کی لے کر

جو لوٹے گی

کچھ تو کمائے گی

پہلے سے بڑھ کر کمائے گی آخر !

اور اس پر یہ ایراں فروشی کے طعنے !

یہ کہرام ، اے مسخرے روزنامہ نگارو !

یہاں سات بچّوں کے تنوّر

ہر لحظہ فریاد کرتے ہوئے

اور خانم کے

گلگونہ و غازہ و کفش و موزہ کے

یہ روز افزوں تقاضے !

ادھر یہ گرانی ،

اِدھر یہ وزارت کی کرسی

فقط شاخِ آہو!"

تو اس پر علی کیانی نے سوچا ـــــ
اٹھایا قلم اور لکھا:

جنابِ مدیرِ شہیر،

آپ کی خدمت فائقہ کے عوض

دس ہزار اور چھ سو ریال

آپ کو صد ہزار احترامات کے ساتھ

تقدیم کرتا ہے بندہ!"

یہ پرکالۂ آتشیں چھوڑ کر

اور مقالۂ "تصنیف" کی یاد دل سے بھلا کر

لگا جھولنے اپنی کرسی میں آسودہ ہو کر

وزیرِ معارف، علی کیانی!

قرۃ العین حیدر

کیکٹس لینڈ

اب خزاں بھی واپس جا رہی ہے۔ اور سفیدے کے جنگل پر ہریالی اتر رہی ہے اور جھیل کے پودے کنارے تک پھیل آئے ہیں۔ اور جب سبز بانس کا جھنڈ پانی کی سطح پر جھک کر ہوا میں ڈولتا ہے۔ تو چپکے سے رونے کو جی چاہتا ہے۔ سفیدے کا چھوٹا سا جنگل اسی طرح چپ چاپ کھڑا ہے۔ اور اسیسی کی خانقاہ بھی اسی طرح خاموش اپنی جگہ پر موجود ہے اور کبھی کبھی کوئی راہگیر پتیوں کو روندتا سفیدے کے جھنڈ میں سے گزر جاتا ہے۔

میری کمیل! تم نے اس موسم، ان سرخ پتیوں اور اس راہگیر کی تصویر کیوں نہیں بنائی۔ خزاں جا رہی ہے اور راتوں کو مٹی میں سے پھولوں کی مہک نکلتی ہے۔ اور وہ زمانہ آنے والا ہے جب لوگ گھروں سے نکل کر پانی کے کناروں پر ٹہلتے ہیں اور پورب کے کھیتوں اور گیتوں کو یاد کرتے ہیں۔

وہ دن بھر سمر ہاؤس میں بیٹھی رہتی ہے۔ اور پتے چاروں طرف اڑتے ہیں اور اسیسی کے گھنٹے جھیل کے پار اپنی متوازن یکسانیت سے بجتے رہتے ہیں۔ ابھی ڈوبی آئیگا۔ اپنا گھوڑا درخت کے نیچے باندھ کر لمبے لمبے بےفکر قدم رکھتا گھر کی طرف مڑیگا۔ اور چائے پینے کے بعد شام کو پھر شہر کی طرف نکل جائیگا۔ فضا میں بہار کی نئی ہواؤں نے منڈلانا شروع کر دیا ہے اور بانس کی ٹہنیاں آہستہ آہستہ سرسرا رہی ہیں۔ میں سوئٹزرلینڈ جا رہی ہوں۔ وہ خط میں لکھتی ہے۔ میں سوئٹزرلینڈ جا رہی ہوں۔ وہاں سے بلجیم چلی جاؤنگی۔ عطیہ آج کل وہیں ہے اور کتابیں لکھنے میں مصروف ہے۔ وہ پچھلی بین الاقوامی آرٹ کی نمائش کے لئے گئی تھی۔ اور اب تک نہیں لوٹی۔ لکھتے لکھتے وہ خط کو پرزے پرزے کر کے کسی گملے کے پیچھے پھینک دیتی ہے جہاں ایک بڑی سبز مکھی کھڑکی کے شیشوں سے ٹکرا کر بھنبھنا رہی ہے اور اس کی بھنبھناہٹ کی آواز باہر کی ہواؤں کی گونج میں مل جاتی ہے۔

میں سوئٹزرلینڈ ہرگز نہیں جا رہی ہوں۔ وہ لکھتی ہے اسکے لئے سب جگہیں ایک سی ہیں۔ لندن۔ پیکنگ۔ روم۔ روم جہاں شکنتلا ہے۔ اندھیرا گہراتا آ رہا ہے۔ اور شام کی ہوائیں پھر رہی ہیں۔ سمر ہاؤس کے باہر سایہ دار راستے کے پتوں میں مدھم سا لیمپ جھلملا اٹھا ہے۔ اور اس روش پر اجالا پھیل گیا ہے۔ جو گھر کی طرف جاتی ہے۔

وہ سمر ہاؤس میں بیٹھی ہے۔ اور بہار کی آمد آمد ہے۔ جھیل کے پار، اسیسی کے باغ پہ خاموشی طاری ہے۔ اور سفیدے کے جنگل کے کنارے کنارے جو راستہ جاتا ہے۔ اس پر وہ سرخ پتھروں والا گھر ہے جو آم کے درختوں میں گھرا ہے۔ جہاں وہ رہتا تھا۔

صبح کو لکڑی کے پل پر سے گزر کر راہبوں کی سفید پوش ٹولیاں عبادت خانے کے راستے کی طرف جاتی ہیں۔ جدھر خوبانی کی ہری ٹہنیوں کے نیچے وہ تصویر کی مریم کی پرستش کرتے ہیں اور سنہری بالوں والے بچے وہاں جنگلی پھل چننے کیلئے آتے ہیں۔

یہ اس کا گھر ہے۔ اس گھر میں وہ برسوں سے رہتی آئی ہے اس زمین پر وہ سب صدیوں سے جیتے اور مرتے رہے ہیں۔ یہ گھر، یہ باغ۔ یہ سمر ہاؤس۔ جھیل کے پار حد نظر تک پھیلے ہوئے کھیت اور چراگاہیں اور ایک بار ایسا ہوا کہ وہ ان سب چیزوں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ بہت دور چلے گئے اور اب کبھی ان جگہوں

کی خاموش اپنائیت، ان کی چپ چاپ پکار سننے کے لئے واپس نہ آئینگے۔ سفیدے کے جنگل کے کنارے اس راستے پر باغیچوں اور درختوں کے کنجوں میں چھپے ہوئے سارے گھر خاموش کھڑے ہیں کبھی کبھی کوئی مالی یا کہار آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اندر سے نکل کر احاطے کے پھاٹک پر آکھڑا ہوتا ہے۔ اور ناریل کو بیدلی سے کریدنے کے بعد اکتاہٹ کے ساتھ جھیل کی طرف دیکھتا ہے۔ اور پھر اندر چلا جاتا ہے۔ یا کبھی کبھی کوئی بھولی بھٹکی کار خاموشی سے کسی پھاٹک سے برآمد ہوکر سفیدے کے جھنڈ میں سے شہر کی سمت گزر جاتی ہے۔

وہ سمر ہاؤس میں بیٹھی ہے اور شام کی تاریک ہوائیں باغ پر منڈلا رہی ہیں۔

میری کمیل۔ کیا تم اس تاریکی کی تصویر نہ بناؤگی؟

اور وہ جو پیلو سعید ہے۔ سمر ہاؤس میں چپ چاپ بیٹھی ہے جھیل کے پار آسی کی خانقاہ کے گھنٹے یک لخت بجنا شروع ہوگئے ہیں اور اب سفید پوش راہب اور سنہرے بالوں والے لڑکے شام کی نماز کے لئے ہاتھوں میں چاندی کی اونچی موم بتیاں اُٹھائے پل پر سے گزر رہے ہیں اور سفیدے کا چھوٹا سا جنگل چپ چاپ کھڑا ہے۔

آسی کے گھنٹے بج رہے ہیں اور سفیدے کے جنگل اور سبز بانس کے جھنڈ پر اندھیرا گہرا تا آرہا ہے۔

خداوند ہمارے پُرکھوں کے خدا، جو ہمیشہ سے تھا، اب ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

خداوند ہمارے خدا کے برّے جو دنیا کے گناہوں کو اٹھا لیجاتا ہے

خداوند ہمارا لخدائے مطلق جو ابد الآباد تک جیتا اور سلطنت کرتا ہے۔

خوبانی کے جھنڈ میں مریم کی شرائن کے آگے جھکے۔ وہ دعا مانگ رہے ہیں۔ اے سینٹ آین کی بیٹی ہم پر رحم کر۔ رحم کر۔

ہم حوّا کے بد نصیب فرزند اِن آنسوؤں کی وادی میں سے روتے چلاتے تیرے سامنے سے گزرتے ہیں۔ ہم خاک اور گناہ سے بنے ہوئے انسان بہت کمزور اور بہت نالائق ہیں۔ ایسا ہو ہماری گریہ و زاری تیرے حضور میں پہنچ جائے!

اے ملکۂ جنت ہم پر اپنا فضل کر۔

اے خدا کے برّے، گو میری چھت اس لائق نہیں۔ کہ تو اس کے نیچے آئے۔ لیکن اگر تو ایک بات کہہ دے تو میری روح بچ جائے گی۔

آسی کے گھنٹوں کی گونج فضا میں منڈلاتی، پھیلتی، اور ڈوبتی جا رہی ہے۔

وہ سمر ہاؤس میں بیٹھی ہے۔ وہ جو پیلو سعید ہے۔ اور اجنبیوں کے دیس کو جاکر وہاں سے لوٹ آئی ہے اور اس نے دیکھا ہے کہ سفیدے کا جنگل اتنا ہی خوبصورت ہے۔ اور آسی کے گھنٹے اسی طرح گونج رہے ہیں۔ اور راستے کے پرے پر آموں میں گھرا ہوا سرخ اینٹوں والا گھر بند پڑا ہے۔ کیونکہ وہ اس میں سے جا چکا ہے۔ اور کبھی لوٹ کر نہ آئیگا۔ وہ نئے دیس کو اپنا چکا ہے۔ اس نے اپنی اس پرانی زمین کی پکار کو نہیں سنا۔ اور اس پکار کو سننے کے بعد جو جذبہ اس نے محسوس کیا۔ اسے اس نے شکست دیدی اور آگے چلا گیا۔ لیکن بانس کی شاخیں اسی طرح سرسرا رہی ہیں۔ اور بہار آنے والی ہے۔

خزاں آہستہ آہستہ واپس جا رہی ہے۔ میری کمیل۔ کیا تم اس موسم، ان سرخ پتوں، اور ان تاریک ہواؤں کی تصویر نہ بناؤگی؟ خزاں واپس جا رہی ہے۔ آؤ ہم بھی اسکے ساتھ لوٹ چلیں۔ اور پیچھے۔ اور پیچھے۔

(۲)

آسمان کی ملکہ۔ زمین کی مالک۔ صبح کے روشن ستارے۔ ایلیلیاہ

گھنٹے بجنے بند ہوگئے۔ ہال میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ ان گنت رنگ برنگے بالوں والے سر سامنے میزوں پر جُھکے ہوئے تھے۔

اپنی انگلیوں میں جو روشنائی لگ گئی تھی، جلدی سے اپنے بالوں میں انھیں پونچھ کر اس نے ڈائیس پر جاکر دوسری کاپی لی اور اپنی میز کی طرف مڑی۔ اس وقت اس نے اپنے پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکی کو پہلی بار دیکھا۔ وہ لڑکی جو عمر میں اس سے بہت بڑی معلوم ہوتی تھی۔ جس نے اپنے سیدھے سیاہ بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنا رکھا تھا۔ اور جس کے کلاسیکل قسم کے پروفائیل سے غرور،

خود پسندی اور احساسِ برتری کا عجیب سا امتزاج مترشح تھا۔ اس کے ٹیونک کا رنگ مختلف تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی دوسرے اسکول سے، غالباً لا مارٹینیئر سے امتحان دینے کے لئے وہاں آئی تھی، بے تعلقی کے ساتھ وہ اجنبی لڑکی اپنی میز پر سر جھکائے لکھنے میں مصروف رہی۔

میں قطعی طور پر پاس کر لیا کروں گی۔ وہ جو پہلو سعید تھی اس نے بچوں کی طرح دل میں طے کیا اور دوبارہ انگلیاں بالوں میں صاف کر کے لکھنے میں مشغول ہو گئی۔

یہ سینیئر کیمبرج کے امتحان کا آخری روز تھا۔ باہر خانقاہ کے باغ میں دسمبر کی ہوائیں سرسرا رہی تھیں۔ جھیل کے کنارے اور سفیدے کے جھنڈ خاموش پڑے تھے۔

پھر گھنٹے بجے اور آتشی کے بڑے ہال سے وہ سب باہر نکل آئیں۔

"میں طلعت جمیل ہوں"، اجنبی لڑکی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے اسی بے تعلقی سے مڑ کر اسے مطلع کیا۔ "عطیہ فاروق کی کتابیں اگر ابھی آپ کے پاس موجود ہوں تو آپ ادمنیوڈی پیرو کے ذریعے مجھے انہیں مارٹینیئر بھجوا دیجئے گا —"

"تم پر خدا کی لعنت ہو طلعت جمیل۔" اجنبی لڑکی کو مجمع میں سے غائب ہوتا دیکھتے ہوئے اس نے جو پہلو سعید تھی۔ چپکے سے کہا۔ اور پھر اپنے بال پیچھے کو سمیٹ کر باہر آ گئی۔

سفیدے کا جھنڈ اور لکڑی کا پل عبور کر کے وہ بہت اکتاہٹ کے ساتھ اپنے گھر پہنچی۔

گھاس پر دھوپ میں اس کی چھوٹی بہن، بلیاں اور خرگوش بیٹھے تھے۔ اس کا بھائی ڈوپی برآمدے میں کمینوسے گرین بنانے میں مشغول تھا۔ پہلو کے برآمدے میں طوطی پچوان گڑگڑا رہے تھے پیچھے مرغیاں کٹ کٹا کرتی پھر رہی تھیں۔ یہ اس کا گھر تھا۔ جو فارغ، پُرسکون اور خوبصورت تھا۔ جہاں وہ کبھی رنجیدہ نہ ہوئی تھی۔

"منہ کیوں لٹکائے ہو کر دیا پرچہ کا؟" ڈوپی نے چلا کر شاشت سے دریافت کیا۔

"پہلے جاکر کی نا بھرتر لو۔ پھر آکر مطلع فرماؤ کیسا رہا پرچہ" گھاس پر سے شہر زاد اس کی چھوٹی بہن چلائی۔

"ابھی ہائی کمانڈ کی طرف سے پریس نوٹ ریلیز ہوا ہے کہ کرسمس گزارنے کے لئے تم دونوں نہایت نامعقول خرگوشیوں کو دوبارہ پھوپھی بیگم کے ہاں بھیجا جائے۔" ڈوپی نے پیچوان کی آواز کی طرف اشارہ کر کے بے حد اہمیت سے اطلاع دی۔

"ہائے رے۔ ابھی کچھ اور امور خانہ داری، سیکھنے باقی ہیں؟" شہر زاد نے فکر مندانہ لہجہ میں پوچھا۔ پچھلی چھٹیوں میں ان دونوں کو اپنی ایک خالہ کے ہاں کھانا پکانا سیکھنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ لیکن وہاں وہ کھانا پکانے کے بجائے خالہ کے چیمبین لڑکوں کے ساتھ دن بھر اسکیٹنگ کیا کرتی تھیں۔

"اور پھوپھی بیگم کے ہاں آتے ہوئے ہیں بڑے آبا — ان کی ٹریننگ میں دیا جائیگا تم دونوں کو" ڈوپی نے پھر مطلع کیا۔

لڑکیوں نے ایک دوسری کو سہم کر دیکھا اور اندر چلی گئیں۔

اس وقت پھوپھی بیگم کے ہاں جانے کے لئے پیکنگ کرتے کرتے رُک کر پہلو نے یک لخت "ڈوپی سے پوچھا۔" ڈوپی بھیا تم طلعت جمیل کو جانتے ہو؟ تمہارے مارٹینیئر ہی میں ہے شاید۔ بڑی سی لڑکی ہے۔ لمبی سی ناک۔ سمجھتی ہے اپنے آپ کو ہیلن آف ٹرائے —"

ارے وہ — طلعت آپا۔ سر فاروق کے ہاں جو رہتی ہیں؟ کیوں۔ تم نہیں جانتیں انہیں؟" ڈوپی نے سیٹی بجاتے بجاتے رُک کر کہا۔

"سر فاروق کے ہاں —؟"

"ہاں۔ ان کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ اسلئے وہ بچپن سے سر فاروق کے گھر پر رہتی ہیں۔ ان کے آبا سر فاروق کے بہت گہرے دوست تھے۔" ڈوپی نے جواب دیا۔

"اچھا — تعجب ہے کہ میں نے پہلے کبھی انکو نہیں دیکھا۔"

"زیادہ تر تو طلعت آپا بورڈنگ ہوس میں رہتی تھیں اسکول کے۔ نینی تال میں تو ہم روز ان کے ساتھ رائیڈنگ کے لئے

جایا کرتے تھے —" ڈولی نے مطلع کیا۔

"تم بہت مرعوب معلوم ہوتے ہو طلعت آپا سے اپنی —" بیلو نے اور بھی جل کر کہا۔ اور پیکنگ میں مشغول ہوگئی۔

پھوپھی بیگم کا گھر ایک قسم کا ریفارم اسکول تھا۔ جہاں خاندان بھر کے سارے بچوں کو جو زیادہ شرارتیں کرتے تھے، ٹریننگ کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ ہمیشہ چھٹیوں میں کنبے کے سارے کزن وہاں جمع ہوتے۔ اور زیادہ شرارتیں کرتے۔ دن بھر غل مچتا۔ درختوں پر چڑھ کر کھانا کھایا جاتا۔ الماریوں میں گھس کر میوزک کانفرنسیں منعقد ہوتیں۔ پلنگوں کے نیچے اور صوفوں کے پیچھے چھپ کر مشاعرے ہوتے حالات جب پھوپھی بیگم کے جو گویا ڈائرکٹر جنرل تھیں، قابو سے باہر ہو جاتے۔ تو پریشانی کے عالم میں بڑے ابا کو بلایا جاتا۔ جو ڈی آئی جی پولس ہونے کی وجہ سے بے حد ڈکٹیٹر قسم کے انسان تھے اور ساتھ ساتھ اپنے خیال میں مصلح ملک و قوم بھی تھے اور نئی پود کی طرف سے سخت مایوس تھے۔ لہٰذا دن بھر وہ مختلف زاویوں سے لیکچر پلاتے رہتے۔ حکم یہ تھا کہ چھٹیوں کا ایک لمحہ بھی بیکار نہ گنواؤ۔ باغ میں جاؤ تو درختوں پر چڑھنے اور کودنے پھاندنے کے بجائے بوٹنی پریکٹیکل میں مشغول رہو۔ کھانے کے وقت فضولیات میں ایک دوسرے سے الجھنے کی بجائے ملک کی غذائی حالت اور حیاتین کے فوائد اور غذائیات سے متعلق دوسرے مسائل پر سنجیدگی سے تبادلۂ خیالات کرو۔ ریڈیو پر فلمی گانوں کے بجائے صرف کلاسیکل موسیقی سنا کرو۔ اور ہائی بروٹیسٹ پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ جس کا تم لوگوں میں فقدان ہے۔ اسکے علاوہ یہ بھی حکم تھا کہ مجمع میں صرف جنرل دلچسپی کی باتیں کی جائیں۔ لڑکے کرکٹ کا تذکرہ ہرگز نہ چھیڑیں اور لڑکیاں کسی حالت میں بھی قابل معافی نہیں اگر وہ کپڑوں اور میچنگ کے نمونوں کی باتیں شروع کردیں۔ جہاں تک ہو سکے قانون، ریاضی، کیمسٹری، معاشیات وغیرہ کا تذکرہ نوجوانوں کو کرنا چاہیے اور ہر وقت خدا کو یاد کرنا اور بھی زیادہ بہتر ہے۔

رات کے کھانے کے بعد سب نشست کے بڑے کمرے میں جمع ہو جاتے جو شکار کئے ہوئے شیروں، چیتوں اور بارہ سنگھوں کے سروں اور کھالوں سے پٹا پڑا تھا۔ وہیں بڑے ابا کا پیچوان لاکر رکھا جاتا اور ڈنر کے بعد بڑے ابا ایک ذمہ دار ہونہار کی طرح بیٹھتے اور بچی کھچی پود کو سدھارنے کی کوشش شروع کرتے۔ نئی پود نے ان نشستوں کا نام ایکسٹنشن لیکچرز رکھ چھوڑا تھا۔

"پیچوان کی، نے ایک طرف کو رکھ کے اور عینک اتار کے بڑے ابا اپنے بھتیجوں، بھتیجیوں اور بھانجے بھانجیوں کے انتہائی نالائق گروہ کو مخاطب کرتے ہوئے قانون کی موشگافی شروع کرتے اور تواریخ، اسلامیات، اخلاقیات کا تذکرہ ہوتا۔ کمرے کے سر پر کمانوں کے ایک گلدار کا سر رکھا تھا۔ جسکے متعلق روایت تھی کہ بڑے ابا اسے اس کی مونچھوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اپنے ہمراہ خیمے تک لے آئے تھے اور پھر وہاں آرام سے مسہری پر بیٹھ کر اس کا شکار کیا تھا۔ سامعین اکثر اکتا کر اسے دیکھتے رہتے بڑے ابا اپنے لیکچر عموماً اسی گلدار کے ذکر سے شروع کرتے "اے نالائق بچو — اس خوش قسمت گلدار کو دیکھ کر عبرت پکڑو جسے میں نے بائیں ہاتھ سے اور دونوں آنکھیں بند کرکے مارا تھا۔ اور تمہارا یہ حال ہے کہ تم لوگ اپنا نشانہ درست کرنے کی طرف سے بالکل غافل ہو بس دن بھر قلفی گانے۔ ہونہہ۔"

"بڑے ابا یہ گلدار تو ہم لوگوں کو دیکھ کر کچھ بہت زیادہ بشاش نہیں ہے۔ انیمیوں کی سی شکل بنائے بیٹھا ہے۔ کیوں نہ ہم اس بارہ سنگھے کو دیکھ کر عبرت پکڑیں جو آپ نے —" "بس پھر لیے بیچ میں۔ ساری قیامت یہ ہے کہ تم لوگوں میں ڈسپلن نہیں بالکل ہے ہی نہیں ڈسپلن۔ تم لوگوں میں تو ایسا ڈسپلن ہونا چاہیے۔ جیسے ایک فیلڈ مارشل جو جہاز کے مستول کے پاس کھڑا ہو اور —"

"لیکن بڑے ابا جہاز کے مستول کے پاس تو فلیگ آفیسر کمانڈنگ کھڑا ہوتا ہے۔ یوں خیال فرمایئے کہ ایک گورنر جنرل کی طرح جو —" کوئی بول اٹھتا۔

"جو — جو باورچی خانے میں کھڑا حلوہ تیار کر رہا ہے —" دوسرا اپنی رائے کا اظہار کرتا۔

"ہرگز نہیں۔ بلکہ جو گھوڑے پر سوار ہے۔ اور گھوڑے کی دم پیچھے بھاگا چلا جا رہا ہے۔ بگٹٹ —" قیصر کہتا۔

"تو آپ کے خیال میں گورنر جنرل کے گھوڑے کی دم بھی ہونی چاہیے — ؟" کوئی لڑکی سنجیدگی سے دریافت کرتی۔

"تمہاری رائے ہے کہ دم کٹا گھوڑا ہوگا گورنر جنرل کا؟" دوسری اس سے بگڑ کر پوچھتی۔

"بہر حال، اگر گورنر جنرل کو دم کٹا گھوڑا ہی پسند ہے تو کیا میں یا آپ اسے روک سکتے ہیں کہ میاں دم کٹے گھوڑے پر سوار نہ ہو —" کوئی اور جواب دیتا۔ اور پھر نہایت شد و مد سے گھوڑوں پر تبادلہ خیال شروع ہو جاتا۔ بڑے ابا بے بسی کے عالم میں خاموشی سے ان سب کو دیکھتے رہتے اور پھر ان کی طرف متوجہ ہو جاتے۔

کزن لوگ ایک دوسرے سے بحثیں کرتے کرتے الجھ پڑتے کوئی اپنا نظریہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے چلا کر پوچھتا "کیا سمجھتے ہو تم۔ میرے سر میں عقل نہیں ہے ؟"

"جی —" کوئی چھوٹا بھائی جواب دیتا۔

"جی کیا — نہیں ہے میرے سر میں عقل — ؟"

"جی نہیں ہے۔"

"کیا نہیں ہے —"

"عقل"

"کس کی"

"آپ کی۔ سر میں آپ کے —"

"میرے سر میں نہیں کیا مطلب کون پوچھ رہا ہے تم سے میں ؟"

وغیرہ تک بلوہ ہوتا رہتا۔

بڑے ابا رنج سے سر ہلا کر کہتے "بس ان لوگوں کی اصلاح ناممکن ہے۔ ہر وقت فضول کی بحثیں ہر وقت پنگ پنگ

"پونگ۔ بڑے ابا" کوئی چپکے سے کہتا۔

"پونگ کیا — ؟" بڑے ابا گرج کر غصے سے پوچھتے

"پنگ پونگ —" آہستہ سے ان کی تصحیح کی جاتی۔

"کچھ نہیں۔ اصلاح ناممکن ہے۔ قطعی ہو ہی نہیں سکتی بس ہر وقت پنگ پنگ کھیلا جائے گا — ہر وقت —" بڑے ابا بڑبڑاتے ہوئے اپنے مطالعے کے کمرے میں چلے جاتے۔

چھٹیاں شروع ہوئیں اور پیلو، اختر دا اور ڈولی پھوپھی بیگم کے ہاں پہنچے۔ وہاں ان کے دوسرے سب کزن بھی حسب معمول چھٹیاں گزارنے آن پہنچے تھے۔ شکار کے لئے کچھ فاصلے پر ترائی میں کیمپ کیا گیا تھا۔ اپنی زمین کا دورہ کرنے بڑے ابا بھی وہاں پہلے سے آ چکے تھے۔

ایک روز وہ سب بڑے ابا سے مختلف بندوقوں کی اقسام و اوصاف پر ایک اکسٹینشن لیکچر سننے کے بعد الاؤ کے گرد تازہ دم ہونے کیلئے بیٹھے ہی تھے کہ خیموں کی طرف دفعتاً غل مچا کہ چچا رجّو آ گئے۔ چچا رجّو — سب ہڑبڑا کر پھوپھی بیگم کے خیمے کی طرف بھاگے۔

چچا رجّو کنبے کی ایک عجیب و غریب پراسرار شخصیت تھے۔ جوانی کے زمانے میں وہ اپنے گھر والوں سے خفا ہو کر کہیں چلے گئے تھے اور اب دنیا بھر کی سیر کرنے کے بعد اچانک واپس آن پہنچے تھے۔

"چچا تم تو بوڑھے ہو گئے بالکل" پیلو نے ان کے سفید بال دیکھ کر حیرت سے کہا۔

اب ہم چچا رجّو سے ان کی سیاحت کی کہانیاں سنا کریں گے بڑے ابا کے لیکچر اگلی چھٹیوں تک ملتوی۔ سب نے خوش ہو کر سوچا چچا رجّو اپنے ساتھ قصوں کا ایک خزانہ لے کر واپس آئے تھے۔ ہر چیز میں ان کو دخل تھا۔ طب۔ فلسفہ۔ قانون۔ تصوف کلاسیکل موسیقی

دنیا بھر کے واقعات اور قصے وہ سناتے اور سب انتہائی دلچسپی سے سنتے۔ ایک روز سب اپنی میوزک کانفرنس، میں مشغول تھے چچا رجّو سے بھی شدید اصرار کیا گیا کہ وہ کچھ گائیں۔

"ارے بیٹا۔ اب میں کچھ نہیں گا سکتا" انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر افسوس کے ساتھ کہا۔

"کیوں چچا — ؟" سب نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

"ارے میاں، بہت لمبا قصہ ہے۔ جب یاد آتا ہے، تو دل دکھتا ہے۔ بیٹا ـــ ہمالیہ پر میں ماؤنٹ ایوریسٹ کے نیچے بارہ سال تک لے باندھ کر بیٹھا تھا ایک دفعہ۔ بھگوان شیو کو آگیا غصہ اور میری لے توڑنے کے لئے وہ مچھر بن کر میری ناک میں جا گھسے اور مجھے چھینک آگئی اور لے ٹوٹ گئی۔ بارہ سال تک باندھی ہوئی لے ایسی ٹوٹی کہ میری ساری تپسیا بیکار گئی۔ چنانچہ اب میں گا ہی نہیں سکتا۔" چچا جو نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔ ہنستے ہنستے سب لوٹ گئے جب ذرا ہنسی رکی تو چچا نے کوئی اور قصہ چھیڑ دیا۔ فن لینڈ میں جب میں تھا یا برازیل جب میں پہنچا ـــ اپنی سیاحت کے تذکروں کے ساتھ ساتھ چچا ان ملکوں کی عجائبات کے نمونے بھی دکھاتے۔ جو انہوں نے ساری دنیا میں گھوم پھر کر جمع کئے تھے۔ ریڈ انڈین لباس کے پر۔ اسکیموز کی ٹوپیاں۔ تبت کی چا، دانی۔ چچا کو سنجیدہ کسی نے نہ دیکھا تھا ہر وقت سب کے کام آنے کی کوشش میں رہتے۔ خاندان کے نوجوان افراد میں وہ بے حد مقبول ہوگئے۔ لیکن دوسرے لوگوں پر وہ پھر کھلنا شروع ہوگئے تھے۔ کیونکہ اتنے طویل عرصے کی غیر موجودگی کے بعد کوئی کامیابی حاصل کیے یا روپیہ کمائے بغیر وہ پھر آن پہنچے تھے۔ چھٹیاں ختم ہوئیں تو وہ بیلو اور شیرو کے ہمراہ ان کے گھر آگئے۔ جہاں ان کو پیچھے کی طرف کا ایک فالتو سائیڈ روم دیدیا گیا۔ جس کے سامنے وہ دن بھر بیٹھے حقہ گڑگڑاتے یا مرغیوں اور خرگوشوں کی دیکھ بھال کرتے مہینے میں ایک آدھ بار انہیں زمینداری کے کسی کام پر گاؤں کا چکر لگانے کیلئے بھیجا جاتا۔ گھر میں ان کی حیثیت بن بلائے غریب رشتہ دار کی تھی۔ لیکن پھر بھی اپنے بھر وہ سب کے کام آنے کی فکر میں لگے رہتے اور ہر وقت ہنستے ہنساتے رہتے۔

ایسٹر بھی نکلا اور موسم گرما آگیا۔ پھر بارشوں کا زمانہ آن پہنچا اور سفیدے کے جنگل اور بالسنوں کے جھرمٹ پر پانی برسنا شروع ہوگیا جھیل کے کناروں کا سبزہ دور دور تک پھیل گیا۔

کالج کھلا - اور نئی ٹرم کے پہلے روز بیلو کو وہ اجنبی لڑکی دوبارہ کیمپس کے سبزے پر نظر آئی۔ سفید ساری میں وہ زیادہ عمر کی اور زیادہ مغرور نظر آرہی تھی۔ اس وقت وہ اُنیس بیس سال کی ہوگی۔ ڈھیلے سے جوڑے میں سفید پھول لگائے۔ بے حد گرانبار اور لیڈی لائیک طریقے سے چلتی ہوئی، وہ سولہ سالہ بیلو سعید کو ایک بے تعلق اور مشفقانہ سا ہوں کہہ کر آگے چلی گئی۔

پھر، چار سال وہ اس کالج میں ایک جماعت میں اکٹھی رہی۔ کیمپس سے باہر، سوسائٹی میں برابر ان کا سامنا رہا لیکن استسی کے امتحان کے ہال میں جو خاموش قسم کا حریفانہ جذبہ جو عجیب و غریب جھنجھلاہٹ بیلو کے دل میں پیدا ہوگئی تھی۔ وہ کبھی نہ نکل سکی۔ اس کی کوئی وجہ نہ تھی۔ لیکن پھر بھی وہ نفرت اپنی جگہ پر موجود تھی۔ وُہ بیلو سعید، جس کو سب اتنا ایڈ مائر کرتے تھے، اس مغرور لڑکی کی اتنی ہمت کہ اس نے بیلو سے مرعوب ہونے سے قطعی انکار کردیا۔ تم پر خدا کی لعنت ہو طلعت جمیل۔ تم جو سفید ساری پہنے سیلین آف ٹرائے بنی، اکیلی اکیلی اپنے راستے پر چلتی رہتی ہو۔

ڈگری کے آخری امتحانات کے اختتام پر طلعت جمیل سر فاروق کے ہاں سے بھی جانے کیلئے تیار ہوگئی۔

"طلعت آپا کو مرکزی حکومت میں بہت عمدہ ملازمت پر بلالیا گیا ہے۔ اور وہ شملے جارہی ہیں۔" ڈوپی نے اطلاع دی۔

"جہنم میں جائیں تمہاری طلعت آپا۔" بیلو نے کہا۔

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوئیں تو ایک چچا زاد بہن، یعنی بڑے آبا کی لڑکی نشو آپا کا جن کی ان دنوں شادی ہوئی تھی، خط آیا ـــ ہم لینسڈاون جا رہے ہیں۔ تمہارے بھائی صاحب کا مکان تارا گرام ہاؤس وہاں مدتوں سے بند پڑا ہے۔ وہاں جا کر اس کی دیکھ بھال کرنی ضروری ہے۔ تم دونوں بھی کم از کم ایک ہفتے کے لئے نینی تال جانے سے پہلے وہاں آجاؤ۔ ڈوپی میاں کے ساتھ آجاؤ۔ یا اگر ڈوپی میاں حسب معمول اترانا شروع کردیں تو اکیلی ہی آجاؤ۔ اتوار کی شام کو ہم وہاں پہنچ رہے ہیں۔ تم بھی اسی روز پہنچ جاؤ تو اچھا ہے۔ ہفتے بھر کے بعد نینی تال چلی جانا۔ شاید پنکی بھی آجائے بے حد دلچسپ ہے اس سے مل کر بے حد محظوظ ہوگی تم دونوں۔ اس کے پاس ٹیکنی کلر کا مووی کیمرہ بھی ہے ـــ

"واہ جی واہ ـــ لینس ڈاؤن کی فطری خوبصورتی" تارا گرام

ہاؤس کی لائبریری کی ان گنت جاسوسی کتابیں۔ ٹیلیفون ریکارڈ ایک مووی کیمرہ اور پنکی ——— ایک ہفتہ گزارنے کی اس سے بہتر تصویر اور کیا ہو سکتی ہے پیٹو ڈارلنگ ——— ؟ نندہ دیوی پر جب سورج نکلتا ہے ——— " شبّو نے آنکھیں بند کرکے کہنا شروع کیا۔

" نندہ دیوی لینسڈاؤن میں کہاں سے آگئی ؟" پیٹو نے جھنجھلا کر کہا۔

" اچھا تو کنچن چنگا پر جب سورج نکلتا ہے تو ——— " شبّو نے اسی طرح آنکھیں بند کئے کئے اپنی بات جاری رکھنی چاہی۔

" کنچن چنگا لینس ڈاؤن میں ہے ؟" پیٹو نے ڈانٹ کر پوچھا۔

" اچھا تو امر ناتھ پر ، نہیں نندہ دیوی پر جب ———

" یہ پنکی کون صاحبزادی ہیں ۔ تم ہی دونوں جیسی کوئی چغد ہو گی ——— " ڈوپی نے خلا پڑھتے ہوئے پوچھا۔

" ہو گی کوئی ۔ رشو آپا کی دوست ۔ گلابی سی ناک سبز آنکھیں سُرخ بال ۔ ہر وقت زکام رہتا ہوگا ۔ نام سے تو یہی سب ظاہر ہوتا ہے ——— " پیٹو نے سوچتے ہوئے جواب دیا ۔

" اچھا تو ڈوپی ہمیں لینسڈاؤن تک پہنچا آؤ گے ؟ بہت اچھے سے بھیا ——— " شبّو نے آنکھیں کھول کر پوچھا ۔

" آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اس خاکسار کو آپ جیسی بیوقوف لڑکیوں کو ایسے جنگل بیابان بے تکے قسم کے پہاڑوں پر پہنچانے کے علاوہ دنیا میں اور بھی بہت سے کام ہیں ۔ مثلاً خود نینی تال جانا ۔ لہٰذا آپ اکیلی لینسڈاؤن تشریف لے جائیے ——— " ڈوپی نے جواب دیا اور سیٹی بجاتا باہر چلا گیا ۔

اتوار کی شام کو وہ دونوں لینس ڈاؤن پہنچیں ۔ رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ ہوا کی تیزی میں زیادتی ہوتی جا رہی تھی ۔ پہاڑ کی چوٹی پر سے نشیب کی عمیق تاریکی میں دور نیچے روہیلکھنڈ کے شہروں کی مدھم روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں ہوا بہت سرد تھی ۔ اور بادل چاروں طرف سے امڈتے آ رہے تھے ۔

تارا گڑھ ہاؤس سنسان پڑا تھا ۔ رشو آپا اور ان کے خاندان کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں تھا ۔

گیلری کا دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک شاعر نما انسان برآمد ہوئے ۔

" بیٹیا تشریف لے آئیں ——— " انہوں نے بیحد خوش ہو کر کہا ۔ " خاکسار کا مفتون سندیلوی تخلص ہے ۔ ویسے سب دولہا بھائی کہتے ہیں " تارا گڑھ کا مختارِ عام ہوں ۔ بیگم صاحب کا فون آیا ہے کہ وہ آج نہیں پہنچ سکیں کل صبح آ دیں گی ۔ بیٹیا اندر تشریف لے چلئے " وہ بیحد اہمیت اور مصروفیت کے احساس کے ساتھ کسی انتظام کے سلسلے میں نیچے چلے گئے ۔

" اب کیا ہوگا پیٹو ڈارلنگ ——— ؟ " شبّو نے سہم کر چپکے سے پوچھا ۔

" مری کیوں جا رہی ہو ۔ ایک رات اکیلے نہیں گزار سکتیں ۔ نیچے دو تین گورکھے چوکیدار موجود ہیں ۔ مفتون صاحب ہیں ۔ شاید پنکی وہ جو آ رہی ہے وہ بھی آن پہنچے ۔ " پیٹو نے ڈپٹ کر کہا ۔ لیکن ڈر اسے بھی لگ رہا تھا ۔

" واہ بھئی رشو آپا ۔ اچھی ایکٹیوٹی کی ہمارے ساتھ ——— " شبّو نے کہا ۔ وہ دونوں اندر آتشدان کے پاس جا بیٹھیں ۔ مفتون سندیلوی کھانا منگوانے کے لئے نیچے باورچی خانے کی طرف جا چکے تھے ۔ باہر ہوا کا شور بڑھتا جا رہا تھا ۔ بارش بھی شروع ہو چکی تھی ۔

" اور آؤ اکیلی لینسڈاؤن ۔ بڑا شوق چرا رہا تھا ۔ " پیٹو نے وقت گزارنے کے خیال سے شبّو سے لڑنے کا ارادہ کیا ۔ شبّو پلٹ کر کوئی جواب دینے والی تھی کہ دفعتاً باہر کے طوفان کی گرج لمحہ بھر کے لئے کم ہوئی اور گیلری میں بھاری بوٹوں کی چاپ سنائی دی ۔

" یہ کون ——— ؟ " پیٹو نے خوفزدہ ہو کر چپکے سے کہا ۔ یا اللہ پنکی ہی آ جائے ——— "

" یہ تو کوئی لنگڑا مردوا جھاڑ و پٹیا کھڑا ہے باہر ——— " شبّو نے ڈرتے ڈرتے گیلری میں جھانکنے کے بعد آ کر بتایا ——— " کہیں یہ مفتون صاحب نہ ہوں اور بھیس بدل کر آئے ہوں ۔ مجھے تو یہ شروع ہی سے بہروپیہ لگ رہے تھے ۔

ہوا کے زور سے دروازہ کھل گیا اور وہ شے اندر آ گئی ۔

"یہ پنکی تو نہیں ہو سکتی اتنی لمبی —" شیرو نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

برساتی اور ھے وہ چھ فٹ اونچے ہال کی روشنی میں آئی تو معلوم ہوا کہ وہ پنکی نہیں تھی بلکہ پنکی تھا۔

دونوں لڑکیاں آتشدان کے اور زیادہ قریب کو ہو کر بیٹھ گئیں۔ برساتی فرش پر پھینکنے کے بعد وہ اطمینان سے ایک آرام کرسی پر آکر بیٹھ گیا

"اگر آپ لوگ ڈرپوک گلہریوں کی طرح آتشدان میں اپنی ناک ٹھونسنے کی بجائے اٹھ کر گیلری کا دروازہ بند کر دیں تو زیادہ بہتر ہو۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس تیز ہوا سے مجھے زکام ہو جانے کا احتمال ہے۔" یہ کہہ کر اس نے آرام سے پائپ نکالا اور آگ کی طرف ٹانگیں پھیلا کر آنکھیں بند کر لیں۔

پیلو کا رنگ غصے کی وجہ سے سرخ ہو گیا۔ شیرو کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اس نے کاہلی سے ایک آنکھ کھول کر انہیں دیکھا۔ اور پھر پائپ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔ "آپ دونوں غالباً ہماری دلہن بھابی کی وہ مشہور و معروف چچا زاد بہنیں ہیں۔ جن کا کافی دنوں سے ذکر خیر میں سن رہا ہوں — آپ کی نشو آپا اور ہمارے بھائی صاحب قبلہ دونوں نے اپنے اپنے چغد ہونے کا ثبوت اس طرح بہم پہنچایا ہے۔ کہ انہوں نے مجھے لکھا تھا کہ اپنے سارے کام چھوڑ کر میں اتوار کی شام کو یہاں پہنچ جاؤں — اور خود نہیں آئے۔ مجھے کس قدر تکلیف دی انہوں نے ذرا غور کیجئے۔ بہر حال — چار منگوائیے لڑکیوں کو بیکار نہ بیٹھنا چاہیئے —" اس نے کہا۔

"چاہے تو آپ مر جائینگے تب بھی آپ کے لئے نہیں منگواؤنگی میں —" پیلو نے غصے سے دل میں طے کیا۔

"میرے سوٹ کیس کے اوپر ٹائم ٹیبل پڑا ہے۔ ذرا دیکھ کر بتائیے گا۔ شاید کوئی ٹرین گھر سے اور چلتی ہو اور ان لوگوں کو راستے میں دیر ہو گئی ہو —" اس نے مڑ کر شیرو کو حکم دیا۔

"لیکن پیلو ڈارلنگ مجھے ٹائم ٹیبل دیکھنا نہیں آتا —"

اس نے شیرو کی بات سن لی — "غضب خدا کا۔ حال یہ ہے کہ گریجویٹ ہوا چاہتی ہیں آپ لوگ اور ٹائم ٹیبل نہیں دیکھ سکتیں ایک ہمارے زمانے کی تعلیم تھی — حد ہے بھئی۔ حالت یہ ہے کہ آپ لوگ ہوائی جہاز اڑالیں گی۔ فلسفے کی پروفیسر بن جائینگی۔ لیڈری کریں گی۔ لیکن ٹائم ٹیبل دیکھنا نہیں آتا — دیکھو ایک لڑکی کو نہیں آتا ٹائم ٹیبل دیکھنا" — اس نے بے حد بیزاری کے ساتھ پائپ منہ میں رکھ لیا اور اخبار میں مصروف ہو گیا۔

یا اللہ۔ نشو آپا کی شادی آپ کے بھائی کے ساتھ نہ ہوتی ہوتی تو ہمیں یہ روز بد کا ہیکو دیکھنا پڑتا۔ پیلو نے اٹھ کر دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے سوچا۔

"مہربانی فرما کے مفتون صاحب سے کہیئے کہ کھانا منگوائیں مجھے اپنا ڈنر ہمیشہ نو بجے مل جانا چاہیئے۔ اب نو بجکر دو منٹ ہو چکے ہیں۔" اس نے ایک اور حکم لگایا۔

"کھا جائیے آپ کو رات کو آکر کلایوں کا چیتا —" شیرو نے دعا مانگی — وہ دونوں دوسرے کمرے کی کھڑکی میں جاکر سوچنے لگیں کہ اس کو اس کھڑکی میں سے نیچے کھڈ میں دھکیلنا ممکنات میں داخل ہو سکتا ہے یا نہیں۔

"کیوں بھئی مفتون صاحب وہ کرنل ریکس کا بھوت اس پچھلے کمرے میں رات کو کتنے بجے آیا کرتا ہے — عموماً —؟" اس نے مفتون صاحب سے اس کمرے کی طرف اشارہ کر کے دریافت کیا۔ جس میں ان دونوں نے آکر پناہ لی تھی۔ وہ دونوں ڈر کے پھر نشست کے کمرے میں واپس آگئیں۔

"آئیے صلح کر لیں،" اس نے ہنس کر کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہرگز نہیں۔" پیلو نے بگڑ کر جواب دیا۔

"تو جس وقت میں گیلری میں داخل ہوا ہوں آپ کیوں دعائیں مانگ رہی تھیں کہ کاش پنکی ہی آجائے —؟"

"ہمارے سکول میں ایک لڑکی تھی جس کا نام پنکی تھا ہم اس سے کمروں میں جھاڑو لگوایا کرتے تھے —" شیرو نے

بچوں کی طرح بگڑ کر کہا۔

"ہمارے سکول میں ایک لڑکا تھا۔ اس کا نام شیرو تھا۔ ہم اس سے غسل خانے صاف کروایا کرتے تھے۔" اس نے اسی طرح جواب دیا۔

پیلو کھکھلا کر ہنس پڑی۔

"صلح ۔۔۔؟" اس نے پیلو کو ہنستے دیکھ کر پوچھا۔

"ہرگز نہیں،" پیلو نے شیرو کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

"ہرگز نہیں،" شیرو نے پیلو کی فیصلے سے اتفاق کیا۔ وہ اسی طرح مسکراتا رہا۔

کھانا ختم کرتے ہی وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور سونے کے لئے اوپر کی منزل کی طرف جانے کی غرض سے زینے کی سمت چلا گیا۔

"صبح مجھے ٹھیک چھ بجے چائے مل جانی چاہیئے۔ لیکن چھ بجے سے پہلے مجھے ہرگز نہ جگایا جائے۔ کیونکہ اس سے میری نیند خراب ہونے کا احتمال ہے۔ میرے پاس جو نیکنی کلر مووی کیمرہ ہے اسے میں امریکہ سے لایا ہوں، اسے لیکر میں علی الصبح باہر جاؤنگا۔ ننده دیوی پر جب سورج نکلتا ہے ۔۔۔" مڑ کر اتنا کہتے ہوئے وہ زینہ پر چلا گیا۔

یہ پنکی تھا۔ پنکی اشرف۔ جس کے کردار کا ایک رخ اس نے وہاں دیکھا۔ ہر وقت غل مچانیوالا اور اسے چُہل کرنے والا پنکی جو بے حد سنجیدگی سے اس سے کہتا۔ پیلو بی بی ۔۔۔ کاش میں تمہارا بھائی ہوتا۔ تو بچپن میں خوب مرمت کیا کرتا تمہاری۔ گھر والوں کے لاڈ پیار نے بالکل ہی "تنیا" ڈبو دی ہے تمہاری۔ اگر میں ڈوپی کی جگہ ہوتا تو اچھی طرح پٹیا کرتا تم دونوں کو۔ جاؤ چار بنا کر لاؤ چلو

"پنکی بس تم ہر وقت چہلی ہی کرتے رہتے ہو صب کو۔ ذرا سا نوٹس لینے کے بجائے ۔۔۔" وہ جل بھن کر کہتی۔ "جاکر گڑھیا میں منہ دھو آؤ۔ ڈوپی کی جگہ تم ہوتے تو بس یا تم ہی رہتے گھر میں یا میں۔"

"نوٹس ۔۔۔ اور تمہارا۔ غضب خدا کا۔ پتہ ہے میں کتنا بڑا ہوں تم سب سے۔ تمہاری ننھو آپا سے بھی بڑا۔ بس تمہارے بڑے ابا سے تنگ بھگ ہی ہونگا۔ ہاں ان سے ذرا ہی چھوٹا ہوں۔ میں اور تمہارا نوٹس لوں۔ حد کر دی۔ جب آپ مٹی کھاتی ہوں گی اور پٹتی ہونگی دھبادھب۔ اس وقت یہ خاکسار اوکسفرڈ میں ریسرچ کر رہا تھا معلوم ہے میں کتنا سینیئر آدمی ہوں؟ بس اب میں بھی کل سے تمہارے بڑے ابا والے ایجٹیشن لیکچر شروع کرنے والا ہوں۔ تم سب ابھی قابلِ اصلاح ہو ۔۔۔ امچیور ہو بالکل ۔۔۔ جاؤ چار بنا کر لاؤ۔ اور شیرو سے کہو میرے کوٹ پہ استری کرے فوراً چلو ۔۔۔

پھر وہ سب نینی تال گئے اور وہاں سے کنبے کے باقی افراد کے ساتھ ملکتے اپنے شہر واپس آ گئے۔ پنکی بھی تبدیل ہو کر کچھ عرصے کے لئے وہیں آ گیا تھا۔

یہاں اس نے پنکی کے کردار کا دوسرا رخ دیکھا یہ سول سروس کا بجد گرانبار، سنجیدہ اور سینیئر قسم کا انسان جس کی ذہانت اور قابلیت سے سب بے انتہا مرعوب تھے، اور ڈرتے تھے پنکی اشرف جس کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ وہ ایک دوسرے سے کہتے۔

(۳)

مجھے یہ صاحب بہادر کا بچہ لاٹ صاحب کی دم افلاطون زماں پنکی اشرف ایک آنکھ نہیں بھایا ۔۔۔ چار باغ جنکشن کے پلیٹ فارم پہ مسز فاروقی نے جب تعارف کرایا تو دو تین منٹ باتیں کرنے کے بعد سلین آف ٹرائے دوسری طرف مڑ گئی۔ یہ کلاسیکل معزور، نقوش والی ڈی انا جس نے عمر بھر سیکنڈ کلاس سے آگے سفر نہ کیا تھا۔ اور جس نے اپنے ماں باپ کے گھر کی زندگی کبھی نہ دیکھی تھی۔ پنکی اشرف کے اوکسفرڈ کے لہجے کی گفتگو چند لمحوں تک سنتے رہنے کے بعد پلیٹ فارم پر پھیلے ہوئے ڈھیروں سوٹ کیس، تین چار پورٹ فولز، دو طرح کے بازنچہ اسی اور ایک گواینز بیرے پہ نظر ڈالتی ہوئی اکتاہٹ کے ساتھ ٹہلتی بک اسٹال کی طرف چلی گئی۔ تنگ کر میں اسکے یہاں ٹرانسفر ہو کے آنے کے فوراً بعد ہی شملہ چلی جاتی ہوں۔ چچا میاں کے ہاں تو یہ لازمی طور پہ آیا کرے گا۔ اس نے کلب کی ان لامتناہی شاموں بے ضروری پارٹیوں۔ غیر دلچسپ، چمکدار لڑکیوں کا تصور کیا۔

جو اس کی زندگی کا یہاں لازمی جزو ہو گئی۔ شکر کہ میں اب اس طبقے، اس زندگی میں شامل نہیں — طلعت جمیل کیا تم سچ کہہ رہی ہو — اس نے رک کر اپنے آپ سے پوچھا — کیا تم سچ کہتی ہو کہ تمہیں یہ پنکی اشرف ایک آنکھ نہیں بھایا۔ اور تم اسکے یہاں آنے سے واقعی ناخوش ہو —

اگلے روز وہ فاروق کے ہاں برج پارٹی پہ مدعو تھا۔ مسز فاروق کی برج پارٹیاں عموماً رات بھر جاری رہتی تھیں۔ طلعت مسز فاروق کی لڑکی کے ساتھ مہمانوں کو قہوہ اور چائے سرو کرتے کرتے یا خود کھیلتے کھیلتے اکتا جاتی تو چپکے سے اپنے کمرے میں چلی آتی تھی اور وہاں کوئی کتاب اٹھا کر دیکھتے دیکھتے سو جاتی تھی۔ اس روز سرِ شام ہی سے مہمان آ جمع ہو گئے۔ اس نے ابھی شام کا لباس بھی تبدیل نہیں کیا تھا کہ کئی لڑکیاں عطیہ فاروق کے ساتھ اس کے کمرے میں پہنچ گئیں۔ ارے تم ابھی سے پیکنگ میں جٹ گئیں۔ چلو باہر

"ابھی اور لوگ تو نہیں آئے —؟" اس نے پوچھا۔

"ابھی اور لوگ تو نہیں آئے —؟" اس نے پوچھا۔

ابھی اور تو کوئی نہیں آیا۔ ابّا میاں کے دو تین ملنے والے کسی مقدمے کے سلسلے میں آئے بیٹھے ہیں اور یہ بحث کرنے میں مصروف ہیں کہ مصرا صاحب سیتاپور کے ڈپٹی کمشنر جو ہیں اُن کی بیوی رونالڈ بارکر آئی پی کے ساتھ ولایت کیوں بھاگ گئی مینڈسن کے ساتھ کیوں نہیں بھاگیں۔ جو اتنے موٹے نہیں تھے۔ بچارے۔" عطیہ فاروق نے بتایا۔

"اور پنکی اشرف صاحب سخت بلبلا رہے ہیں کہ ان کے مصرا صاحب کو کیوں اس طرح موضوعِ گفتگو بنایا جا رہا ہے —"

دوسری لڑکی نے اطلاع دی۔ جب کہ وہ ہاؤس کوٹ پہنے پہنے ہی گیلری تک پہنچ چکی تھی۔ پہلو کے برآمدے میں اسکے سامنے پنکی موجود تھا۔ جو بہت اکتاہٹ کے ساتھ چائے کی میز کے قریب بیٹھا کسی اخبار کے ورق الٹ رہا تھا۔ عطیہ فاروق اور اسکے ساتھ کی دونوں لڑکیاں کسی دوسرے کمرے میں جا چکی تھیں۔

"آئیے تشریف لائیے۔" طلعت کو دیکھ کر اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے تعظیماً کھڑے ہو کر بجد متانت اور سنجیدگی سے کہا۔

وہ بے نیازی سے جا کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئی "چائے بنا دوں آپ کیلئے" اس نے پوچھا۔

"یقیناً —" اس نے جواب دیا۔ اور نظریں بچا کے ذرا غور سے اسے دیکھتا رہا۔

"کیسا لگا آپ کو ہمارا شہر —" طلعت نے اخلاقاً دریافت کیا۔

"بہت نفیس —" اس نے اسی اخلاق سے جواب دیا "آپ برج کھیل رہی ہیں آج رات ہمارے ساتھ —" تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا۔

"جی نہیں —" طلعت نے جواب دیا۔

"نہیں —؟ واللہ بالکل یہی رات بائرن کی روح نے مجھ سے کہا تھا۔ کہ آپ کے اس بے انتہا سپربیا انداز کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ سے اسی قسم کے جواب کی توقع رکھنی چاہیئے۔ یعنی برج کے متعلق۔ واللہ بھائی بائرن نے یہی کہا تھا —" اس نے بڑی سنجیدہ آواز میں کہا۔

"کیا فرمایا آپ نے —؟" طلعت نے ذرا سٹپٹا کر کہا۔

"جی لارڈ بائرن کی روح نے فرمایا تھا۔ جارج گورڈن، لارڈ بائرن — کل رات ہم لوگ پیلو سعید کے ہاں روحیں بلا رہے تھے تو اس وقت میں نے بائرن سے آپ کے متعلق تھوڑی سی گفتگو کی تھی یعنی آپ کے برج کھیلنے یا نہ کھیلنے کے متعلق —"

"تقریباً پہلی ہی ملاقات میں بائرن کے متعلق باتیں کرنا معاف کیجئے گا ذرا بیڈ فورم ہے —" طلعت نے سنبھل کر ذرا سنجیدگی سے جواب دینے کی کوشش کی۔

وہ مسکرا کر دوبارہ اسے غور سے دیکھتا رہا — "اور بیڈ فورم میں آپ کے یہاں اور کیا کیا داخل ہے —؟ شام کے چھ بجے ہاؤس کوٹ میں باہر آ کر چائے بنانا سربجا عمدہ ترین فورم ہے شاید —" وہ اسی طرح ہنس کر بولا۔

طلعت نے جھینپ کر اپنے ہاؤس کوٹ پر نظر ڈالی اور

دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"یہ تو بائرن صاحب نے بھی بتایا تھا مجھے کہ —" اس نے بات پھر شروع کی۔

"ارے بھئی۔ میں اسلئے کھیل میں شامل نہیں ہو سکتی۔ کہ مجھے پیکنگ کرنی ہے۔"

"رات بھر پیکنگ کیجئے گا —؟"

"میں شملے جا رہی ہوں کل صبح۔"

"اُفوہ — غور کرنے کا مقام ہے کہ کس قدر زبردست واقعہ ہے یہ —"

"کیا —؟"

"کہ آپ شملے جا رہی ہیں۔ اپنے نئے عہدے پر فائز ہو کے — اُفوہ واقعی —"

"طلعت بٹیا ذرا ٹائم ٹیبل دیکھ کر بتانا تمہاری ٹرین کل کے بجے چھٹتی ہے۔ یہ بھائی سرتوآستو بھی کل تمہارے ساتھ ہی جا رہے ہیں —" سر فاروق نے اپنی اسٹڈی کے دروازے پر آکر آواز دی۔

"بہت اچھا چچا میاں —" وہ گیلری کی طرف بڑھی۔

"ار — کیا آپ کو ٹائم ٹیبل دیکھنا بھی آتا ہے —؟" پنکی نے ذرا پریشان ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں — کیوں —؟" اس نے تعجب سے سوال کیا۔

"قیامت ہو گئی۔ بس اب تو قربِ قیامت میں کلام نہیں آپ وہ پہلی خاتون ہیں جن سے مجھے نیاز حاصل ہوا ہے۔ جو ٹائم ٹیبل بھی دیکھ سکتی ہیں — خدا مجھ پر رحم کرے —"

"لارڈ بائرن نے آپ کو اسکے متعلق مطلع نہیں کیا تھا —؟" طلعت نے آہستہ سے پوچھا اور اندر چلی گئی۔

"خدا مجھ پر رحم کرے۔" پنکی نے کچھ دیر بعد دوبارہ اپنے آپ سے کہا۔ اور اٹھ کر ٹہلتا ہوا دوسرے مہمانوں کی طرف چلا گیا۔

کھانے کے وقت جب سب اپنی اپنی پلیٹیں ہاتھ میں لے کر اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ تو گھومتی پھرتی عطیہ فاروق اسکے قریب آئی۔ "پنکی بھائی کھانا کھاؤ —" اس نے کہا

"طلعت کہاں گئیں —؟" پنکی نے پوچھا۔

"طلعت آپا اندر ممی کا ہاتھ بٹا رہی ہیں۔ رو ملا — ٹھہرو میں آتی ہوں —" وہ دوڑتی ہوئی دوسرے مجمع میں جا ملی۔ اسی وقت ایک ڈش اٹھائے طلعت اسکے قریب سے گزری —

"ارے بھائی طلعت —" پنکی نے برآمدے کے ستون کے پاس سے آواز دی۔

وہ ٹھٹھک گئی — "آپ مجھے طلعت کیوں کہہ رہے ہیں۔ مِس جمیل کہئے —"

"میں قطعی آپ کو طلعت کہونگا۔ طلعت۔ طلعت۔ طلعت بلکہ مستقبل قریب میں تو میرا ارادہ آپکو طلعت ڈارلنگ کہنے کا بھی ہے — دیکھئے آپ کیا کر لیجئے گا! فی الحال تو آپ جا کر اپنی پیکنگ کیجئے — جائیے —"

وہ تیزی سے دوسری طرف چلی گئی۔

یہ زندگی کا اچانک پن۔ اور ہر چیز لڑکھڑاتی ہے اور ہر چیز مختلف ہے اور دنیا ہمارے اوپر زیادہ تیزی سے آ گرتی ہے اور یہاں اتنی دیوانگی ہے کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔

وہ ٹہلتا ہوا لکڑی کے پل پر سے اتر کے سفیدے کے جھرمٹ میں آ گیا۔ اور اس نے ایک پتہ توڑ کر دیکھا اور اسکے چاروں طرف بڑے بڑے گلاب کھلے تھے۔ راستے کے اختتام پر بیگو سعید کے گھر میں سے پیانو کی مدھم آواز بلند ہو رہی تھی اور چند لڑکیاں پل پر سے گزرتی کسی دوسری کوٹھی کی طرف جا رہی تھیں۔ "دیکھا تم نے۔ یہ ہے بالکل نٹن۔ شوٹن۔ فش۔ ٹاپ" اسے دیکھ کر انہوں نے ایک دوسرے سے کہا اور آگے چلی گئیں۔

جھیل کے راستے پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس نے پیچھے مڑ کر اپنے ماضی کے ویرانے کو دیکھا۔ جہاں سنسان ہوائیں چل رہی تھیں۔ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں کیا کر رہا ہوں۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

جھیل کے پار۔ آرسنی کی خانقاہ کے گھنٹے بجنے شروع ہو گئے

شام کو کلب میں اسے او میشوری سپرو ملی۔ وہ اسکے قریب بیٹھی چند نغمے ریکارڈ بجا رہی تھی۔

میں ذرا اس وقت ٹینسی ہو گیا ہوں۔ لیکن کوئی ہرج نہیں اس او میشوری سپرو ہی سے باتیں کی جائیں کم از کم ورنہ وہ یقیناً بُرا مان جائے گی۔ اس نے سوچا ——

"آپ کافی سے زیادہ حسین ہیں مِس سپرو —" اس نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا۔

"اور آپ کافی سے زیادہ دیوانے ہیں مسٹر پنکی اشرف۔" او میشوری سپرو نے شگفتگی سے جواب دیا۔

"ظاہر ہے۔ جب ہی تو آپ سے ملاقات کا فخر حاصل کر رہا ہوں"، اس نے کوشش کر کے اسی شگفتگی سے کہا۔

پھر وہ اسکے ساتھ ناچ کیلئے دوسری طرف چلا گیا۔

"یہ پنکی اشرف ایک مصیبت ہے۔ دن بھر سوتا ہے۔ رات بھر برج کھیلتا ہے۔ یا چھٹیوں کے روز صبح سے اپنی اسٹڈی میں بند ہو کر Picasso کے آرٹ اور فرنچ سر رلیسٹوں کا مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ مصیبت ہے بالکل۔" کلبوں میں خواتین ایک دوسرے سے کہتیں۔

یہ سب جگہیں ایک سی تھیں۔ یہ سارے لوگ ایک طرح کے تھے دو سو سال پرانے اینگلو انڈیا کی یہ زندگی کتنے مطمئن انداز سے گزرتی آ رہی تھی۔ کوک ٹیل پارٹیاں۔ ٹی ڈانس۔ بونفے ڈنرز۔ بمبئی کا یاٹ کلب کلکتے کا گریٹ ایسٹرن۔ لکھنؤ کی چھتر منزل۔ دلی کا روشن آرا۔ یہ سارے شہر ایک سے تھے۔ وہی ایک سا طبقہ۔ جو آبادی سے دور سول لائنز میں رہتا۔ سب کی ویک سی کوٹھیاں۔ ایک سے باغ۔ ایک سی ذہنیتیں اور خیالات اور اس اینگلو انڈیا کے یہ سارے مشہور اور خاص اسٹیشن۔ پونا، جھانسی، آگرہ۔ لکھنؤ۔ کانپور الہ آباد۔ پھر ان لوگوں کے ہل اسٹیشن۔ بنگال کا دارجلنگ۔ یوپی کا نینی تال اور مسوری۔ شمال مغرب کا کشمیر۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ وہ قیامت تک اسی طرح اپنے ان پرانے کلبوں میں جمع ہو کر برج اور بلیرڈ کھیلتے رہیں گے جہاں کے باغوں میں غدر کی یادگار توپیں سجی تھیں۔ یہ آئی سی ایس۔ پی سی ایس اور آئی پی کے پرانے عہدیدار، ہائیکورٹوں کے جج اور انڈین آرمی کے سُرخ سُرخ مونچھوں والے کرنل اور ان کی بیویاں اور بیٹیاں۔ جو صبح کے وقت ناشتے سے فارغ ہو کر اپنی نٹنگ سنبھال کر اور کتوں کو ساتھ لے کر، سول لائنز کی شفاف، سایہ دار ٹھنڈی سڑکیں عبور کر کے ایک دوسرے کی کوٹھیوں کے برآمدوں میں جمع ہو کر لنچ کے وقت تک انتہائی بیکار قسم کی سوشل گفتگو میں مصروف رہتی تھیں۔ اور پھر کلب کے چیرٹی بازار کے لئے پروگرام بناتی تھیں اور جاڑوں میں ہاتھیوں پر بیٹھ کر ریاستوں کے راجکماروں اور راجکماریوں اور انگریز حکام کے ساتھ شاردا ندی کے پار جا کر شیر کا شکار کیا جاتا تھا۔

لیکن طلعت جمیل —— اس نے اپنے آپ سے کہا — تم بھی تو اسی اینگلو انڈیا، اسی پرانے طبقے کی پیداوار ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ تمہارا پی سی ایس باپ تمہاری پیدائش کے دوسرے سال ہی مر گیا اور تم خس کی ٹٹیوں میں چھپی ہوئی ایسی کوٹھی میں نہ پل بڑھ سکیں جہاں شام کو لان پر پنکھے کے نیچے ضلع کے حکام اور ان کی بیویاں جمع ہو کر انتہائی غیر ضروری باتیں کرتے اور ٹینس کھیلتے۔ بڑا افسوس ہے کہ تمہاری ماں بھی تمہیں بچپن ہی میں داغِ مفارقت دے گئی۔ اور تم نے اس ماحول اور اس زندگی کی روح میں سمانے کے بجائے اپنی اتنی عمر فاروق چچا کے گھر کے ایک کمرے میں محض اقتصادیات پڑھنے میں ہی گزار دی۔ طلعت جمیل تم اپنے طبقے کے ساتھ جس کی تم پروردہ ہو، بہت زیادتی کر رہی ہو۔ کیا تمہاری روح بھی قرونِ وسطیٰ کے سورماؤں کی طرح زرہ بکتر پہن کر ایڈونچرز کی تلاش میں آگے نکلنا چاہتی ہے —— ؟

ہاں۔ میں ضرور آگے جاؤں گی اور دیکھوں گی کہ وہاں کیا ہے وہاں جہاں پہ تاریکی روشنی ہے، غلطیاں صحیح ثابت ہوتی ہیں۔ اور زندگی خواب اندر خواب ہے طلعت جمیل —— اس نے اپنے آپ سے دوبارہ پوچھا —— کیا تم اسے بھونا چاہتی ہو۔ جس نے تم کو طلعت، طلعت، طلعت، کہہ کر پکارا تھا —— ؟

تمہیں دراصل تصورات کا "ایڈیفائیڈ" ہوگیا ہے۔ طلعت جمیل آخر میں اس نے خود کو جواب دیا اور ٹرین کے کمپارٹمنٹ کی کھڑکی پر سر گرا کے سو گئی۔

جنگ ختم ہو چکی تھی، لیکن جنگ کا پرندہ کائنات کی بیکراں تاریکی کے اوپر مریخ کی مدھم سرخ، گرم روشنی میں آہستہ آہستہ پرواز کرتا جا رہا تھا اور یہاں پر صرف چلتے ہوئے وقت کی آواز تھی جو اس طرف جا رہا تھا۔ جہاں بہار نہیں تھی۔ زندگی نہیں تھی۔ جہاں کسی سوال کا جواب نہیں ملتا تھا۔

وہ جو ینگی اشرف کہلاتا تھا، اس نے ٹھٹھک کر اس بھاگتے ہوئے وقت کے کنارے کو چھونے کی کوشش کی۔ آخر وہ تھک کے اٹھ کھڑا ہوا۔ خدا حافظ اومیشیدری میں پیرو — اس نے اپنے آپ سے کہا اور وہاں واپس جانے کے لئے تیار ہوا۔ جہاں مرکزی حکومت کی اعلیٰ پالیسیز بنانے کا غیر دلچسپ اور بیحد اہم کام اسکے سپرد تھا وہاں بھی وہ دن بھر سوتا اور رات بھر برج کھیلتا رہا۔

ایک کہرآلود صبح ایک ایرپورٹ کے نیلگوں دھندلکے میں وہ اسے دوبارہ نظر آئی۔ وہ اپنے اسٹاف کے ساتھ مشرق وسطیٰ اور مغربی یورپ کا دورہ کرکے واپس آ رہی تھی۔ اور ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کا فضائی جہاز اسے دوبارہ مشرقی جزیروں کی طرف لیجانے کیلئے شیڈ کے نیچے سکون سے کھڑا تھا

کہرآلود اور سنسان رن وے پر وہ ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

"دیکھو وہ ہوائی جہاز پیدل چل رہا ہے —" دوسرے رن وے پر سے گزرتے ہوئے ایک جہاز کو دیکھ کر اس نے بچوں کی طرح کہا۔

ینگی نے ایک لمحے کے لئے اسکے چہرے کو غور سے دیکھا۔

"اس قدر فلسفیوں کی سی شکل کیوں بنا رکھی ہے آپ نے جناب — ریلیکی —!" طلعت نے اسکے بچپن کا نام کا گویا

مذاق اڑاتے ہوئے ہنسکر پوچھا۔ "آؤ تمہیں اپنا ڈیکوٹا دکھاؤں۔" وہ [illegible] اسکے پیچھے کھڑے ہوئے جہاز کے قریب جا کر سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی۔ "گھر پر سب لوگ کیسے ہیں۔ عطیہ۔ چچا میاں۔ اور سارے [illegible] تمہارے بیگم سعید۔ اومیشیدری میں پیرو وغیرہ وغیرہ —؟" وہ بشاشت سے باتیں کرتی رہی۔ "میں نے عطیہ کو بہت دنوں سے خط نہیں لکھا۔ وہ بیحد خفا ہوگی۔ اور چچا میاں بھی پریشان ہونگے۔ انہیں میں نیپلز سے ایک پکچر پوسٹ کارڈ بھیج سکی تھی صرف — میں دراصل بیحد مصروف ہوں —!" اس نے پھر ہنس کر اسے دیکھا۔ وہ خاموش بیٹھا پائپ پیتا رہا۔ "اب کے جب تم گھر جاؤ اور عطیہ سے ملو تو اس سے کہہ دینا کہ میں بہت سخت بیمار ہوں۔ دراصل اسلئے اسے خط نہ لکھ سکی — اس سے کہہ دینا کہ مجھے — وہ ہوگیا ہے۔ وہ کیا ہوتا ہے۔ اینٹی [illegible] !! کیا —؟" پائپ کی راکھ جھٹکتے ہوئے اس نے ذرا ٹھہر کر پوچھا۔

"اینڈی سائیٹس بھی — اور تھوڑا سا مینن جائیٹس بھی — اور برین کا ٹیٹس کا بھی احتمال ہے — اور ساتھ ساتھ نیو [illegible] کا ذکر بھی کر دینا تو کوئی مضائقہ نہیں —" اس نے شگفتگی سے کہا۔ اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے معلوم ہوتا ہے تمہیں بہت بشاش کر رکھا ہے۔" وہ جل بھن کر بولا۔

وہ یک لخت خاموش ہوگئی اور دھندلکے کو غور سے دیکھنے لگی۔ "آؤ ٹہلیں —" تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔

وہ رن وے پر چلتے رہے۔ روشنی کے نیلگوں مینار ان کے چاروں طرف فضا میں لرز رہے تھے۔

میں تمہارا ہاتھ تھامے ہوں۔ میں تمہارے دکھ میں مبتلا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ اس راستے پر چل رہی ہوں جس پر صبح کی شبنم جھلملا رہی ہے اور خنک گھاس پر سے کہرے کا دھواں اٹھ رہا ہے۔

"موسیو ینگی — کیا تم سمجھتے ہو کہ اتنی دنیا گھوم کر آنے کے بعد میں بہت خوش ہوں —؟" کچھ دیر بعد اس نے ٹھٹھک کر سوال کیا۔

وہ خاموش رہا۔

"مجھے وہ نیلی آنکھوں والا خوبصورت یونانی یاد ہے۔" وہ آہستہ آہستہ کہتی رہی۔ "جسے وہ پکڑ کر لائے تھے۔ اسے انہوں نے چوکولیٹ کھانے کو دی اور دیر تک اس کا مذاق اڑاتے رہے۔ گراموفون پر نغمہ گونج رہا تھا "کم بیک ٹو سورینٹو" — وہ اطالین گراموفون بجاتے رہے اور جب وہ تنگ آ کر اس شغل سے تھک گئے تو اسے ایک درخت کے نیچے لے جا کر کھڑا کیا اور بندوق چلا دی وہ وہیں گر کر ختم ہو گیا — اس روز انہوں نے اس درخت کے نیچے دس نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو نشانہ بنایا تھا وہ سیب کا درخت تھا اور اس پر سفید شگوفے کھل رہے تھے۔" وہ خاموش ہو گئی۔

دھندلکے کے پیچھے سے آفتاب طلوع ہوتا جا رہا تھا۔

"وہاں ایک ترچھی، معصوم آنکھوں اور چمپئی رنگت والا انڈونیشین تھا۔ وہ بری طرح زخمی ہو چکا تھا جب اسے ریڈ کراس کے خیمے میں لایا گیا اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھ سے آہستہ سے کہا تھا۔ مجھے پرانے عہد نامے میں سے تئیسواں سام پڑھ کر سنائیے۔ تئیسواں سام — پھر وہ بھی مر گیا تھا۔ ان سب کو اسی طرح مارا جاتا ہے۔ وہ اسی طرح مرتے ہیں تئیسویں سام کے بجائے،" وہ کہتی رہی۔ "وہ شرقی سمندر کے جزیرے تھے۔ جہاں رقص پیدا ہوا تھا جہاں بالی کی رقاصائیں اپنی بھویں گہرے سبز رنگ سے رنگ کر پنکھوں کے ساتھ ناچتی تھیں اور درختوں کے نیچے منڈولین بجائی جاتی تھی —"

وہ خاموشی سے چلتے چلتے ایئرپورٹ کی عمارت کے نزدیک آ گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ وہاں سے چلی گئی۔

شعلے سے شعلے کی طرف، جزیرے سے جزیرے کی طرف، جگنوؤں کی میڈونا مریم جو آگ میں رہی۔ مجھے دنیا کے راستوں پر یاد رکھنا۔

کیا وہ بیت لحم کی طرف جا رہے ہیں؟ فضا میں بلند ہوتے ہوئے طیارے کو دیکھ کر اس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور پھر وہ ایئرپورٹ سے واپس آ گیا۔

جنگ اور موت کا پرندہ دیس کے اندھیرے شہروں پر نیچے نیچے منڈلا رہا تھا۔ مریخ کی سرخ روشنی زیادہ تیز ہو گئی۔ وہ زمانہ آیا جب وہ اپنے گھر، اپنے کھنڈر، اپنے کھیت چھوڑ کر [illegible] دوسری طرف چلے گئے۔ اپنے کھیت چھوڑ کر، جہاں وہ شہر سے زیادہ کیا تھا بھوک بوتے، جوتتے اور کاٹتے تھے۔ اجنبی دیس کے کھیتوں میں اسی طرح بھوک بونے، جوتنے اور کاٹنے کیلئے وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔

اس سرخ اندھیارے میں، اپنی داکس آل پر بیٹھ کر اور اپنے پوڈلز کو ساتھ لیکر وہ بھی دوسرے دیس کی طرف روانہ ہوا، جہاں پہنچ کر اسے ایک اور بہت اہم عہدہ سنبھالنا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن دفعتاً راستے کا موڑ اس کے سامنے آ گیا۔ وہ اس راستے پر نہ جا سکتا تھا جدھر وہ گئی تھی۔ خزاں کے بہت سرخ چاند کے نیچے چپ چاپ اس نے اپنا سفر جاری رکھا۔

سرخ اندھیارا گہرا ہوتا گیا۔ عظیم خاموشی آہستہ آہستہ گہری ہوتی نیچے اتر رہی تھی۔ یہ حیات کی تخلیق کی پہلی اور آخری رات تھی۔ خلا کے اندھیرے میں وہ بے مقصد چاروں طرف گھومتا رہا۔

یہ میں۔ جو میں ہوں۔ خاموشیوں کی دیبی نے آہستہ سے کہا۔ تم جس راستے پر چلو گے بالآخر مجھ تک پہنچو گے۔ جس راگ کو سنو گے اس میں میری آواز ہو گی۔ جس خوشبو کو محسوس کرو گے اس میں میری مہک پاؤ گے۔ پھولوں کے جو رنگ دیکھو گے ان میں میری جھلک موجود ہو گی۔ میں پاروتی ہوں۔ میں استی ہوں۔ میں یشودھرا ہوں۔ میں تمہارے وجود کا سایہ ہوں۔ سایہ جو کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔ جو ہمیشہ آگے آگے چلتا ہے لیکن مل نہیں سکتا۔ اور مستقبل کی صدیوں کے اندھیرے میں کھو جاتا ہے۔

بیکراں تاریکی میں وہ گھومتا رہا۔ جہاں اس کے مختلف وجود اندھی راہوں پر چکر کاٹ رہے تھے۔

کیا تم اس سائے تک پہنچنا چاہتے ہو —؟ اس کے ایک وجود نے دوسرے وجود سے سوال کیا۔

ہاں۔ دوسرے وجود نے جواب دیا۔

کیا تمہیں دوسرے سایوں تک پہنچنے کا اتنا ہی شوق نہ تھا —؟ بیلو سعیدہ — عطیہ فاروق — اوشا رانی سپرد — ان سب کو یاد کرو۔

وہ تو دفع الوقتی تھی۔ یہ بالکل دوسری چیز ہے بھائی رے۔ اس کے دوسرے وجود نے بچوں کی طرح جھنجھلا کر جواب دیا۔

کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ بھی تمہارا تصور نہیں۔ ایک اور الوژن محض ایک اور لڑکی — جسے اتفاق سے ٹائم ٹیبل دیکھنا بھی آتا ہے۔

نہیں — نہیں — دوسرے وجود نے قطعی طور پر بگڑ کر کہا۔

کیسی باتیں کرتے ہو میاں۔ یہ بالکل دوسری چیز ہے ۔ غوزہ۔
سناٹا اس کے چاروں طرف اور گرجا رہا۔ یہاں کوئی خاتمہ نہیں۔ کوئی خاتمہ نہیں۔

تخلیق کی ڈولتی ہوئی رات کے ساتھ وہ بہت دور نکل آیا تھا خدا حافظ خوابوں کے شہر۔ خدا حافظ خوابوں کے انسانو۔ اس نے پیچھے مڑ کر چپکے سے کہا۔ جدھر۔ دور بیکراں تاریکی میں اسمی کے گھنٹے آہستہ آہستہ بج رہے تھے۔

ہم روتے ہوئے گھر جاتے ہیں۔ لیکن گھر کے دروازے بند ہو چکے ہیں ہم مرنے کے لئے واپس آجاتے ہیں۔ اور مر جاتے ہیں۔ اور مرتے رہتے ہیں۔

اور اولیں پیدائش کی اندھیری، ڈولتی رات کے کنارے، فصیل پر پہنچ کر اپنی کالی آنکھیں جھپکا کر ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنے آپ کو اور خدا کو معاف کر دیا۔ اسمی کے گھنٹے بجتے رہے۔

اور ایک روز وہ خون کے دریاؤں اور موت کی دلدلوں پر سے گذرتی اپنے دیس کو واپس آئی۔ اور اس نے دیکھا کہ دیس سنسان پڑا تھا۔ طوفان، اور آگ، اور موت کی ضیافتوں کے بعد اب وہاں مکمل سناٹا تھا۔

وہ پورب دیس کی ان سایہ دار سڑکوں پر سے گذری جہاں آموں کے جھرمٹ میں برکھا کے دنوں میں پپیہا بولتا تھا اور لڑکیاں ڈھولک پر اپنے صدیوں پرانے اور محبوب گیت گاتی تھیں۔ آم بورا۔ آل پاکی۔ چہرہ چھپکے آدھی رات۔ گھڑیاں نیند نہ آوے، ہو ریلوا کی سان رہو ریلوا کی سان۔

رات کی بیکراں تاریکی میں دور کوئی دھیرے دھیرے اب بھی گا رہا تھا۔

شیام بنسی بجنا ڈولا ڈ۔ گوری کے لاگے بیڑیا۔ شیام منڈ پنکھا آہستہ آہستہ جھولو، کیونکہ گوری کو ہوا بری لگتی ہے۔ وہ اٹھ بیٹھی اور آنکھیں بند کئے سنتی رہی۔ وہ مانوس آوازیں دور ہوتی گئیں۔ سنارا جھونا، پیاں تورے لاگوں میرے پینے گھنگرو دے لگائے۔ گوری کے لاگے بیڑیا۔ سنار کے بیٹے میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں میرے پنکھے میں گھنگرو لگا دو۔ گوری کو ہوا اچھی نہیں لگتی۔

وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ لیکن وہاں کوئی آوازیں نہیں تھیں۔ وہاں پر صرف خاموشی تھی، اپنے قصبوں اور گاؤں کے پر محبوب گیت مر چکے تھے۔ دلہنوں کے دوپٹوں کی بیسر کی لڑیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ اب برکھا کی راتوں میں، جب اونچی اٹریوں اور تالاب کے کناروں پر پپیہا بولے گا۔ وہ آنگن کی منڈیروں پر بیٹھ کر اپنی سہیلیوں سے ہو ریلوا کی سان کا شکوہ کبھی نہ کر سکیں گی۔ ہو ریلوا ورلڈ ہیلتھ اور گنائیزیشن کے باوجود پیدا ہونے سے پہلے ہی مار ڈالا گیا تھا۔ وہ مر رہے تھے۔ یا دیس بدر ہو رہے تھے۔ اور ان کے کھیتوں اور گلیوں میں بھوت چل رہے تھے۔

وہ اپنے شہر کی چپ چاپ سڑکوں پر چلتی رہی۔ وہ اسمی کی خانقاہ کے قبرستان کے قریب سے گذری۔ جہاں مرمریں قبروں پر مرمریں فرشتے بیحد تکلف اور شائستگی سے پر جھکائے کھڑے تھے یا دوزانو بیٹھے ہوئے اچک کر آسمان کو دیکھ رہے تھے۔ سفیدے کے جھنڈ کے کنارے کنارے کوٹھیوں کی قطاریں گہرے میں رینگ رہی تھیں،

وہ اپنے گھر کے دروازے میں داخل ہوئی۔

دروازے پر کون دستک دے رہا ہے۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ رات کی مملکت میں سے نکل کر آنے والی روحو۔ تم کون ہو ———؟

ہم وہ فرشتے ہیں جو ہمیشہ تمہارے پاس آنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن تم ہمیں لوٹا دیتی ہو۔

تم کون ہو۔ پھر اندھیرے میں اس نے اسے پہچانا جو بہت دور سے اس کے پاس واپس آیا تھا۔ تم میرے وجود میں شامل نہیں ہو۔ تم مجھ سے علیحدہ، دور کھڑے ہو۔ اس کہر آلود راستہ کے کنارے تم ایک بار آہستہ آہستہ گنگنا رہے تھے۔ انیس جمیع

ہیں رعنائی و ہ دل کھدے پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے، نہ رہے - اس وقت میں راستے پر تمہارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی لیکن دفعتاً دوراہا میرے سامنے آگیا تھا۔ اب ہم پھر تنہا ہیں۔ اور ابھی ہوائیں چلیں گی اور ان تنہائیوں کو بکھیر کر آگے چلی جائیں گی۔ اور میں چپکے سے پوچھوں گی۔ تم کہاں گئے ـــ موت کے وسیع احاطے میں سے جس کے چاروں طرف تار کھینچے ہیں وہ سب آہستہ آہستہ گذر رہے ہیں۔ وہ ٹھٹک کر رک جاتے ہیں اور آسمان کو دیکھنے لگتے ہیں۔ اور اپنی صلیبیں اٹھا کر پھر چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ تم نے اس انسان کو پہچانا جو ہمارے سامنے ان تاروں پر لٹک رہا ہے - اور اس کے گلابی ہونٹوں پر (جن کو کلبوں میں خواتین بڑے تعجب اور غور سے دیکھا کرتی تھیں) عنقریب چیونٹے چڑھنے والے ہیں۔ آؤ ہم اس پر ہنسیں - اس کی قسمت پر۔ اس دنیا اور اس زمانے پر جس نے اسے اس لئے پیدا کیا کہ یہ اس طرح مارا جائے اور کیڑے اس پر چلیں۔ آؤ ہم اس پر ہنسیں۔ ہم کتنے بیہودہ ہیں۔ کہ موت پر ہنستے ہیں۔ پھر ہم کیا کہیں ـــ؟ تم اس کے رثے سرئیلیسٹ انداز کی ایک تصویر بناؤ چنگی اشرف۔ میں اس پر ایک مرثیہ لکھوں گی۔

تم نے اس خوبصورت لڑکی کو دیکھا۔ جو سامنے سے جا رہی ہے۔ جب یہ مرے گی تو وہی سب ہو گا جو ہمیشہ ہوتا ہے۔ اس کے دماغ میں مکڑی جالے لگائے گی اور چیونٹے اس کے دل میں ناچیں گے لیکن اس وقت وہ پل پر سے گذرتی کلب کی طرف جا رہی ہے۔ اور بہت خوش ہے۔ سو فو کلز۔ سو فو کلز۔ اور اس نے کہا۔

ہاں، ہم بہت برے زمانے میں ملے ہیں۔ اور اسمبلی کے گھنٹے ہمارے پیچھے بجتے جا رہے ہیں۔ ہماری زندگی کو چوہے کتر رہے ہیں اور ہمارا خدا پہاڑوں پر پیدا ہونے سے پہلے ہی مر چکا ہے۔ اور اس کی تجہیز و تکفین سے فراغت پا کر میں تمہارے پاس آئی ہوں۔

تم نے غلطی کی ہے۔ جب یہ سفید [illegible] اپنے بلوں کو واپس بھاگ جائیں ـــ تب تم بھی بوڑھی ہو چکی ہو گی۔ اسی طرح مرنے کا انتظار کرو جیسے اور سب مرتے ہیں۔ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ کیونکہ یہ سب جگہیں ایک سی ہیں۔

ہاں ـــ اس نے کہا۔ لیکن ان راستوں پر چلتے چلتے تو میں بہت دور آ گئی ہوں بھائی۔ میں نے وحشت پسندوں کی مجلسوں میں ان کی باتیں سنیں۔ میں نے ٹیل کوٹ پہننے والے دیوتاؤں کے ساتھ سیمبا کیا۔ مجھے POUSSIN کے چیلوں نے اپنی لکیروں میں مقید کیا جبکہ میرے پیچھے پہاڑ تھے۔ میرے وجود کے ٹکڑے مختلف رنگوں، اور اسٹائیلوں میں منتشر کئے گئے۔ اور زندگی اسی طرح گذرتی چلی گئی۔ سب مجھے انہوں نے محض ایک سمبل سمجھا۔ ایک حزنیہ۔ ایک نظریہ ـــ وہ رک گئی ـــ تم نے میرا وہ پنک کوٹ دیکھا ہے جو میں نے طہران میں ایک غریب پولش پناہ گزین کاؤنٹس سے دو ہزار طومان میں خریدا تھا ـــ زندہ ہماری شخصیتوں کے غرور تو دیکھو ـــ؟

کیسی مدہم روشنی پھیل رہی ہے۔ وہاں نیلگوں پیٹرول اسٹیشن ہیں اور عسلی نور کی جھنیاں جو اندھیرے میں غم اور رنگینی معلوم ہوتی ہیں۔ اور کیسی کلوروفارم کی ایسی نیند ہمارے دماغ پر سرسراتی ہے۔ اور بھیگے چوراہوں پر اونچی، طویل، دو منزلہ بسیں پُراسرار طریقے سے آکر رکتی ہیں۔ اور آگے جاتی ہیں۔ اور اس منڈلاتے ہوئے زرد اجالے کے پس منظر میں تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر وہ سنسان قصبے ہیں جہاں بوڑھے تعلقدار اپنے سلیم شاہی جوتوں میں چھپے روتے ہیں، ہنٹنگ، شوٹنگ، فشنگ، کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ اور کلبوں میں غدر کے وقتوں کی یادگار توپوں کی جگہ پر مشین گنیں رکھی ہیں۔ اور جرمن اور روسی بیلے کا مطالعہ کرنے کے بجائے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بم بنانے کی فکر میں مصروف ہیں۔ اور معزز میزبان خاتون چاندی کے چمچے اٹھا کر شکر گھولتے ہوئے سوچتی ہے میں اس طرح کب تک جیوں گی۔ آرٹ گیلریوں میں تصویریں اونگھتی جاتی ہیں۔ اور پہاڑوں پر [illegible] بالآخر پیدا ہو رہا ہے۔ اس کے استقبال کے لئے وہ اسمبلی کے گھنٹے بجا رہے ہیں۔ موسم کی خنکی کھیتوں

اور اصطبلوں پر منڈلا رہی ہے۔ یروشلم — یروشلم —
خدا حافظ خوابوں کے شہر۔ شب خوابوں کے افسانو
وہ راستے پر چلتا رہا۔ کیسی مدہم روشنی چاروں پھیل رہی
تھی جو دن اور رات کے کسی سمے بھی پیدا نہ ہوتی تھی۔ اور بھورے
اور سرمئی اور گلابی مکان سبزے پر خاموش اور پر ہیبت کھڑے
تھے۔

یہ انسانوں کے رہنے کے مکان نہیں تھے اور یہاں روح چپ
چاپ چاروں طرف گھومتی تھی۔ اور گہرے سبز آسمان پر بادل
کے ریلے زناٹے سے بہہ رہے تھے۔ ڈرجن میری کے گلابی،
نیلگوں بادل۔ اس وقت وہ اگر کسی بھوت کو سچ مچ دیکھ لیتا
تو اسے ذرا حیرت نہ ہوتی۔ اس وقت اگر لوردز کی مریم
تھوبانی کے جھنڈ میں چھپے ہوئے اپنے گروٹو پر سے اتر کر سڑک
پر پیدل چلتی ہوئی اس کے قریب آ کر اس سے اپنا تعارف کراتی
کہ میں طلعت جمیل ہوں۔ تو اسے قطعی تعجب نہ ہوتا۔
استی کے گھنٹے دفعتاً تیزی سے بجنا شروع ہو گئے کیونکہ
یہ کرسمس کی رات تھی۔

خدا حافظ خوابوں کے شہر۔ اس نے چپکے سے دہرایا۔
شیام تم بن جیا ڈولا ڈولے — گوری کے لاگے بیریا — اس نے
آہستے سے کہا۔ اندھیرا ان کے چاروں طرف بہت گہرا ہو گیا۔

(۴)

وہ جمعیہ سعید تھی اس نے اجنبی دیس پہنچ کر چاروں کھونٹ
نظر ڈالی۔ حسب معمول وہاں وہ سب دوبارہ اکٹھے ہو گئے تھے۔
وہاں عطیہ خاتون تھی۔ ڈوپی تھا۔ شیرو تھی۔ لشٹو آپا۔ چچا رحمٰن،
اس کا سارا کنبہ۔ سارے دوست۔ وہاں پنکی اشرف بھی آ چکا تھا
چھٹیوں کی صبحیں وہ سب یاٹ کلب میں گزارتے۔ رات کو نئے
ریکارڈوں پر ناچتے۔
پنکی چھٹیوں کے روز حسب معمول دن بھر سوتا رات بھر برج
کھیلتا۔
پنکی تم شادی کب کرو گے بھئی — ؟ وہ اس سے پوچھتے۔

کیا وہ — آئے گی؟
ہاں — وہ ایک روز ضرور آئے گی — وہ غیر یقینی طور پر
اپنے آپ سے کہتا۔
بالآخر وہ ایک روز آ گئی۔
عطیہ نے پھولے ہوئے سانس سے پنکی کو فون کیا — پنکی بھیا۔
طلعت آ گئی۔ ابھی اس نے ایر پورٹ سے فون کیا ہے۔
سب نے بیحد ایکسائیٹمنٹ کے ساتھ ایک دوسرے
کو یہ خبر سنائی اور خوش خوش پنکی کو مبارکباد دینے کیلئے ٹیلیفون
کی طرف دوڑے۔
ہیلو ڈارلنگ تم نے پنکی کو فون نہیں کیا — ؟ وہ دوسرے سرے
پر وہ بیحد معلوم ہوتا ہے — ڈوپی نے بشاشت کے ساتھ اس سے
پوچھا۔
یہ خاتمہ ہے — یہ خاتمہ ہے — اس نے چپکے سے اپنے آپ سے
کہا اور بڑی فرحت کے ساتھ برآمدے میں آ گئی جہاں سب جمع تھے۔
انہوں نے سرد لحمت خانے میں سے پانی کی بوتلیں نکالیں اور
سمندر کے رخ آ بیٹھے۔ اور اندھیرا پڑے تک پنکی کی باتیں کرتے
رہے۔ وہ سب بیحد خوش تھے۔
یہ خاتمہ ہے۔ یہ خاتمہ ہے۔ پنکو نے اپنے آپ سے دہرایا۔
خوش آمدید طلعت جمیل۔ انہوں نے اس سے کہا۔ یہ وہ
زمین ہے جس کا یہوواہ نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ اور تم بالآخر اپنی
صدیوں کے بعد یہاں پہنچ گئی ہو۔ اب ہم تمہیں واپس نہ جانے
دیں گے۔ خوش آمدید۔
وہ جو خون کے دریا اور موت کی دلدلیں، اور تاروں پر لٹکتے
ہوئے انسان اور درختوں سے لٹکتی ہوئی لڑکیاں دیکھ کر آ رہی تھی اس
نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ ایر پورٹ کے سبزے پر شبنم کے قطرے
جگمگا رہے تھے اور نیلا پرچم آسمان کی بلندیوں میں لہرا رہا تھا۔
یہاں کتنی چہل پہل اور رونق تھی۔ اس نے تعجب سے دیکھا۔
آؤ ہم تم کو یہاں کی سیر کرائیں — عطیہ نے بچوں کی
طرح اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ یہاں کے ہل اسٹیشن۔ یہاں کی رقص

گاہیں۔ دیکھو اتنے سے عرصے میں ہم نے کتنی ترقی کر لی ہے۔

وہ یہ سب دیکھتی رہی۔

کتنی خوشی کی بات ہے طلعت ڈارلنگ کہ قوم کی حیاتِ نو کے بعد سے رقص گاہوں کا مجمع پہلے سے کئی گنا زیادہ ہو گیا ہے۔ اور حلقت کی ہر فیشن ایبل بیٹی کے لئے رقص سیکھنا۔ بال پرم کروانا۔ اور غرارے پہننا لازمی سا ہو گیا ہے۔ اسے بتایا گیا ہے دیکھو یہ بین الاقوامی جلسے ہو رہے ہیں۔ ڈیموکریٹک جلسے۔ یوتھ کانفرنسیں کلچرل ہنگامے۔ باہر کے وفد آ کر ان چیزوں کی کتنی تعریفیں کرتے ہیں۔ بیحد رعب پڑتا ہے ان پر۔ یہ الف لیلے کی ہالی ووڈ ورژن ایسی زندگی کس قدر طربناک ہے۔ کل ہمارے یہاں ایک فرانسیسی آیا تھا۔ اور ایک امریکن اور اس کی بیوی۔ تینوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے جب انہوں نے ہمارے اسٹریم لائنڈ ڈرائنگ روم اور میرے سکڑے پائنچوں کے پاجامے کو دیکھا جسے یہاں غرارہ کہتے ہیں۔ کس قدر کیوٹ اور رومینٹک، کس قدر گریس فل۔ انہوں نے تعجب سے کہا۔ دراصل ہم لوگ اب تک یہی سمجھتے تھے کہ آپ سب جھونپڑوں اور کچی مٹی کے مکانوں میں رہتے ہیں اور موٹے موٹے ویل پہنتے ہیں۔ انہوں نے بعد میں ذرا شرما کے اعتراف کیا۔

تیرگی اسے بتا رہی تھی،

آہ ایران کی راتیں۔ بغداد کی راتیں۔ قاہرہ کی راتیں، پنکی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے وہ بیحد رومینٹک انداز میں آنکھیں بند کر کے ان جگہوں کو یاد کرتے رہتے۔ وہ چپ چاپ بیٹھی سنتی رہتی۔ کاش ان جگہوں کو تم نے دن کی روشنی میں بھی دیکھنے کی کوشش کی ہوتی، امریکن، انگریزی اور فرانسیسی ہوٹلوں اور سفارت خانوں کی جگمگاہٹ سے باہر نکل کر کاش تم ان جگہوں کے گلی کوچوں میں بھی جاتے طہران، بغداد اور مشہد کے گلی کوچوں میں — وہاں کتنی غلاظت ہے۔ کتنی جہالت ہے۔ کتنی بے حسی اور پستی ہے۔ تم جو مشرق وسطیٰ کا اتنا رومینٹک انداز میں ذکر کرتے ہو تم ان الٹرا فیشن ایبل خاتونوں کے نیوی لک کے فراکوں کے علاوہ ان کی روحوں کا اندازہ لگانے کی کوشش بھی کرتے جنہوں نے اپنے معاشرے اور اپنی سیاسیات کے ساتھ ساتھ

اپنے ذہن و دماغ بھی امریکہ کے پاس رہن رکھ دیے ہیں — تم — تم۔ لوگ کتنے گدھے ہو۔ اسے ہنسی آ جاتی۔

وہ اکتاہٹ کے ساتھ بیٹھی قہوہ پیتی رہی پنکی کے دوست حسبِ معمول زور و شور سے بحثوں میں مصروف رہے۔ ان میں سے ایک صاحب ملک کی نئی اسکیموں کے فائیلوں کے انباروں میں اضافہ کرنے کے محکمے کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ مختلف قسم کی اسکیمیں۔ کلچر، دیگری کلچر، ہورٹی کلچر۔ فنونِ لطیفہ۔ تعمیرات۔ الہیات۔ مصنوعات۔ ادبیات۔ کیفیات۔ بلیات۔

گھنٹوں یہ بحثیں جاری رہتیں۔ اور قہوے کے بے شمار فنجان اور ووڈکا کی بوتلیں خالی ہوتی رہتیں

ایلس ان ونڈر لینڈ والے گرائیفن کے Porpoise کی طرح جس نے ایلس سے بگڑ کر پوچھا تھا کہ بھلا کوئی شریف عقلمند مچھلی کسی Porpoise کے بغیر کہیں جاتی ہے، یہ ان کا Porpoise تھا،

دن بھر ریڈیو میں قوالی ہوتی رہی۔

"کیا بوریت ہے بھئی" اس نے ایک جمائی لے کر بالآخر کہا۔

"بوریت — چپکی بیٹھی سنتی رہو۔ یہ قومی موسیقی ہے" کلچر کے نگرانِ اعلیٰ نے ڈپٹ کر جواب دیا۔

وہ اکتا کر ریڈیو گرام کے پاس جا بیٹھی اور ریکورڈز کی چھانٹ میں مصروف ہو گئی۔ پنکی کے دوست صاحب پیچھے سے اچک کر ان ریکارڈوں کو دیکھنے لگے۔

"یہ کیا — مارو — درگا — غضب خدا کا۔ مومنہ ہو کر تم درگا سننے کا ارادہ رکھتی ہو جس کے نام ہی سے کفر ٹپکتا ہے —" انہوں نے پک اپ پر سے وہ ریکارڈ ہٹا دیئے۔

"اچھا ڈکوس ہی لگا لو۔" اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"ہرگز نہیں" — وہ ڈپٹ کر بولے "میاں کی ملہار البتہ سن سکتی ہو —" وہ ریڈیو گرام کے قریب آ بیٹھے۔

ریڈیو میں رات کے نو بجے بھیرویں گائی گئی صبح دس بجے سوہنی ہوئی۔ بارہ بجے سے پھر قوالیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا

"دراصل اب ہم مشرق وسطیٰ ایک مشن بھیج رہے ہیں — نگران اعلیٰ صاحب نے اسے بیحد سنجیدگی اور اہمیت کے ساتھ بتایا — "وہاں سے موسیقی امپورٹ کی جائے گی۔ یہ موسیقی جو اب تک ہم سنتے سناتے رہے ہیں، ساری کی ساری خالص غیر ملکی تھی۔ ہماری روح اور ہمارے وجدان سے اس کا کہیں دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ یہ ہمارے اوپر امپوز کی گئی تھی۔ اور بہت سی چیزوں کی طرح ——"

"لیکن بھائی صاحب" اس نے آہستہ سے جواب دیا "مشرق وسطیٰ کے پاس تو اپنی موسیقی کوئی ہے ہی نہیں۔ تھوڑی بہت عربی اور مصری موسیقی کے علاوہ ساری کی ساری یورپ کی سستی موسیقی کی انتہائی بھدی نقالی ہے۔ اور مغربی کلاسیکل موسیقی کو سمجھنا یا پسند کرنا ان کے یا ہمارے آپ کے کسی کی بھی بس کی بات نہیں۔ آپ کون سی موسیقی امپورٹ کیجئے گا؟"

"غلط ہے" — وہ گرج کر بولے — "تمہارے خیالات انتہائی غلط ہیں۔ ہر بات میں مخالفت ہر بات پر اعتراض" — وہ روٹھ کر دوسرے صوفے پر جا بیٹھے — "تمہیں معلوم ہونا چاہیئے طلعت بیگم کہ زندگی کے ہر شعبے میں یہ ایکس پورٹ و امپورٹ کا سلسلہ ہماری مادی و روحانی و تمدنی ترقی کا واحد ذریعہ ہے۔ کلچرل اور انٹلکچوئل ترقی کے سلسلے میں ہم امریکہ سے کیپٹن مارول اور سپر وکٹیسٹرن کومکس اور جین آٹل کے فلم منگواتے ہیں — وہاں ہم اپنی خواتین کے گریس فل غرارے کلچرل نمائش کے طور پر بھیج رہے ہیں — ووگ کے تازہ پرچے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ وہ پیرس اور نیویارک کے لباس خانوں میں غراروں کی تقلید میں اس وضع کے ایوننگ فراک تیار کئے جا رہے۔" انہوں نے اسے مطلع کیا۔

اس رات اس نے ایک عجیب و غریب سا اور بیحد مضحکہ خیز خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ بیس سال کے بعد اس سرزمین کو واپس آئی ہے۔ اور جب وہ بندرگاہ پر اترتی ہے تو اسے کوئی آدم یا آدم زاد دکھائی نہیں دیتا۔ ہر سمت ہُو کا عالم ہے۔ سڑکیں سنسان ہیں۔ دوکانیں ہیں کوئی کاروبار نہیں نظر آتا۔ بس ہر طرف ان گنت بچے جوشیلے نعرے لگاتے لکڑی کے گھوڑوں اور تلواروں سے کھیل رہے ہیں۔ شہر کا یہ منظر دیکھ کر قرون وسطیٰ کے قصبوں کا دھندلا سا تصور اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ وہ بیحد تعجب کے ساتھ ایک سڑک پر چل رہی ہے اتنے میں اسے ایک جانا پہچانا سا انسان نظر آتا ہے۔ وہ اسے غور سے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی بہت لمبی داڑھی ہے۔ سبز عمامہ۔ اور ہاتھ میں کاغذات کا پلندہ۔ یہ پکی اشرف ہے جو ترقی کر کے اس دوران میں قاضی القضاۃ بن چکا ہے جو شہر کو توال بھی ہے اور اس وقت شہر کا چکر لگانے کے لئے نکلا ہے۔ دو حبشی غلام اس کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ ہو لیتی ہے۔ شہر کے دیسی حصے سے باہر نکل کر دفعتاً ایک بیحد خوبصورت صاف شفاف اور شاداب مقام اسے نظر آتا ہے۔ جہاں خوبصورت عمارتیں اور کوٹھیوں کی قطاریں ہیں اور ہر چہار سمت پھیلے گولف گراؤنڈ ریکارڈ اور نفیس موٹریں کھڑی ہیں۔ اس آبادی کے گرد ایک اونچی سی چہار دیواری کھنچی ہے جس کے سامنے بھی پھاٹک کے پاس کھڑے ہیں اور داروغہ جگالی کر رہے ہیں اور سڑک پر دونوں طرف بیشمار دُبلے پتلے، رنگ برنگے انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ یا داڑھیوں میں انگلیاں پھیر رہے ہیں یا حقہ پیتے پیتے آسمان کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ سب کون بیچارے ہیں اور وہ سول لائینز جیسی آبادی کس کی ہے —— وہ حیرت سے پوچھتی ہے۔

پکی اشرف بیحد پُراسرار طریقے سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتا ہے۔ "انہیں بیچارے نہ کہو۔ یہ سب غازی ہیں۔ ہم سب غازی ہیں۔ ہم نے اپنا سارا دنیاوی کاروبار امریکنوں کو ٹھیکے پر دے دیا ہے جو اس سامنے والی سول لائینز میں رہتے ہیں۔ ہم نے اپنی حکومت بھی انہیں ٹھیکے پر دے دی ہے۔ اب ہم اطمینان سے اور فرصت سے بیٹھے ہیں۔ امریکن ہماری طرف سے حکومت کا انتظام کرتے ہیں۔ اور ہم غازیوں کو فرصت مل گئی ہے تاکہ اور زیادہ غازی پیدا کر سکیں۔"

پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اور اسے اپنے خواب پر بیحد ہنسی آئی۔ اور اپنا یہ خواب بیگم کو سنا کر وہ دیر تک شگفتگی کے ساتھ کھلکھلا کر ہنستی رہی۔ وہ یہاں آگئی ہے۔ اور بیگم آج کل بہت خوش ہے۔ اور عنقریب ان کی شادی ہونے والی ہے۔ کلبوں میں لوگ ایک دوسرے کو بتا رہے تھے۔

———

آئینے کھڑے ہیں۔ اور چاندی کے برُش۔ اور وہ شیلف جس پر انجنسکی رقصاں ہے۔ اور طویل گیلریوں کے پرے سمندر گرجتا ہے۔ جہاں باٹ ہیں۔ اور ڈونگے۔ اور ساحل کا بوٹ کلب۔ یہ سب چپ چاپ کھڑے ہیں۔ سمندر گرجتا ہیں۔ نجنسکی۔ یہ سب اندھیرے میں جگ رہے ہیں۔ اور منتظر ہیں۔ اور انتظار میں ان کا خاتمہ ہے۔ اور یسوع کی روح ایسی راتوں میں پانیوں پر چلتی ہے اب مجھے جانا چاہیے صبح ہو رہی ہے۔ آؤ ہم لوٹ چلیں چھوٹی چھوٹی عورتیں ایسی راتوں میں ہاتھوں میں پنکھیاں لے کر اپنے باغوں میں گھومتی ہیں اور چھوٹے چھوٹے انسانوں سے محبتیں کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ تھک کر خدا کی روح کا پانی کی سطح پر خاتمہ ہو جاتا ہے۔ خاتمہ اور تکان (تمہارے لئے اور کو کو بناؤں — ؟)

انتظار کرو۔ اس نے سوچا۔ اور شدید تکان کے اس شدید حسن کو پہچانو۔ رات گذر رہی ہے اور نیند آتی ہے۔ بغیر نیند کی نیند۔ ان خواب دیکھنے والوں کی نیند جو Nothingness کے خواب دیکھتے ہیں۔ میں ضرور لوٹ کر آؤں گی۔ میرا انتظار کرنا۔

شہر اپنی جگہ پر چپ چاپ موجود تھا۔ سمندر سرخ چاند کی مدہم شعاعوں میں جھلملا رہا تھا۔ اور قبرستانوں کے باسی ابدیت کی نیند سے تھوڑا سا جاگ کر خاموشی سے اوپر کی آوازیں سن رہے تھے۔ اور ان کے دماغ شاید بے بسی سے کچھ سوچنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن چونکہ وہ مر چکے تھے اس لئے قبرستانوں میں بھی ویسی ہی خاموشی طاری رہی۔

آسمان جیسے گہرے نیلے روغن سے رنگا گیا تھا، اور سرخ گیلنکل پھولوں کی قطاریں جن کے پیڑ اونچے تھے، اور سڑکوں کی دیواریں جن پر اندھیرے میں روشنی کی لکیریں رات بھر تصویریں بناتی رہتی تھیں، یہ سب اپنی جگہ پر موجود تھیں۔

اس کا طیارہ فضا میں بلند ہوا۔ رات کی سطح پر وہ اوپر اٹھتے گئے۔ آسمان کی شدید وسعت نے ان کی نظریں زخمی کر دیں۔ ان کی روحیں منجمد تھیں۔ صرف ان کے دل دھڑک رہے تھے اور کنفیوشس ان کے ہاتھ موجود تھے۔ شمال مغرب کے برفانی میدانِ جنگ پر اپنی امداد پہنچاتے وہ دوبارہ مشرق کی طرف مڑ گئے۔

وہ اپنے ہمالیہ کے پرانے گھر واپس پہنچ گئی۔ اس نے دریچے میں کھڑے ہو کر ان نیلی فضاؤں کی سمت دیکھا جدھر سے وہ جا کر لوٹ آئی تھی۔ وہ دریچے میں جھک کر باہر دیکھنے لگی جہاں آلوچے کے زرد شگوفے کھل رہے تھے۔

چنانچہ طلعت جمیل۔ تم بالآخر واپس آگئیں۔ اس نے اپنے آپ سے آہستہ سے کہا۔ اور اس کے ہونٹوں پر تبسم بکھر گیا۔ چنانچہ اب تم دار السلطنت کی ٹی پارٹیوں میں بیگم اشرف بن کر مسکراؤ گی نہ بین الاقوامی کلچرل کانفرنسوں میں شمولیت نہ کر سکوں گی۔ انتہائی غیر ضروری ڈنرز میں غیر ملکی سفیروں سے انتہائی غیر ضروری باتیں نہ کرو گی۔ پریس والوں کے کیمرے تمہارے چاروں طرف کلک کلک نہ کریں گے تقسیم انعام اور اسپورٹس کے جلسوں میں انتہائی سرپرستانہ انداز میں چاندی کے کپ اٹھا کر جیتنے والے نوجوانوں کو دینے کے بعد بیحد سپر پر طریقے سے ان سے ہاتھ نہ ملاؤں گی — تم کتنی، قسمت اور بیوقوف ہو طلعت جمیل جو تم نے ان سب چیزوں کی دلکشی کو محسوس نہ کیا — اور واپس آگئیں۔

ہمالیہ اپنی جگہ پر اپنی عظمت اور اپنی ہیبت کے ساتھ ہمیشہ کی طرح سربلند اور اٹل کھڑا تھا۔ اس کی وادیوں اور اس کی چوٹیوں پر پھیلی ہوئی اس زندگی پر انہوں نے کبھی غور نہ کیا تھا، وہ جو ڈیڑھ سو سال سے موسمِ گرما میں وہاں جنگل میں منگل لگانے کے لئے آتے رہتے تھے۔ ان نیلگوں جنگلوں اور عظیم الشان پہاڑوں، خطرناک دروں اور خوبصورت وادیوں میں رینگتی ہوئی زندگی کو انہوں نے کبھی قابلِ اعتبار نہیں سمجھا ہمالیہ کے بیٹے محض ان کی رکشائیں کھینچتے تھے، اور ان کے سامان ڈھو کر بلند ترین چوٹیوں تک لیجاتے تھے۔ ان کے بلیک اینڈ وائٹ سگریٹ اور روپے چراتے تھے۔ اور جاڑوں میں جب وہ اپنے نیپال دیس یا گڑھوال واپس جاتے تھے تو فاقے سے مرتے تھے یا ٹیٹری کا جاڑا انہیں اٹا دیکا کر پڑتا تھا۔

اسی طرح وہ جیتے رہے۔ اور مرتے رہے۔ اور اسی طرح ان پہاڑوں پر یہ اندر سبھائیں سجتی رہیں۔ جھیل کی دھندلی کشتیاں۔

فلیٹس کے مناظر۔ بہر موپول کے ناچ۔ کوٹھیلے کے بھاری کنڈے۔
ایک فوا ڈم کے ذریعے پیشانی سے باندھے وہ علی الصبح دھند اور دھ....
سڑکوں پر بیچنے کے لئے چلاتے پھرتے تھے۔ لیکن اودھے شنکر نے
وہاں پہنچ کر محض ایک رقص کدہ قائم کر دیا تھا۔ یہاں سے گنگا اور
جمنا آتی تھیں۔ یہاں سے شاردا اور گومتی اور گھاگرا نکلتی تھیں۔
یہاں سے کائنات کی تخلیق ہوئی تھی۔

دریچے میں کھڑی وہ باہر دیکھتی رہی۔ یہی وہ جینی تال تھا جس
کے بوٹ کلب کے پھاٹک پر ایوارٹ گریس ، ہم مذنگ "ہندوستانیوں
اور کتوں کا داخلہ منع ہے" اور ان یورپین بچوں کا داخلہ بھی ممنوع ہے
جن کے ساتھ ہندوستانی نوکر ہوں" کا بورڈ لگا تھا۔ یہ سات تال تھا۔
یہ بھیم تال تھا۔ یہ جینی تال تھا۔ جہاں بھگوان شیو کی مہارانی ستی کی آنکھیں
گری تھیں۔ جہاں بھگوان شیو نے تخریب و تخلیق کا رقص کیا تھا جہاں
سے دنیا کی تکمیل کی گئی تھی،

وہ دریچے میں کھڑی رہی جھیل پر روشنیاں رقص کرنے لگی تھیں
اور نیچے، آلوچوں کے جھرمٹ میں وہ نغمے بجا رہی تھے۔

پتوں اور شگوفوں میں سے بھیگے ہوئے دھوئیں کی طرح آواز
آہستہ آہستہ بلند ہوتی گئی۔

اس نے نغمے کو پہچاننے کی کوشش کی۔ اور یاد آیا۔ یہ کون
سی راگنی کون سی لئے تھی — وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ اس نے
پہچانا۔ اسے دفعتاً یاد آیا۔

— موسیقی بہت قریب اٹھتی ہے۔ قریب تر۔ اس میں کیسا
جوش ہے۔ کیسی تیزی ہے۔ کتنا درد ہے۔ پھر رات کے سناٹے میں
یہ لے دور ہوتی جاتی ہے۔ دور ہوتی جاتی ہے۔ دفعتاً پھر نزدیک آتی
ہے۔ بہت سی آوازیں اکٹھی اٹھتی ہیں۔ کشتی دور ہو رہی ہے۔ اور
دور — اور دور — اس کی نرم روی۔ اس کا سکون۔ یہ زندگی
کا خاتمہ ہے۔ دنیا کا خاتمہ ہے۔ سنگیت پھر نزدیک آتی ہے۔ وہی
درد ہے۔ وہی کرب ہے۔ وائلن گھہر کر اوپر اٹھتے جا رہے ہیں۔
گٹار اور چپوؤں کی ملی جلی آوازیں پھر دور ہوتی جاتی ہیں یک لخت

گٹار تیز ہو جاتا ہے، اور پھر رفتہ رفتہ اس کی لے ڈوبتی جا رہی ہے اسی
نرم روی کے ساتھ۔ اسی سکون کے ساتھ۔ ایک اکیلی آواز بلند ہو رہی
ہے۔ یہ حیات کا نغمہ ہے۔ کاسکوں کا گیت ہے۔ والگا کی روح کی
آواز ہے۔ وہ دور ہوتے جاتے ہیں۔ اور دور۔ ان کی آوازوں میں
وہ تیزی، وہ ولولہ باقی ہے۔ وائلن کے سر رفتہ رفتہ پھر قریب آتے
جا رہے ہیں۔ قریب تر۔ وہی زندگی ہے۔ وہی روانی۔ وہی درد۔
یک لخت زندگی جاگتی ہے۔ روشنی جاگتی ہے۔ یہ کائنات کی نئے سرے
سے تخلیق ہو رہی ہے۔ پچھلے چھ دنوں میں خدائے قدوس نے اسی
سنگیت کی لہروں پر دنیا کی تکمیل کی تھی۔ یہ اس عظیم دنیا کی لہریں ہیں۔
آؤ۔ ہم اس کی روشنی میں آگے چلیں۔ یہاں پر سکون ہے۔ امن ہے سکون ہے
اور امید۔ نور۔ طاقت۔ والگا — والگا — ہم ایک روز تیری
طرف پہنچیں گے۔ اپنے مینڈولین کے تاروں کو بجائے جاؤ میرے
بہت پیارے ملاحو۔ تم خدا کے اپنے بیٹے ہو۔ تم مقصدِ حیات کے اصلی
وارث ہو۔ کاسکوں کی آوازیں رفتہ رفتہ دور ہوتی جاتی ہیں۔ ہم
ایک جھٹکے کے ساتھ پھر اپنی دکھی دنیا میں واپس آجاتے ہیں۔

میرے پیارے خوش نصیب دنیا کے اولین حقیقی ولازلی انسانو
تم پر خدا کی رحمت ہو۔

وہ دریچے میں جھکی رہی ہے۔ آلوچے کے زرد شگوفے موسیقی
کے ساتھ ساتھ دھندلکے میں چھپ گئے۔

پھر اپنی جوتیوں پر چلتے ہوئے اس نے دیکھا کہ عالم موجودات کا یہ
اجتماعی لاشعور زندگی کے دیرانے پر بھٹکتا پھر رہا ہے۔ انسانوں کی یہ جھکی
ہوئی قطاریں اس نے دیکھیں۔ یہ انسان جو پگڈنڈی پر جا رہا ہے۔ جو
دھان کے کھیت میں کھڑا ہے۔ جو درخت کاٹ رہا ہے۔ اور اس کے
پیچھے وہ سارے زمانے گھسٹتے آرہے ہیں۔ سنہرے زمانے۔ سیاہ
زمانے۔

لیکن ٹھہرو۔ اس نقرئی سرورق کو دیکھو جسے چغتائی نے
بنایا ہے۔

اس کے مختلف صدیوں کے مختلف وجودوں کا جلوس اس
کے پیچھے پیچھے چلتا آرہا تھا۔ یہاں کوئی خاتمہ نہیں۔ رنج باقی ہیں محنت

باقی ہے پچھتاوے باقی ہیں۔

وہ دنیا کے آخری سمندر، آخری طوفانوں کے قریب آئی۔ جہاں سناٹے مسکرا رہے تھے۔ ان سناٹوں میں آوازیں تھیں آندھیوں کی۔ اور چٹانوں پر لہروں کے ٹکرانے کی۔ وہ ان کے نزدیک آئی۔ اور اس نے عناصر کی اس گرج دار گفتگو کو سنا۔ جو زمان و مکاں کی زبان حال تھی۔ لیکن یہ سب اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ بہت کم کم وہ اُسے پہچان سکی۔ ہر چہار سو گھٹن سے امنڈتی آ رہی تھی۔ اور اس کے سامنے عناصر کی سلطنتیں پھیلتی جا رہی تھیں۔ ان آوازوں اور اس زبان کے مقابلے میں اسے اپنی آواز اور اپنی زبان بہت ہی عجیب مضحکہ خیز اور قابلِ رحم معلوم ہوئی۔ یہاں خدا اور کائنات کا انجام تھا،

لیکن ان قیامت خیز آندھیوں اور خطرناک سمندروں کے کناروں پر اس نے دیکھا کہ سفید پھول کھل رہے تھے، ٹھنڈے اور پُرسکون۔ ان سفید پھولوں میں اس نے اپنا چہرہ چھپا دیا اور شبنم کی نمی کو چھوا۔

آخرکار۔

آخرکار۔

آخرکار۔

---

(۵)

وہ چلا گیا۔ سنا تم نے۔ طلعت جمیل کے واپس جانے کے بعد وہ بھی یہاں سے چلا گیا۔ مغرب کے سات سمندروں اور برفیلے پہاڑوں کے اوپر سے پرواز کرتا ہوا وہ اُدھر گیا ہے جہاں ایمبیسی کے مغرور دیوانوں میں اس کے لئے ضیافتیں ہوتی ہیں اور وہ بے نہایت اخلاق کے ساتھ شاہ بلوط کے آتشدانوں کے قریب کھڑا ووڈکا پیتا رہتا ہے۔ اسے اسی ضروری کام کے لئے وہاں بھیجا گیا ہے۔ ڈ

ڈیڈلی کہہ رہا تھا۔

پیلو بہت تھکے ہوئے قدم رکھتی اگر دیوان پر گر گئی۔ یہاں خاتمہ نہیں ہے یہاں خاتمہ نہیں ہے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ سنج باقی ہیں۔ دُکھ باقی ہیں پچھتاوے باقی ہیں۔ پھر اس کے آنکھیں بند کر لیں، ہم نندہ دیوی کبھی نہیں پہنچ سکتے۔

بیچارہ جو۔ اس نے بچوں کی طرح کہا۔ بیچارہ جو۔ کوئی کہانی سناؤ۔ فن لینڈ کی کہانی۔ جہاں تم نے رات کا سورج دیکھا تھا۔ اور اونچی، برفانی وسعتیں —

بیچارہ جو تکیوں کا سہارا لے کر پلنگ پر اٹھ بیٹھے — پیلو بیٹا — انہوں نے آہستہ آہستہ کہا۔ تم کاہے کے لئے رنجیدہ ہو۔ میں ساری عمر جھوٹ بولتا رہا۔ اپنے آپ کو خوش رکھنے اور دوسروں کو خوش کرنے کے لئے۔ تاکہ آخر ہی سمے مجھے اطمینان ہو کہ میری باتوں کی وجہ سے دوسروں نے کم از کم چند لمحے مسرت سے بتائے۔ میں نے دنیا کے دور دراز خطوں کے متعلق کہانیاں سوچیں۔ عجیب عجیب چیزیں جمع کر کے اُن کے لئے لطیفے گھڑے۔ جبکہ میں خود کبھی اپنے ملک کے ساحل سے آگے نہ جا سکا تھا، میں دنیا میں اپنے لئے اور دوسروں کے لئے کچھ نہ کر سکا۔ لیکن کم از کم میری وجہ سے تم سب کو ہنسی تو آجاتی تھی — کسی نے ایک دفعہ مجھے ایک واقعہ سنایا تھا۔ کہ کسی سرسبز خطے میں سے ایک ٹرین گزر رہی تھی، کسی وجہ سے وہ ایک جگہ پر چند منٹ کے لئے ٹھہر گئی۔ دفعتاً اس میں سے ایک آدمی اترا اور اپنا اٹیچی کیس سنبھال کر ایک طرف کو روانہ ہو گیا جدھر نیلگوں پہاڑ اور ہرے مرغزار تھے۔ لیکن وہاں کوئی اور خاص بات نہ تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ مجھے مت روکو۔ مجھے جنم جنم سے اس جگہ پہنچنے کا انتظار رہا ہے۔ اور آج مجھے وہ جگہ نظر آ گئی ہے۔ اور میں اس کی طرف جا رہا ہوں۔ وہ چلا گیا۔ اور ٹرین اسے وہیں چھوڑ کر آگے روانہ ہو گئی۔ ہم سب اس طرح نندہ دیوی پہنچ جائیں گے۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ہم سب نندہ دیوی پہنچیں گے۔

وہ ختم ہو چکے۔

ہاں۔ ہم سب نندہ دیوی پہنچیں گے۔ پیلو نے چپکے سے دہرایا۔

وہ اس سرزمین لوٹ آئی۔ جسے وہ سب چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

"جن ڈھونڈا تن پائیاں گہرے پانی پیٹھ ۔ میں بپرا ڈوبت ڈری رہی کنارے بیٹھ" اُس نے اپنے آپ

سے کہا۔

اب خزاں بھی واپس جارہی ہے۔ اور جھیل کے پودے کنارے تک پھیل آئے ہیں۔ وہ سحر زدہ محل میں بیٹھی ہے۔ اور سرخ پتے اس کے چاروں طرف اڑ رہے ہیں اور سفیدے کا جنگل چپ چاپ کھڑا ہے۔ اور سفید پوش راہب چاندی کی موم بتیاں اٹھائے سایوں کی طرح لکڑی کے پل پر سے گزر رہے ہیں۔

اسمپشن کے گھنٹے اپنی متوازن یکسانیت کے ساتھ بجتے جارہے ہیں۔ اور سبز بانس کے جھنڈ پر اندھیرا گہرا آرہا ہے۔

خداوند ہمارے بزرگوں کے خدا، جو ہمیشہ سے تھا، اب ہے، اور ہمیشہ رہیگا۔

خداوند ہمارا خدائے مطلق جو ابدالآباد تک جیتا اور سلطنت کرتا ہے۔

خوبانی کے جھنڈ میں نوٹرے ڈیم کی مریم کے گرد ٹوٹے آگئے جھکے وہ کہہ رہے ہیں۔ اے سینٹ این کی بیٹی ہم پر رحم کر۔

خدا جس نے ازل میں تجھے اپنی دلہن منتخب کیا جس کے ذریعے آسمان زمین اور سمندر تخلیق کئے گئے، جیسے اس گناہ اور جرم سے محفوظ رکھا گیا جو زوال آدم کا باعث ہوئی۔ اے یعقوب کے نئے ستارے، فرشتوں کی ملکہ، اور انسانوں کی ماں جیسے خدا نے اپنی ماں منتخب کیا، جس نے آسمانوں پر ایک روشنی پیدا کی اور زمین پر کہرہ پھیلایا۔ تاکہ ہم تیرے ذریعے بادشاہ تک پہنچ سکیں۔ ایلیلیاہ۔

اسمپشن کے گھنٹوں کی گونج فضا میں منڈلاتی پھیلتی اور ڈوبتی جارہی ہے۔ تاریک ہوائیں باغ میں بہہ رہی ہیں، اور سارے میں ایک ایسا مدھم اجالا پھیلتا جارہا ہے جو دن رات میں سے کس وقت پیدا نہیں ہوتا۔

میری کیسل۔ آؤ ہم اس تاریکی اور اس اجالے کی تصویر بنائیں کیونکہ ہم نے اپنا انجام دیکھ لیا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی تنقیدی جھلکیاں

اُردو افسانوں میں حقیقت نگاری

حقیقت نگاری ایک ایسی اصطلاح ہے جس کے مفاہیم و مطالب میں وقت، ماحول، اور افکار و خیالات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اگرچہ وہ فلسفے میں ایک سکول اور ادب میں ایک تحریک کی حیثیت رکھتی ہے اور اس اعتبار سے ماضی میں دور تک اس کا ایک تاریخی سلسلہ بھی ملتا ہے لیکن وہ اپنے آپ کو محدود کر دینے یا جمود کے عالم میں زندہ رہنے کی قائل نہیں — وہ حالات کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بدلتی رہی ہے۔ اُس کے مفہوم میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ اس کی زندگی میں انقلابات آتے رہے ہیں، اور اس نے وقت اور ماحول کے تقاضوں کا ساتھ دیا ہے۔ یوں زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا بدلنا کوئی آسان بات نہیں، لیکن سماجی حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ حقیقتوں کے تصورات کو بدلنا ہی پڑتا ہے۔ کیونکہ خود سماجی تقاضے بدل جاتے ہیں — اور ظاہر ہے سماجی تقاضوں سے منہ موڑنا، ان سے جی چرانا، آنکھ بچانا اور ان کو نظر انداز کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ چنانچہ انسانی زندگی کی تاریخ، فلسفہ اور فن و ادب کی تاریخ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ حقیقت نگاری کے تصورات کم و بیش ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں۔ ایک زمانے میں ماورائی اور مابعد الطبیعاتی باتوں کو حقیقت سمجھا گیا ہے۔ تو دوسرے زمانے میں زندگی کے مادی مسائل حقیقت نگاری کے تحت شمار کئے گئے ہیں کسی زمانے میں مافوق الفطرت، اور مافوق العادت تصورات کو حقیقت سے تعبیر کیا گیا ہے تو کسی زمانے میں عقل و شعور سے متعلق باتیں حقیقت نگاری سے عبارت سمجھی گئی ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے — بلکہ ان متضاد تصورات میں ہمیشہ سے ایک آویزش رہی ہے ایک کشمکش کا سلسلہ چلتا رہا ہے، اور یہ آویزش و کشمکش سماجی زندگی کی طبقاتی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ اسی طبقاتی آویزش اور کشمکش کے نتیجے میں حقیقت نگاری کے نئے تصورات بھی جنم لیتے رہے ہیں — نئے نئے حقائق کا انکشاف بھی ہوتا رہا ہے۔ اور اس طرح حقیقت نگاری آگے قدم بڑھاتی گئی ہے۔

اردو افسانوں میں بھی ہر زمانے میں حقیقت نگاری کا کوئی (یہ) ایک محدود اور مخصوص تصور نہیں ملتا۔ برخلاف اسکے حقیقت نگاری کے تصورات اردو افسانوں میں سماجی حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ہر زمانے میں بدلتے رہے ہیں۔ اور ان تصورات میں ایک کشمکش کا سلسلہ بھی جاری رہا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہر زمانے میں ایک مخصوص نقطۂ نظر کے علم بردار اپنی تخلیقات کو حقیقت سے ہم آہنگ سمجھتے رہے ہیں — ایک زمانہ وہ تھا جب غواصی، ابن نشاطی، وجہی اور نصرتی بھی اپنی مثنویوں کو حقیقت نگاری کا بہترین نمونہ سمجھتے تھے۔ میر حسن اور دیا شنکر نسیم کے نزدیک ان کی مثنویاں سحرالبیان اور گلزار نسیم حقیقت نگاری کی بہترین مثالیں تھیں۔ طلسم ہوشربا اور بوستانِ خیال، الف لیلے اور داستانِ امیر حمزہ، طوطا کہانی اور نوطرز مرصع، فسانۂ عجائب اور باغ و بہار ان کے لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کے خیال میں حقیقتوں کے ایسے مرقعے تھے جن کی مثالوں کا ملنا مشکل تھا۔ اور اسکے بعد شرر اپنے تمام ناولوں کو اور سرشار اپنے فسانۂ آزاد کو حقیقت پر مبنی سمجھتے تھے۔ نذیر احمد کے قصے اور راشد الخیری کی کہانیاں ان کے پڑھنے والوں کے خیال میں حقیقت نگاری سے بھرپور تھیں — یہ دوسری بات ہے کہ موجودہ حالات کے پس منظر میں اگر ان تمام تخلیقات کو دیکھا جائے تو وہ حقیقت سے دور نظر آئیں گی۔ لیکن جس ماحول میں ان کی تخلیق ہوئی اسکے پس منظر میں وہ حقیقت سے پوری طرح ہم آہنگ معلوم ہوتی ہیں — ابن نشاطی، غواصی، میر حسن، اور دیا شنکر نسیم کی کہانیاں جن میں مافوق الفطرت عنصر غالب ہے، ان کو بھی حقیقت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس زمانے کے لوگ انہیں مافوق الفطرت باتوں کو حقیقت سمجھتے تھے۔ اسلئے اگر ان لکھنے والوں نے ان توہمات کو پیش کیا۔ تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ دور ہی عقلیت کا دور نہیں تھا۔ اس میں وہ حقیقت نگاری کہاں سے آتی جس کی بنیادیں عقلیت پر استوار ہوتی ہیں۔

یہ حقائق اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ حقیقت نگاری کے تصورات ماحول، حالات، واقعات اور عقائد و توہمات کے ہاتھوں صورت پذیر ہوتے ہیں — اور وہی لکھنے والا حقیقت نگار کہا جا سکتا ہے جو اس صورتِ حال کی صحیح ترجمانی کرے اور ساتھ ہی اس صورتِ حال کی روشنی میں نئی حقیقتوں کا پتہ لگائے۔ اس کے خیالات کی بنیادیں اگر عقلیت پر استوار ہوں اور حقیقتوں کی تلاش میں اگر وہ شعور کی روشنی سے کام لے تو پھر اسکے ایک حقیقت نگار ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی — اسے آنکھ میچ کر ایک حقیقت نگار کہا جا سکتا ہے۔

ہمارے افسانوں میں ایک زمانے تک عقل و شعور کو مطلق دخل نہیں رہا۔ لکھنے والے صرف دلچسپی کی خاطر کہانیاں لکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے زمانے کے حالات، ماحول، افکار و خیالات اور عقائد و توہمات کی ترجمانی تو کر دی ہے لیکن وہ عقل و شعور سے بہت کم کام لے سکے ہیں — اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مادی زندگی سے متعلق کسی قسم کا کوئی شعور ان کے اندر موجود نہیں تھا۔ اسلئے حالات کی صحیح ترجمانی اور ماحول کی عکاسی تو انہوں نے کر دی ہے۔ لیکن وہ بنیادی حقیقتوں کی نقاب کشائی نہیں کر سکے ہیں۔ گویا انہوں نے نئی حقیقتوں کا انکشاف نہیں کیا ہے۔ اور جس ماحول میں ان کی اور ان کے ذہنی شعور کی نشو و نما ہوئی ہے۔ اسکے پیش نظر ان سے اس بات کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی — ایسا کرنا تو ان لکھنے والوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ اسی لئے انہوں نے جو سماجی زندگی کی عکاسی کی ہے اور ترجمانی کی ہے اسی کو حقیقت نگاری سمجھنا چاہیئے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کو حقیقت نگاری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت حقیقت نگاری کا کوئی دوسرا تصور بھی موجود نہیں تھا۔ اسلئے حقیقت نگاری کے تصورات میں وہ آویزش اور کشمکش جو ہمیں آج نظر آتی ہے، اس کا پتہ اس زمانے میں نہیں چلتا — آگے چل کر جب حالات کروٹ بدلتے ہیں، اور ماحول ایک نیا روپ اختیار کرتا ہے تو یہ صورتِ حال ختم ہوتی ہے، اور اردو افسانوں میں حقیقت نگاری کے تصورات بدلتے ہیں — اور جب حقیقت نگاری کے کئی تصورات کا وجود ہوتا ہے تو ان میں ایک آویزش اور کشمکش بھی شروع ہو جاتی ہے — لیکن اسکے لئے اُردو افسانے کو بہت انتظار کھینچنا پڑتا ہے۔ بہرحال یہ سلسلہ اردو افسانوں میں شروع ہونا ضرور ہے۔

یہاں مختصر افسانوں میں حقیقت نگاری کا جائزہ لینا مقصود ہے لیکن پس منظر کے طور پر اگر ہم حقیقت نگاری کی ان روایات کو سامنے رکھیں جو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ اردو کے قصے کہانیوں میں بنتی رہی ہیں تو مختصر افسانوں میں حقیقت نگاری کے عناصر کو سمجھنے کے سلسلے میں بہت سی مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ اور اس طرح ان کا صحیح جائزہ لیا جا سکیگا۔

اُردو کے قصے کہانیوں میں حقیقت نگاری کا مادی تصور اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب غدر کے بعد زندگی کی پرانی اقدار دم توڑنے لگتی ہیں۔ اور ایک نئی دنیا جنم لیتی ہے۔ زندگی کی محراب میں ایک نیا چراغ روشن ہوتا ہے — ورنہ اس سے قبل تو سوائے مافوق الفطرت اور مافوق العادت باتوں کے اور کوئی بات لکھنے والوں کے ذہن میں آتی ہی نہیں تھی۔ اگر کوئی بہت آگے بڑھتا تھا تو ما بعد الطبیعاتی مسائل کو اس کی تخلیقات میں جگہ مل جاتی تھی۔ اسکے علاوہ ان کے پاس اور کچھ نہیں تھا، لیکن جب غدر کے بعد حالات بدلے تو قصے کہانیوں میں زندگی کے مسائل بھی جگہ پانے لگے۔ اس زمانے کا خاص موضوع سماجی اصلاح تھا۔ چنانچہ اس زمانے کے قصے کہانیوں میں لکھنے والوں نے اس موضوع کو پیش نظر رکھا ہے اور اسکے گرد اپنی کہانیوں کے جال بنے ہیں — نذیر احمد کی کہانیاں اس دور کی نمائندہ کہانیاں ہیں جو سماجی اصلاح کے خیال کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ سماجی اصلاح اس زمانے کے سماج کیلئے ایک حقیقت تھی، اسلئے اس زمانے میں سماجی اصلاح کو بنیاد بنا کر کہانیوں کا لکھنا حقیقت نگاری کی طرف پہلا قدم تھا۔ اس سماجی اصلاح کی نوعیت بڑی حد تک مادی تھی۔ اسلئے یہ اقدام حقیقت نگاری کے مادی تصور سے اردو افسانوں کو روشناس کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوا اور اس نے ایک ایسی روائت قائم کر دی جس کے سہارے اردو افسانہ نگاری نے حقیقت نگاری کے راستے پر زیادہ تیزی کے ساتھ قدم بڑھانے شروع کئے۔ نذیر احمد کے ساتھ سرشار اور شرر بھی کم و بیش اسی زمرے میں آتے ہیں — یہ اور بات ہے کہ نذیر احمد کی طرح سرشار اور شرر کسی ایسی تحریک سے وابستہ نہیں تھے، جو ان میں ایک مشنری کی اسپرٹ پیدا کرتی — پھر بھی ان کے یہاں حقیقت نگاری کا ایک شعور ملتا ہے — اور آج اسی کی وجہ سے وہ اُردو ادب میں زندۂ جاوید ہیں —

خیر تو حقیقت نگاری کی یہ روایت بنی اور حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس میں زیادہ جان آتی گئی۔ اس نے خوب ہاتھ پاؤں نکالے اور اس طرح

اس کا بچپن جوانی میں تبدیل ہو گیا۔ اور جب مختصر افسانہ اردو میں آیا تو حقیقت نگاری کی یہ روایت اس پر بھی اثر انداز ہوئی۔ چنانچہ اردو کا مختصر افسانہ ابتدا سے لیکر اس وقت تک حقیقت نگاری کے سہارے آگے بڑھتا رہا ہے۔ اور آج تو وہ حقیقت نگاری سے علیحدہ کوئی چیز ہے ہی نہیں۔

مختصر افسانہ ہماری اردو میں مغرب کے زیر اثر آیا۔ ہمارے یہاں اس فن کی کوئی جاندار روایت موجود نہیں تھی۔ اسلئے مغربی مختصر افسانے کی ساری خصوصیات وہ اپنے ساتھ لایا۔ مغربی افسانے کی ایک نمایاں خصوصیت حقیقت نگاری رہی ہے — چنانچہ مغرب کے اثر نے اردو افسانوں میں حقیقت نگاری کی روایت کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں بڑی مدد کی — اب رومانیت تک میں زندگی کی جھلک نظر آنے لگی۔ اس کا کھوکھلا پن ختم ہو گیا — اور اس پر جذباتیت کے جو بادل چھائے ہوئے تھے وہ چھٹنے لگے۔ چنانچہ اردو کے جدید مختصر افسانے کی رومانیت تک حقیقت سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ابتدا میں اردو مختصر افسانے پر ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے۔ جب ایک قسم کی جذباتی رومانیت اس پر غالب تھی۔ لیکن اس جذباتی رومانیت میں کئی اثرات کام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک تو مغرب کی رومانیت کا غلط تصور جسے اس زمانے کے لکھنے والے پوری طرح نہیں سمجھ سکے، دوسرے بعض عینیت پرست مفکروں اور شاعروں کے اثرات جن کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے باعث اس زمانے کے لکھنے والوں کا ان سے دامن بچانا مشکل تھا، تیسرے ناسازگار حالات کے باعث ایک فراری ذہنیت جو اس زمانے کے لکھنے والوں میں حالات سے مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے عام ہو رہی تھی اور چوتھے بورژوا ذہنیت جو ایک مخصوص طبقے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس زمانے کے لکھنے والوں میں عام تھی، اور جن کی وجہ سے وہ زندگی میں تعیش پرستی ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ تن آسانی ہی ان کے نزدیک سب کچھ تھی۔ ان تمام باتوں نے مل کر اردو افسانے میں کچھ عرصے تک کھوکھلی جذباتیت اور جذباتی رومانیت کو ہوا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس زمانے کے لکھنے والے زندگی سے منہ موڑ کر، اس کے اہم اور بنیادی مسائل سے کترا کر آسمانوں میں بسیرا لینے لگے۔ نیاز، لطیف الدین احمد اور سجاد حیدر یلدرم وغیرہ اس رومانیت کے علمبردار تھے۔ ان سب پر رومانیت غالب ہے۔ لیکن کہیں کہیں حقیقت کی رمق ان کے یہاں ضرور نظر آ جاتی ہے۔ نیاز اور لطیف الدین کے یہاں حسن کا جو شدید احساس ہے، اور سجاد حیدر یلدرم کے یہاں کہیں کہیں جذباتیت سے ملا جلا زندگی کا جو شعور ملتا ہے۔ اس میں حقیقت نگاری کی صاف جھلک نظر آتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ سب اپنے شبستانوں سے نیچے بہت کم اترتے ہیں۔ انہوں نے سڑکوں پر رینگتی ہوئی اور گندگیوں میں سسکتی ہوئی زندگی کو سمجھنے کی سرے سے کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ لیکن ایک مخصوص طبقے کی زندگی کے ترجمان وہ ضرور ہیں — ان کے علاوہ مسز عبدالقادر اور حجاب امتیاز علی کے افسانوں میں باوجود ایک خاص طرح کی رومانیت کے، زندگی کا احساس بھی نظر آتا ہے — اور یہی خصوصیت ان میں بھی کہیں کہیں حقیقت نگاری کا رنگ دیتی ہے — ویسے مجموعی اعتبار سے ان تمام لکھنے والوں کے یہاں جذباتی رومانیت غالب ہے — اور اس کی وجہ وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ لیکن انہیں کے ساتھ ساتھ اسی زمانے میں اردو میں بعض ایسے افسانہ نگار بھی سامنے آتے ہیں۔ جن کے اندر زندگی کا صحیح احساس اور بنیادی سماجی مسائل کا شعور بدرجہ اتم موجود تھا۔ اور ان میں پریم چند اور ان کے ساتھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پریم چند نہ صرف یہ کہ اردو مختصر افسانے کے بانی ہیں۔ بلکہ حقیقت نگاری کی ابتدا بھی اردو افسانوں میں انہیں کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ پریم چند کے یہاں زندگی کا صحیح احساس موجود ہے۔ وہ سماجی حالات کا شعور بھی رکھتے ہیں۔ انہوں نے حالات کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اسکے مد و جزر کو سمجھنے کی کوشش کی ہے انہوں نے اپنے وقت کی سیاسی اور سماجی تحریکوں کی اہمیت کو محسوس کیا ہے۔ اور ان کی ترجمانی اور عکاسی کے سلسلے میں وہ پیش پیش رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے فن کو اسی مقصد کیلئے وقف کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں ان کے وقت کے ہندوستان کی سماجی اور سیاسی زندگی کی ساری تصویریں نظر آتی ہیں۔ نظریات کے اعتبار سے وہ گاندھی جی کے پیرو تھے۔ ان کے خیال میں گاندھی جی کا پیام ہندوستان کے سارے مسائل کو حل کر سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اسی خیال کے پیش نظر اپنی تمام تخلیقات کو گاندھی جی کے پیام کیلئے وقف کر دیا ہے — گاندھی جی کے پیام میں سماجی اصلاح، دیہاتیوں کی بلندی، گرے پڑے افراد سے ہمدردی۔ بدیسی آقاؤں کی غلامی سے نجات کے خیالات سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ پریم چند نے انہیں تمام باتوں پر اپنی تخلیقات کی بنیادیں رکھی ہیں۔ لیکن پریم چند کے افسانوں میں ان باتوں کی اہمیت ثانوی ہے۔ اولیت ان میں حاصل ہے اس زندگی اور ماحول کو جس سے یہ

متعلق ہیں — پریم چند کا فن اسی وجہ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ وہ عام طور پر دیہاتی زندگی اور اسکے مسائل کے ترجمان کہے جاتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے دیہاتی زندگی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی اور انسانی زندگی کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے یہاں انسانی زندگی کی الجھنوں کا تذکرہ غالب ہے۔ انسانی نفسیات کے بہترین نمونے ان کے فن میں نظر آتے ہیں — ان کے افسانے انسان کے بنیادی جذبات و احساسات کی ترجمانی سے بھرپور ہیں — اسلئے پریم چند کے افسانوں میں تو حقیقت نگاری اپنے شباب پر ملتی ہے — انہوں نے اپنے وقت، ماحول اور اس کے سیاسی و سماجی رجحانات کا ساتھ دیا ہے — اور اس سلسلے میں ہندوستانی زندگی کے سارے مسائل کو اپنے افسانوں میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس سلسلے میں ان کا زاویۂ نظر تجزیاتی نہیں ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ عقل و شعور کے بجائے جذبات کے راستے سے ان مسائل کے حل تک پہنچے ہیں — اپنے وقت کی سیاسی تحریکوں کو انہوں نے بغیر کچھ کہے سنے تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن یہی کیا کم ہے کہ انہوں نے ان مسائل کو اپنے فن کا موضوع بنایا — اردو میں اس سے قبل اس کی کسی نے بھی ہمت نہیں کی تھی — دوسرے پریم چند نے اپنے وقت کے سماجی اور سیاسی رجحانات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کی نفسیات اور ہندوستان کے مختلف طبقوں کے افراد کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے — ہر چند اس میں بھی انہوں نے نئی نئی حقیقتوں کا انکشاف نہیں کیا ہے۔ لیکن نفسیاتِ زندگی کی نقاب کشائی ہی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی۔ پریم چند کو انہیں چیزوں نے ایک حقیقت نگار بنایا — ایسی حقیقت نگاری اردو میں ان سے قبل موجود نہیں تھی۔ اسکو پیش کرنے کے سلسلے میں انہیں اولیت کا شرف حاصل ہے۔

ان کے ساتھی یا ان کے بنائے ہوئے راستے پر چلنے والے یعنی سدرشن، علی عباس حسینی، اعظم کریوی، اور اسی طرح کے بعض اور لکھنے والے پریم چند کے ہاتھوں تشکیل پائی ہوئی حقیقت نگاری کی اس روایت کو اپنے ہاتھوں میں ایک مقدس امانت سمجھتے رہے — اور انہوں نے اس طرح حقیقت نگاری کے اس رجحان کو باقی رکھنے میں مدد کی۔ حقیقت نگاری کے اس رجحان کو جاری رکھنے ہی کے باعث ان کا فن زندہ ہے اور ان کے فن کو اس رجحان کے تسلسل نے زندگی بخشی ہے — ان سب کے افسانوں کا عام رجحان کم و بیش وہی ہے جس سے پریم چند کا فن عبارت ہے۔

حقیقت نگاری کا یہ رجحان جو پریم چند اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں پروان چڑھا اپنی اس صورت میں ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والا نہیں تھا، کیونکہ وہ ایک مخصوص ماحول، مخصوص حالات، اور مخصوص طبقے کے مخصوص خیالات رکھنے والے افراد کے ہاتھوں وجود میں آیا تھا — اور وقت کے ساتھ ساتھ اس ماحول میں تبدیلی ہو رہی تھی۔ وہ حالات بدل رہے تھے اور اس مخصوص طبقے اور اسکے خیالات میں تغیر ہو رہا تھا۔ افکار و خیالات کیلئے نئی نئی راہیں نکل رہی تھیں۔ حالات کو دیکھنے کے لئے نئے نئے زاویئے بن رہے تھے۔ مسائل پر غور کرنے کے سلسلے میں ایک تجزیاتی زاویہ نظر سے کام لیا جانے لگا تھا۔ سیاست میں کانگریس کو ایک نئے راستے پر چلانے کی کوشش جاری تھی۔ اور اس راستے پر اسکے نہ چلنے کی صورت میں اسکو پیچھے چھوڑ دینے کا خیال بھی کہیں کہیں پیدا ہونے لگا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ کانگریس کے اندر کچھ ترقی پسند نوجوان اس طرح سوچنے لگے تھے کہ ان کے بزرگ ہندوستان کو جس راستے پر لئے جاتا چلتے ہیں وہ ٹھیک نہیں ہے۔ ان نوجوانوں میں سے اکثر انتہا پسند تھے۔ لیکن حالات کا انہوں نے عقل و شعور کی روشنی میں مطالعہ کیا تھا۔ اور اس چیز نے ان پر یہ حقیقت روشن کر دی تھی کہ ہندوستان کے بنیادی مسائل صرف اصلاح سے حل نہیں ہو سکتے، اس کے لئے ایک انقلاب کی ضرورت ہے۔ اور یہ انقلاب ان لوگوں کے بس کی بات نہیں جو "اگلے وقتوں کے لوگ" ہیں، جنہوں نے حالات کا مطالعہ کسی سائنٹیفک زاویہ نظر سے نہیں کیا ہے۔ جو گہرائی میں نہیں پہنچتے ہیں۔ جن کی نظر ظاہری باتوں کے پردے کو چیر کر حقائق کی تہہ تک نہیں پہنچی ہے۔ اس لئے ان کا تجزیہ غلط ہے — اور اسی وجہ سے جو راستہ انہوں نے اختیار کیا ہے وہ "کعبہ" کی بجائے "ترکستان" کو جانے والا ہے، اور "ترکستان" کے راستے پر چل کر وہ کعبہ تک کبھی بھی نہیں پہنچ سکتے۔ چنانچہ ان کے شعور نے یہ حقیقت معلوم کی کہ ہندوستان کے مسائل انقلاب چاہتے ہیں۔ یہاں دولت کی تقسیم غلط ہے — یہاں کا معاشی نظام ناہموار اقدار پر قائم ہے — یہاں طبقاتی کشمکش اپنے شباب پر ہے۔ اس لئے جب تک اس نظام کو ختم نہ کیا جائے اور اس کو ختم کرنے کے سلسلے میں کوئی جارحانہ اقدام نہ کیا جائے، اس وقت تک حالات بہتر نہیں ہو سکتے۔ یہ گویا ہندوستان کی زندگی میں اشتراکی رجحان کی ابتدا تھی۔ اس رجحان نے ساری زندگی میں ہنگامہ

برپا کر دیا جس نے مروجہ اقدار کی بنیادیں ہلا دیں۔ اب عقل و شعور کا چرچا عام ہوا۔ ہر بات کو تجزیاتی زاویۂ نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ پرانی اقدار کی عمارت کو ایسی ٹھیس لگی کہ وہ زمین پر آ رہی — اور اس پر نئی اقدار کے محلوں کی بنیادیں رکھی گئیں۔ غرض یہ کہ اس طرح ہر طرف انقلابی رجحانات زور پکڑنے لگے اور زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب کا چرچا نظر آنے لگا۔

یہ نقطۂ نظر کی بڑی اہم تبدیلی تھی۔ جو زندگی اور ادب کے دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ ہمارے افسانوں پر بھی اثر انداز ہوئی۔ اور جس نے ہمارے افسانوں کو حقیقت نگاری کے ایک نئے تصور سے روشناس کیا۔ اب ہمارے افسانہ نگاروں کے نزدیک سماجی اصلاح ہی سب کچھ باقی نہیں رہی۔ بلکہ انہوں نے سماجی زندگی کی غلط اور ناہموار اقدار پر ایسے وار کئے۔ جس کے نتیجے میں اصلاح کا نام ہی کافور ہو گیا۔ اور اس کی جگہ انقلاب اور انقلاب کے ایک نئے نظام کے قیام نے لے لی۔ اسی صورتِ حال نے ہمارے افسانوں میں انتہا پسندی کو جنم دیا — پریم چند اور ان کے ساتھی اس انتہا پسندی کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ ان کے خیال میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ وہ سب کے سب زندگی کے سیدھے سادے عکاس تھے، اور سماجی اصلاح ان کا مقصد تھا۔ پریم چند نے تو آخر عمر میں "کفن" لکھ کر اپنی آواز نئے ساز کی لے سے ملانے کی کوشش کی۔ اس میں شک نہیں کہ سماج کے غلط نظام کے خلاف ایک جارحانہ اقدام ملتا ہے، لیکن پوری طرح وہ اس رجحان کا ساتھ نہیں دے سکے۔ کیونکہ یہ ان کے بس کی بات نہیں تھی — وہ زندگی کو جس زاویۂ نگاہ سے دیکھتے تھے، وہ انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تبدیلی نے پریم چند اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں نشو و نما پانے والے حقیقت نگاری کے اصلاحی رجحان کو پس پشت ڈال دیا — اور لکھنے والوں نے شروع ہی سے ایک دوڑ دوڑنی شروع کی جس میں وہ بہت جلد آگے نکل گئے۔ بلکہ یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ وہ اس میدان میں تنہا نظر آنے لگے۔

اس انقلابی کیفیت نے "انگارے" کے افسانوں کو پیدا کیا۔ اور "انگارے" کے افسانوں کے ہاتھوں اردو افسانہ نگاری ایک بالکل نئی اور اچھوتی قسم کی حقیقت نگاری سے روشناس ہوئی۔ "انگارے" کے افسانوں میں انتہا پسندی ہے۔ بعض ان میں سے فن کی کسوٹی پر بھی پورے نہیں اترتے۔ کہیں کہیں طنز کی گہرائی ابتذال اور بھکڑپن سے بھی جا ملتی ہے۔ کہیں کہیں تخریبی رجحان بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ کہیں کہیں بچپن کا منہ چڑانے والی خصوصیت بھی نظر آتی ہے۔ لیکن ان خامیوں کے باوجود "انگارے" کے افسانوں کے ذریعے پہلی بار سماجی مذموات پر بھرپور وار کئے گئے ہیں۔ ان کے ذریعے دولت کی غلط اور ناہموار تقسیم اور اس کی وجہ سے پیدا شدہ افلاس اور غریبی، طبقاتی تفریق اور اس کے اثرات، مذہب کے غلط تصورات اور اس کی ناہموار اقدار، مابعد الطبیعیاتی عقائد اور توہمات، جنسی بھوک اور اس سے پیدا ہونے والی بے شمار ذہنی الجھنیں، ان سب کو برہنہ کر کے سامنے لایا گیا ہے۔ "انگارے" کے افسانوں کی طنز بڑی گہری ہے — یہ افسانے کہیں کہیں عملِ جراحی کے نمونے ہیں۔ انہوں نے سماجی زندگی کے سارے زخموں سے پردہ ہٹا دیا ہے — ایسے زخم جن کو دیکھ کر گھن آتی ہے — بعض تو ان کو دیکھنے کی تاب ہی نہیں لا سکتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ چیخ اٹھتے ہیں — "انگارے" کے افسانوں میں سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر طنز کیا گیا ہے، لیکن سیاست کی طرف بھی بعض بلیغ اشارے ملتے ہیں۔ اور ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سیاست اس وقت جن راہوں پر چل رہی تھی، اس سے ان نئے لکھنے والوں کو اتفاق نہیں تھا۔ وہ صرف جذباتی ہو کر آزادی کا نعرہ لگانا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ انہیں یہ معلوم کرنا تھا کہ آزادی کے بعد کون سا نظام بنے گا — آیا وہ صحیح معنوں میں آزادی ہوگی بھی یا نہیں — چنانچہ ایک جگہ ان افسانوں میں یہ جملہ ملتا ہے "آزادی کی آجکل اچھی ہوا چل رہی ہے۔ پیٹ میں آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں، اور آپ ہیں کہ آزادی کے چکر میں ہیں۔ موت یا آزادی! مجھے موت پسند نہ آزادی — کوئی میرا پیٹ بھر دے" گویا بھوک، افلاس اور پستی کے مسائل ان کے نزدیک متوسط طبقے کی اس سیاست سے زیادہ اہم تھے۔ جس نے بغیر مستقبل کے بارے میں کوئی منصوبہ باندھے ہوئے صرف سامراج دشمنی کو اپنا نصب العین بنا لیا تھا، جس کے پیشِ نظر عوام کے بنیادی مسائل نہیں تھے۔ جس نے طبقاتی آویزش اور عوام کی بڑھتی ہوئی قوت کو صحیح طور پر محسوس نہیں کیا تھا۔ حالانکہ یہ باتیں اس وقت کی سماجی زندگی میں بہت عام تھیں۔ عوامی طبقہ بھوک، مفلسی اور بیماری کا شکار تھا، لیکن اسی صورتِ حال نے اس کو اپنی تنظیم کرنے میں بھی مدد دی تھی۔ اور دوسرے طبقوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو

صف آرا کر رہا تھا۔ "انگارے" کے افسانے لکھنے والے اس صورتِ حال کا صحیح شعور رکھتے تھے — اور اسی وجہ سے ان کی نظر زندگی کے بنیادی مسائل تک پہنچی تھی۔ ظاہر ہے یہ حقیقت نگاری کی طرف ایک ایسا قدم تھا۔ جس کے بارے میں اس سے قبل کسی نے غور کرنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ سجاد ظہیر، احمد علی اور رشید جہاں نے سب سے پہلے "انگارے" کے افسانوں کے ذریعے اس کی ابتدا کی — اور پھر حقیقت نگاری کا یہ رجحان اُردو افسانوں میں چل نکلا۔

حقیقت نگاری کا یہ رجحان اردو افسانوں میں کئی صورتوں میں نظر آتا ہے۔ اور ان صورتوں نے خود مختلف رجحانات کی حیثیت اختیار کر لی ہے ان رجحانات میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ اہم ہے۔

سب سے پہلے تو اس سلسلے میں ہماری نظر انسانی زندگی کی ترجمانی پر پڑتی ہے — انسانی زندگی کی ترجمانی۔ جس کی روایت ہمارے افسانوں میں پہلے سے موجود تھی۔ لیکن اب بدلتے ہوئے حالات نے جس کو زیادہ سائنٹیفک اور باشعور بنا دیا۔ اس زندگی کی ترجمانی کو پہلے کسی خاص طبقے یا خاص افراد تک محدود رکھا جاتا تھا۔ لیکن اب زندگی کے مختلف طبقات اور ساتھ ہی ساتھ ان کے آپس کے تضاد اور کشمکش کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی گئی۔ کیونکہ یہ زندگی کی ایک بڑی ہی اہم حقیقت تھی۔ اور عوام کو اپنی ذات کا بڑھتا ہوا احساس اور دوسرے طبقات کے مقابلے میں صف آرا ہونے کیلئے تنظیم اس بات کی متقاضی تھی کہ ان کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ اسلئے باشعور افسانہ نگاروں کیلئے یہ ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اب افراد کی زندگی سے متعلق بھی جن حقیقتوں کو بے نقاب کیا گیا، وہ سب بھی اسی طبقاتی احساس اور بدلتے ہوئے حالات کے پس منظر میں ہوا۔ اب بھی اگرچہ زندگی کی ترجمانی ہوئی۔ لیکن اس کی نوعیت مختلف تھی — یہ ٹھیک ہے کہ بہت سے افسانہ نگاروں نے زندگی کی ترجمانی کرتے ہوئے ان باتوں کا پوری طرح خیال نہیں بھی رکھا ہے۔ اور ان کے افسانوں میں ایک سپاٹ کیفیت ملتی ہے۔ لیکن زندگی کی تضادی کیفیت کا احساس اس صورتِ حال کے ساتھ ساتھ بھی ان کے افسانوں میں ضرور نظر آتا ہے۔ وہ سب کے سب زندگی کو ہر پہلو سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک غلط سماجی نظام کے باعث اس کے جسم پر لگے ہوئے تمام زخموں کا بے نقاب کر دینا ان کے پیش نظر ہوتا ہے۔ اور وہ اس سلسلے میں شاید ہی زندگی کے کسی پہلو کو نظر انداز کرتے ہوں۔

زندگی کی اس زبوں حالی کا احساس حالات کی ناہمواری کا شعور اور سب کو ایک نئے نظام میں بدلنے کی خواہش ہمیں احمد علی، رشید جہاں، حیات اللہ انصاری اختر حسین رائے پوری اور اسی طرح کے دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں ملتی ہے۔ ان میں سے بعض نے متوسط طبقے اور اس کی الجھنوں کی ترجمانی کی ہے۔ اسی کی زندگی کے موجودہ کو پیش کیا ہے۔ اس کے مستقبل کے نقشے بنائے ہیں۔ اور اس کے افراد کے حالات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض نے گرے پڑے انسانوں کی زندگی کو پیش کیا ہے، ان کے حالات کی بہت اچھی عکاسی کی ہے، لیکن اس حقیقت کی تہ تک نہیں پہنچ سکے ہیں کہ یہ سب کیوں ہے، کون اس کا باعث ہے! اور کس طرح اس کو حل ہونا چاہیئے؟ احمد علی اور حیات اللہ دونوں کے افسانوں میں یہ خصوصیت ملتی ہے۔ رشید جہاں کے یہاں بے شک زندگی کے بعض بنیادی مسائل کے احساس کا پتہ ملتا ہے — اور ان کو پیش کرنے کے سلسلے میں وہ آگے بڑھنے کی کوشش بھی کرتی ہیں، لیکن احمد علی اور حیات اللہ کے افسانوں میں یہ خصوصیت کم ہے۔ اور اختر حسین رائے پوری کے یہاں تو رومانیت غالب ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے یہاں زندگی کی سنگین اور ٹھوس حقیقتوں کا شعور نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ ان کے بعض افسانوں میں یہ خصوصیت بھی ملتی ہے — البتہ وہ اس کو پیش کرتے ہوئے کسی گہرائی میں نہیں جاتے۔ بہرحال بہت سی خامیوں سے قطع نظر مجموعی اعتبار سے ان افسانہ نگاروں نے اردو افسانوں میں حقیقت کے نئے تصور کو لانے میں مدد کی ہے — یہ ٹھیک ہے کہ ان سب کے یہاں اس عوامی طبقے کا احساس کم ہے جس کے ہاتھوں سماجی زندگی انقلاب سے دوچار ہو کر ایک نئی دنیا کی تعمیر کا باعث بنتی ہے — لیکن متوسط طبقہ جس کے یہ ترجمان ہیں اس کے بھی کچھ مسائل ہیں، اس کی بھی کچھ الجھنیں ہیں۔ اس لئے اس کی ترجمانی کو بھی حقیقت نگاری سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ متوسط طبقے کی ترجمانی موجودہ دور کے اردو افسانوں پر غالب ہے۔ کرشن چندر، عصمت، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، اپیندر ناتھ اشک، بلونت سنگھ، اختر اورینوی اور اختر انصاری ان سب کے یہاں اس کے اثرات ملتے ہیں۔ البتہ یہ ترجمانی اس ترجمانی سے مختلف ہے جو اس سے قبل کی جاتی تھی۔ ان سب کے یہاں اول تو اب زیادہ باشعور طریقے پر ترجمانی نظر آتی ہے۔ اور دوسرے ان افسانہ نگاروں نے اس

سلسلے میں اپنے میدان کو بہت وسیع کر لیا ہے۔ متوسط طبقے ہی سے متعلق بہت سے ایسی باتوں پر ان لکھنے والوں نے قلم اٹھایا ہے جن کی طرف اس سے قبل کسی نے توجہ نہیں کی تھی۔ مثال کے طور پر ان کے یہاں متوسط طبقے کے افراد کی محبت اور عشق کا بیان بھی ملتا ہے۔ لیکن اس کی بنیاد صرف رومان ہی پر استوار نہیں ہوتی، بلکہ یہ محبت سماج کے درمیان کی جاتی ہے، وہ زندگی کی حقیقتوں سے ٹکراتی ہے، اور یہ افسانہ نگار محبت اور عشق کو اسی پس منظر میں پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے افسانوں میں اس عشق و محبت کا بیان نیاز، مجنوں، لطیف الدین احمد اور سجاد حیدر یلدرم وغیرہ کے بیانات سے مختلف ہو جاتا ہے۔ اب یہ زندگی سے زیادہ قریب ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے زندگی اور خصوصاً متوسط طبقے کی زندگی، رومان ہی رومان نہیں ہے — اس میں اسکے علاوہ بھی بہت سی باتیں ہیں اور یہ بہت سی باتیں اس رومان کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ عشق و محبت کے علاوہ ان افسانہ نگاروں نے متوسط طبقے کے معاشی مسائل کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ اور اس سلسلے میں دولت کی غلط تقسیم، ذاتی ملکیت، اور اسی طرح کے بعض دوسرے بنیادی مسائل پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ بعضوں کے افسانوں میں متوسط طبقے کے افراد کے جنسی مسائل ملتے ہیں۔ ان میں جنسی رجحانات اور جنسی تعلیم وغیرہ کے موضوعات کو خاص طور پر اہمیت حاصل ہے۔ ان میں سے اکثر نے جنسی مسائل کی سماجی نوعیت کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور ان میں بعض افسانہ نگار ایسے ہیں۔ جو دیہاتی زندگی کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور انہوں نے اس کی صحیح، سچی اور پرخلوص ترجمانی بھی کی ہے۔ ان کی یہ ترجمانی پریم چند کی بے لاگ خارجیت یا اصلاح پرستی سے مختلف ہے۔ انہوں نے ہندوستان کی دیہاتی زندگی کے بنیادی مسائل کو پیش نظر رکھا ہے۔ ظاہر ہے یہ تبدیلی ان افسانہ نگاروں کے فن کو حقیقت کے زیادہ قریب لے جاتی ہے۔

عشق و محبت کے واقعات کی ترجمانی اردو افسانہ نگاری کا ایک اہم موضوع ہے۔ پہلے اس میں ایک معصومیت اور رومانیت تھی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ انہیں افسانہ نگاروں کے ہاتھوں حقیقت نگاری سے ہم آہنگ ہوتی گئی۔ جو ابتدا میں رومان ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ کرشن چندر نے ایک رومانی افسانہ نگار کی حیثیت سے ابتدا کی تھی۔ "جہلم میں ناؤ پر" اور "آنگی" کی طرح کے افسانے لکھے تھے۔ بلکہ یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ طلسم خیال کے سارے افسانوں پر رومانیت غالب ہے۔ لیکن جیسے جیسے یہ زمانہ گزرتا گیا ان کی یہ رومانیت حقیقت کے زیادہ قریب آتی گئی۔ اور پھر وہ "خونی ناچ"، ایسے افسانے لکھنے لگے جس میں جنت اور جہنم کا امتزاج ملتا ہے — زندگی کی تلخیاں رومان سے گھلی ملی نظر آتی ہیں۔ عصمت کا بھی یہی حال ہے۔ کچھ دنوں تک ان پر "ہنگیر" کی سی رومانیت غالب رہتی ہے۔ لیکن بدلتے ہوئے حالات کا بڑھتا ہوا شعور انہیں اس سلسلے میں دوسرے مسائل کو بھی موضوع بنانے اور ان کا حل تلاش کرنے کیلئے مجبور کرتا ہے — چنانچہ رومان سے ہٹ کر وہ انسانی زندگی اور خصوصاً صنفِ لطیف کے پیچیدہ مسائل کی گہرائیوں میں پہنچ جاتی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے یہاں رومان کی نوعیت شروع ہی سے مختلف رہی ہے — وہ عورت اور اس سے محبت کا ذکر اپنے افسانوں میں کرتے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں عورت صرف ایک اکتساب لذت کا ذریعہ ہی نہیں رہتی۔ بلکہ وہ سماج کے ایک فرد کی حیثیت سے ذمہ داریوں کے اتنے بوجھ اٹھائے ہوئے دکھائی دیتی ہے کہ پڑھنے والا اس کے ساتھ ہمدردی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی بھی پہلے رومانی تھے۔ لیکن وقت نے ان کو بھی اس رومان سے ہٹ کر حقیقت سے ہم آہنگ کر دیا۔ انہوں نے دیہاتی زندگی کے پس منظر میں محبت کو پیش کیا۔ اسلئے دیہاتی زندگی کے مسائل ان کے یہاں بھی اس محبت اور رومان سے الجھ گئے۔ اور صرف ان کے افسانوں میں بھی صرف محبت نہیں رہ گئی، بلکہ اس نے ان گنت سماجی اور معاشی مسائل سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا۔ اُپیندر ناتھ اشک نے تو کبھی بھی سماجی زندگی اور اسکے مسائل سے ہم آہنگ ہو کر محبت کا ذکر کیا ہی نہیں — سعادت حسن منٹو نے رومان کو کبھی اپنے افسانوں میں جگہ ہی نہیں دی۔ بلکہ ہمیشہ یہ ہوا کہ رومان ہر جگہ کوئی جنسی حقیقت بنکر سامنے آگیا۔ اختر اورینوی اور اختر انصاری زندگی کی بے شمار پیچیدگیوں اور الجھنوں کی گتھیوں کو سلجھاتے رہے — اور بلونت سنگھ نے رومان کو زندگی کے رنگ ہی میں رنگ دیا — ان کے یہاں زندگی کا احساس محبت ہی کی طرح شدید ہے۔ اسلئے ان کی محبت کی ترجمانی زندگی کی ترجمانی بن جاتی ہے۔ وہ رومان اور محبت میں زندگی کا خون دوڑا دیتے ہیں —

اس طرح ان افسانہ نگاروں کے ہاتھوں رومان، اور عشق و محبت اردو افسانہ نگاری میں زندگی کی سنگین، تلخ اور ٹھوس حقیقتوں سے ہم آہنگ ہوا۔ زندگی اور اسکے مسائل سے الگ رومان، اور محبت ایک لایعنی چیز قرار پائی۔ اور ان سب نے مل کر اسے زندگی کے ساتھ ایسا شیر و شکر کر دیا کہ

اس میں اور زندگی میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ اردو افسانوں میں یہ حقیقت نگاری اس سے قبل موجود نہیں تھی۔

ہمارے معاشی مسائل نے اردو افسانوں کو حقیقت نگاری سے قریب کرنے میں بڑی مدد کی ہے۔ معاشی مسائل زندگی کے سب سے اہم مسائل ہیں۔ ساری انسانی زندگی اسی محور کے گرد گھومتی ہے۔ یہی مسائل ہیں جو انسان کو نہ جانے کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ نہ جانے کتنی تحریکوں کو جنم دیتے ہیں نہ جانے جماعتوں کو کہاں سے کہاں لیجاتے ہیں نہ جانے ان کے ہاتھوں کتنے فلسفوں کی تشکیل ہوتی ہے ۔ نہ جانے آگ اور خون کے کتنے طوفان اُٹھتے ہیں۔ ان کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے نہ جانے کتنی خیالی دنیائیں بسائی جاتی ہیں ۔ اور ان کو اصلیت کا روپ دینے کے لئے نہ جانے انسانوں کو کن کن راہوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ کیسی کیسی منزلوں سے اسے روشناس ہونا پڑتا ہے۔ ان کو ٹھیک کرنے کے لئے نہ جانے کتنے ویرانوں کی خاک چھاننی پڑتی ہے ۔ اس لئے معاشی مسائل اور ان مسائل کے باعث پیدا شدہ ان گنت پہلوؤں کی ترجمانی کو اردو افسانوں میں خصوصیت کے ساتھ اہمیت حاصل ہے۔ شروع شروع میں یہ مسائل اور ان کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی صرف اس طرح کی جاتی تھی۔ کہ افسانہ نگار افلاس، بھوک اور بیماری کے مناظر کو ہو بہو پیش کر دیتے تھے یا اگر بہت آگے بڑھتے تھے۔ تو یہ کہتے تھے کہ ایسے لوگوں کی اصلاح ہونی چاہیئے۔ ان مسائل اور حالات کو سمجھنے، ان کی اصلیت اور حقیقت کو معلوم کرنے، اور ان کا حل نکالنے کا شعور ابتدائی دور کے افسانہ نگاروں میں موجود نہیں تھا۔ پریم چند تک ان مسائل کو تجزیاتی زاویۂ نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ البتہ ان مسائل کی طرف توجہ دلانے اور پیش کرنے میں انہیں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ لیکن پریم چند کے بعد حالات کچھ اس طرح بدلے کہ عوامی تحریکیں بڑھتی گئیں اور عوامی احساس بھی عام ہوتا گیا۔ اس عوامی احساس نے ان مسائل اور حالات کے تجزیاتی مطالعے کی طرف توجہ دلائی۔ طبقاتی تفریق اور طبقاتی کشمکش کا شعور بھی بعض افسانہ نگاروں میں پیدا ہونے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب یہ معاشی مسائل انہیں نئے زاویۂ نظر سے دیکھے جانے لگے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض افسانہ نگاروں کے شعور ابھی اس سلسلے میں پختہ نہیں ہو سکے ہیں۔ اور بعض نئے لکھنے والے ابھی تک کسان اور زمیندار، مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش تک جذبات کے سہارے پہنچے ہیں، لیکن بہ حیثیت مجموعی اعتبار سے اردو افسانوں کا عام رجحان اس سلسلے میں تجزیاتی اور حکیمانہ ہے۔ کرشن چندر، عصمت، راجندر سنگھ بیدی، ندیم اور بلونت سنگھ ان سب نے اس حقیقت کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ ان میں بعض افسانہ نگار تو پوری طرح اشتراکی نظر آتے ہیں۔ ایسے افسانہ نگاروں کے یہاں عوامی خیالات، عوامی جدوجہد، عوامی تحریکات کی طرف توجہ ملتی ہے۔ بعض اس سلسلے میں انتہا پسند بھی ہو گئے ہیں۔ اور ان کے اسی رجحان نے ان کے فن کو پروپیگنڈے کے حدود میں بھی داخل کر دیا ہے۔ پروپیگنڈا کوئی بری چیز نہیں لیکن ان افسانوں میں ایسا پروپیگنڈا ملتا ہے۔ جو فن کو ساتھ لیکر نہیں چلتا ۔ خود کرشن چندر جیسے فن کا شدید احساس رکھنے والے افسانہ نگاروں کے یہاں یہ خصوصیت پیدا ہو چلی ہے۔ کرشن چندر کے تازہ افسانوں میں اشتراکی حقیقت نگاری کا رجحان تو ہے لیکن ان میں سے اکثر فن کی نزاکتوں سے دور جا پڑتے ہیں۔

ان عوامی مسائل کو پیش کرنے کے سلسلے میں جدید افسانہ نگاروں کا رجحان اشتراکیت کی طرف ہے۔ اسی وجہ سے اشتراکی حقیقت نگاری کے اثرات جدید اردو افسانہ نگاری میں آ رہے ہیں۔ اب ہر بات کو عوامی نقطۂ نظر سے دیکھا جانے لگا ہے۔ کسان اور مزدور، اور متوسط طبقے کے افراد اور زمینداروں، جاگیرداروں، ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے درمیان جو ایک کشمکش کا سلسلہ جاری ہے اس کو ہمارے نئے افسانہ نگار اپنے فن کا موضوع بنا رہے ہیں۔ انہوں نے گہرائی کے ساتھ ان مسائل کو پیش کیا ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کا زاویۂ نظر اس سلسلے میں اشتراکی ہے۔ جس نے ایک نئے قسم کی حقیقت نگاری سے اردو افسانوں کو روشناس کیا ہے۔

یہی نیا رجحان اردو افسانوں میں جنسی حقیقت نگاری کو لایا ہے۔ بڑھتی ہوئی عقلیت کیستی نے جہاں زندگی کے اور شعبوں میں سائنٹیفک نقطۂ نظر کو پیدا کیا، وہاں جنسیات کی طرف بھی توجہ دلائی۔ کیونکہ یہ جذبہ انسان کے بنیادی جذبات میں سے ہے۔ اور اس کی انسانی زندگی میں بڑی اہمیت تھی پھر جاگیردارانہ نظام نے جنس کے معاملے میں سماج کے اندر ایسی قدروں کو رواج دے دیا تھا۔ جو اس کے لئے سراسر مضر اور نقصان رساں تھیں۔ اس لئے جب انسانوں میں سائنٹیفک نقطۂ نظر عام ہوا تو افسانہ نگاروں نے اس طرف بھی توجہ کی۔ سب سے پہلے منٹو اور عصمت نے اس

موضوع پر قلم اٹھایا — اور پھر اسکے بعد ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نے بھی اس موضوع پر افسانے لکھے۔ منٹو نے ایک طرف تو جنسی حقائق کی طرف توجہ دلائی اور دوسری طرف طوائفوں کے مسئلے پر بہت سے افسانے لکھے۔ ظاہر ہے ان موضوعات کی نوعیت سماجی تھی۔ اس لئے اس طرح کے افسانے منٹو کے سماجی شعور پر دلالت کرتے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں ان کے یہاں ایسے افسانوں میں لذتیت کا احساس ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ عصمت نے متوسط طبقے کی نوجوان لڑکیوں کے جنسی مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ اور عرصے تک اُنہوں نے اپنے فن کو اسکے لئے وقف کر رکھا۔ متوسط طبقے کی نوجوان لڑکیوں کے جنسی مسائل بڑے ہی پیچیدہ اور اہم تھے، لیکن ابھی تک ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی تھی۔ عصمت نے سماجی زندگی کا ایک اہم اور بنیادی مسئلہ سمجھ کر اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اُنہوں نے اس موضوع پر بہت اچھے افسانے لکھے — ان کے پہلے افسانوں میں سماجی شعور، مشاہدہ، صنفِ لطیف کی نفسیات سے واقفیت، اور جنسی مذموعات کو درست کرنے کا احساس، یہ تمام باتیں اپنے شباب پر نظر آتی ہیں اس میں شک نہیں کہ ان کے یہاں بھی اس قسم کے افسانوں میں کہیں کہیں لذتیت کی جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے۔ اور کہیں کہیں جگہ کھل کھیلنے والے انداز کا احساس ہوتا ہے، لیکن ان خامیوں سے قطع نظر کر کے اگر دیکھا جائے تو ایسے مجموعی اعتبار سے ان کے اس قسم کے افسانوں نے سماجی زندگی کے اس پہلو کو سدھارنے میں بہت کچھ کیا ہے۔ اب جنس کے معاملے میں جھجک بڑی حد تک کم ہو گئی ہے۔ اور ان مسائل کے معاملے میں کسی حد تک بے باکی کے ساتھ سوچا اور غور کیا جانے لگا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ عصمت کے افسانوں نے ایک ایسی فضا پیدا کی جس نے اس موضوع پر کچھ نئے لکھنے والوں کو متوجہ کیا۔ چنانچہ ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نے اس موضوع پر افسانے لکھنے شروع کئے۔ شروع شروع میں ان دونوں کے یہاں جذباتیت زیادہ تھی۔ لذت پرستی کا پلہ بھی بھاری تھا۔ لیکن جلد ہی اُنہوں نے اپنے افسانوں میں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت پیدا کر لی۔ اور اس موضوع پر بعض بہت اچھے افسانے لکھے۔ ان کے افسانے عصمت کے افسانوں تک تو نہیں پہنچتے، لیکن ان کی سماجی نوعیت کے پیش نظر انہیں اردو افسانہ نگاری میں خاصی اہمیت حاصل ہے۔

اس طرح اردو افسانوں میں جنسی حقیقت نگاری کا رجحان عام ہوا۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے اس رجحان کی نوعیت سماجی ہے۔ سماج جنسی زندگی سے براہِ راست متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے جنسی مسائل کو سماجی زندگی میں خاصی اہمیت حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ اردو افسانہ نگاری نے اپنے دامن میں اس موضوع کو جگہ دے کر اپنے آپ کو حقیقت نگاری سے زیادہ قریب کر لیا ہے۔

جنسی زندگی سے متعلق حقیقت نگاری کے اس رجحان نے ایک طرف تو اجتماعیت کو اپنے پیش نظر رکھا اور جنسی مسائل کا سماجی اہمیت کو سامنے رکھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کی، لیکن ان افسانہ نگاروں کے ساتھ ہی ساتھ بعض ایسے افسانہ نگاروں نے بھی ایسے افسانے لکھے۔ جن کا موضوع تو انسان کی جنسی زندگی تھی، لیکن ان کے افسانوں کی نوعیت سماجی ہونے کی بجائے انفرادی تھی۔ اُنہوں نے سماج کو اپنے سامنے نہیں رکھا، بلکہ فرد کی نجی زندگی اور خصوصاً اس سلسلے میں اس کی ذہنی پیچیدگیوں اور الجھنوں کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں اُنہوں نے فرائڈ کے خیالات کو شمع راہ بنایا۔ اور اس طرح وہ تحت شعور کی بھول بھلیوں میں چکر لگاتے رہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس موضوع پر ان افسانہ نگاروں نے بعض بہت اچھے افسانوں کی تخلیق کی اور جہاں تک انفرادی زندگی کا تعلق ہے وہ حقیقت نگاری تک ضرور پہنچ گئے۔ لیکن سماجی اعتبار سے حقیقت نگاری کی خصوصیات ان کے یہاں پیدا نہیں ہو سکیں۔ اُنہوں نے جنسی اعتبار سے بیمار اور ابنارمل کرداروں کو پیش کیا۔ اور اس طرح اُن کا فن ایک بیمار زندگی کا عکاس اور ترجمان بن گیا۔ ممتاز مفتی اس رجحان کے سب سے بڑے ترجمان ہیں۔ اور اُنہوں نے اس موضوع پر بعض بہت اچھے افسانے لکھے ہیں۔ انفرادی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یقیناً اپنے افسانوں میں اُنہوں نے حقیقت نگاری کے ایک نئے رجحان کو جگہ دی ہے۔ لیکن سماجی زندگی کی روشنی میں ان کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ وہ جس زندگی کے ترجمان ہیں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ کیونکہ وہ فرد کو شعور کے راستے سے ہٹا دیتی ہے۔ اسلئے ان کا فن ایک خاص قسم کی حقیقت نگاری سے ہم آہنگ ہے۔ اس میں سماجی زندگی کی ترجمانی کا پہلو نہ ہونے کے باعث کوئی صحت مند اور صحت بخش کیفیت نہیں۔ بلکہ اس کی نوعیت زوال پسندانہ ہے۔

نفسیات کے بڑھتے ہوئے شعور نے بھی ہمارے افسانہ نگاروں کی افسانوں کو حقیقت نگاری کے زیادہ قریب کر دیا ہے۔ انسانی نفسیات کا اگر خیال نہ رکھا جائے تو ظاہر ہے افسانے میں حقیقت کا رنگ پیدا نہیں ہو سکتا۔ اسلئے ہر افسانہ نگار کو اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کوئی افسانہ نگار، اپنی پیش کی ہوئی کسی بات کو انسانی نفسیات سے باہر نہیں جانے دیتا۔ اسلئے حقیقت نگاری کے اس رجحان کے اثرات تو ہر افسانہ نگار کے یہاں ملتے ہیں اردو میں پریم چند سے لیکر اس وقت تک کے افسانہ نگاروں نے اسکو چابک دستی سے برتنے کی کوشش کی ہے، لیکن موجودہ دور میں نفسیات کے علم سے بڑھتی ہوئی دلچسپی نے افسانہ نگاروں کو اس کے زیادہ قریب کر دیا ہے۔ چنانچہ بعض نوجوان افسانہ نگاروں نے تو اپنے فن کی بنیادیں ہی اسی پر رکھی ہیں۔ کرشن چندر، عصمت، منٹو، بیدی، اختر انصاری، اشک ان سب کے یہاں حقیقت نگاری کے اس رجحان کے اثرات ملتے ہیں۔ ان سب نے اپنے افسانوں میں انسانی نفسیات کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے۔ اور اس طرح انسانی نفسیات کے بڑے حسین مرقعے بنائے ہیں۔ ان کے یہاں نفسیات کے اثرات ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے نہیں ملتے بلکہ مختلف موضوعات کو پیش کرنے کے سلسلے میں وہ اس سے کام لیتے ہیں۔ لیکن بعض افسانہ نگار اردو میں ایسے بھی ہیں۔ جنہوں نے نفسیات کو ایک موضوع کی حیثیت سے اپنایا ہے۔ ان میں محمد حسن عسکری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ہر چند ان کا رجحان زوال پسندی کی طرف، اور انہوں نے جن کرداروں کی تصویر کشی اپنے افسانوں میں کی ہے، ان میں سے زیادہ کسی نہ کسی ذہنی بیماری میں مبتلا ہیں، لیکن انسانی نفسیات کی ترجمانی میں انہیں ملکہ حاصل ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں نفسیاتی حقیقت نگاری کو جس منزل تک پہنچایا ہے۔ اس تک اردو کے بہت کم افسانہ نگار پہنچ سکے ہیں۔ فرد کے نفسیاتی تجزیئے میں انہیں کمال حاصل ہے اور لطف یہ ہے کہ یہ تجزیہ ممتاز مفتی کی طرح صرف تحت شعور ہی تک محدود نہیں رہتا، برخلاف اسکے عسکری اسے شعور تک محدود رکھتے ہیں۔ کاش وہ صحت مند افراد کا ایسا تجزیہ کرتے۔ عسکری کے علاوہ ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور شبیر محمود اختر، پرتھوی ناتھ شرما، ممتاز شیریں نے بھی اس موضوع پر بعض اچھے افسانے لکھے ہیں۔ اور اس طرح نفسیاتی حقیقت نگاری بھی اردو افسانوں میں رونما ہوتی ہے۔

موجودہ دور کے اردو افسانہ نگاروں میں، جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے، طبقاتی شعور بدرجہ اتم موجود ہے۔ اسکی وجہ شاید یہ ہے کہ طبقاتی تفریق ہماری سماجی زندگی میں سب سے زیادہ نمایاں ہے اور ہمارے افسانہ نگار ان مختلف طبقات سے تعلق رکھتے ہیں، جن میں آپس میں ایک کشمکش ہے۔ اس کشمکش کو جن افسانہ نگاروں نے اچھی طرح سمجھا ہے وہ تو ایک سائنٹیفک نقطۂ نظر سے اپنے افسانوں میں پیدا کر سکے ہیں۔ اور اس سائنٹیفک نقطۂ نظر نے عوامی اور محنت کش طبقے کی اہمیت ان پر روشن کر دی ہے۔ چنانچہ وہ اُس کے ترجمان ہو گئے ہیں۔ اور انہوں نے اپنے فن کو عوامی طبقے کی جدوجہد کے لئے وقف کر دیا ہے۔ مختلف افسانہ نگاروں کے یہاں حقیقت نگاری کے اس رجحان کے اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ اور اس میں ان دنوں سب سے زیادہ پیش پیش ہیں کرشن چندر، عصمت چغتائی، اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ — اور ان کے یہاں یہ احساس شعوری ہے۔ ویسے مجموعی اعتبار سے اردو کے زیادہ افسانہ نگار ابھی تک اپنے اپنے طبقے کے ترجمان ہیں۔ جس میں متوسط طبقے کی ترجمانی کا پلہ بھاری ہے، کیونکہ ہمارے زیادہ افسانہ نگار اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ وہ بعضوں نے اونچے طبقے کو بھی اپنے فنون کا موضوع بنایا ہے۔ قرۃ العین حیدر اور شفیق الرحمان اس سلسلے میں پیش پیش ہیں۔ قرۃ العین نے ان لوگوں کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ جن کی دنیا میں قہقہے ہیں، خوشحالی ہے، بلندی ہے، زندگی اور اسکے مسائل سے بے نیازی ہے، رولس رائس ہے، یوکلپٹس کے درخت ہیں۔ پیانو ہے، آرکسٹرا ہے اور رقص ہے۔ اس ماحول کی عکاسی کی ہے۔ جس میں قدم قدم پر بناوٹ ہے، تکلف ہے، تصنع ہے، زندگی کی غلط اقدار کا پاس اور لحاظ ہے۔ یہ لوگ اور ان کا یہ ماحول کبھی آسمانوں کی بلندی سے نیچے نہیں اترتا وہ سب کے سب ہوا میں معلق نظر آتے ہیں۔ کاش وہ زمین پر بھی اتر سکتے۔ شفیق الرحمان کے افسانوں میں اسی طبقے کی زندگی کے ہلکے پھلکے پہلوؤں کی ترجمانی ہے انہوں نے اس اونچے طبقے کے افراد کی کھوکھلی محبت اور جذباتی رومانیت کو پیش کیا ہے۔ وہ خود بھی اسی ماحول میں کھوئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کیفیات کو پیش کرنے کے سلسلے میں ان کے یہاں وہ سنجیدگی بھی نہیں، جس کو قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں میں شروع سے آخر تک برقرار رکھا ہے

بہر حال ان کے افسانوں سے اس طبقے کی زندگی سے واقفیت ضرور ہو جاتی ہے۔ البتہ ان کے یہ افسانے پڑھنے والے پر کوئی صحت مند اثر نہیں چھوڑتے کاش یہ لوگ دنیا سے باہر نکل کر بھی نہیں دیکھتے۔ کاش انہیں اس بات کا بھی احساس ہوتا کہ یہ طبقہ کس قدر تیزی سے اپنی موت کی طرف قدم بڑھا رہا ہے کون سے خطرے بھوتوں کی صورت میں اسکے سامنے موجود ہیں اور کونسی قوتیں اس کو موت کے گھاٹ اتارنے کے در پے ہیں — اس لئے ان کے افسانوں کا یہ رجحان اگرچہ ان کے نزدیک حقیقت نگاری پر مبنی ہے لیکن حقیقتاً حقیقت نگاری نہیں۔ صحیح حقیقت نگاری تو ان کے یہاں اس وقت پیدا ہو سکتی تھی جب انہیں اس آویزش اور کشمکش کا احساس ہوتا جو اس سماجی زندگی کے مختلف طبقات میں جاری ہے اور جن میں سے صرف اس طبقے کی ترجمانی انہوں نے کی ہے، جو بڑی تیزی سے زوال کی طرف جا رہا ہے۔ کرشن چندر اور عصمت پر یہ حقیقت روشن ہوئی۔ چنانچہ وہ متوسط طبقے کو چھوڑ کر اب عوامی طبقے میں پہنچ گئے ہیں۔ کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ متوسط طبقہ بھی اس عوامی اور محنت کش طبقے میں تبدیل ہو رہا ہے۔ جس کے ہاتھوں انسانی زندگی کے مستقبل کی تعمیر ہونے والی ہے۔ اور جس کی طرف توجہ نہ کرنا خود اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔

اردو افسانہ ہمیشہ ہمیشہ اپنے زمانے کے حالات و واقعات سے ہم آہنگ رہا ہے۔ اور اس نے ہر زمانے میں اپنے ماحول کی نہایت صحیح، سچی اور پرخلوص ترجمانی کی ہے۔ اور اس کی اسی خصوصیت نے اس میں حقیقت نگاری کا رنگ بھرا ہے۔ اس میں ہماری تاریخ کا مد و جزر موجود ہے۔ ہماری سماجی زندگی میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، ان کے نقشے موجود ہیں، زمانہ جس طرح کروٹیں بدلتا رہتا ہے، اور اس کے نتیجے میں جو نئے نئے افکار و خیالات آتے رہے ہیں ان کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ اس میں کانگریس کے ماتحت اس جد و جہد اور اصلاح کی تحریکوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ جن کا سلسلہ بدیشی سامراج کو نکال باہر کرنے اور عوام کی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے ایک زمانے تک جاری رہا۔ پھر اس سلسلے کے بے شمار واقعات کی عکاسی بھی اس میں نظر آتی ہے اور اس مطالعہ میں پریم چند اور ان کے ساتھی پیش پیش رہے ہیں۔ ان کے بعد نوجوان افسانہ نگاروں نے ان سیاسی اور سماجی حالات کا مطالعہ ایک دوسرے زاویہ نظر سے کیا ہے۔ انہوں نے ان حالات کو بہتر بنانے کے سلسلے میں ایک انقلاب کے خواب بھی دیکھے ہیں۔ عقل و شعور کی روشنی میں بحث طلب اور پیچیدہ سماجی مسائل کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ کرشن چندر، عصمت، منٹو، بیدی، احمد ندیم اور انور وغیرہ کو ایسا کرنے میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان لکھنے والوں نے اپنے زمانے کے شاید ہی کسی سیاسی اور سماجی واقعے کو موضوع نہ بنایا ہو۔ انگریزی سامراج کے ختم ہو جانے کے بعد ان میں سے اکثر نے زندگی کی صورت حال کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ تقسیم ہند، فسادات، سرمایہ داری، حکومتوں کا جارحانہ اور عوام دشمن پالیسی کو اپنے افسانوں میں بے نقاب کیا ہے۔ آج یہ سب ایسا کر رہے ہیں۔ اور آئندہ بھی ایسا کرتے رہیں گے۔ اس وقت تک جب تک زندگی کوئی ایسا رنگ نہیں بدلتی۔ جس سے عوامی اقتدار سرخرو ہوں، اور جب انسانی زندگی ایک ایسے سکون اور اطمینان امن اور شانتی سے ہمکنار ہو۔ جو سماجی زندگی کو جنت نشان بنا دے — آج انہیں خیالات نے ہمارے افسانوں کو حقیقت نگاری کے منتہائے کمال پر پہنچا دیا ہے۔

یہاں اردو کے تمام افسانہ نگاروں اور ان کے ایک ایک افسانے میں حقیقت نگاری کے عناصر کا تجزیہ مقصود نہیں تھا۔ اس لئے صرف حقیقت نگاری کے مختلف رجحانات سے بحث کی گئی ہے۔ تاکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے۔ کہ اردو افسانوں نے ہر زمانے میں حقیقت نگاری کے بدلتے ہوئے تصورات کا ساتھ دیا ہے۔ اور مجموعی اعتبار سے ہمارے ادب کی یہ صنف ہمیشہ ہمیشہ حقیقت و واقعیت سے ہم آہنگ رہی ہے۔

دوماہی **سنگِ میل** پشاور

سرحد نمبر

پیش کر کے سرحد کے چہرے سے نقاب اٹھاتا ہے۔ "سنگ میل کا "سرحد نمبر"

غیور اور جفاکش افغانوں کی زندگیوں کا ایک ایسا جامع مرقع ہے جو مستقبل کے مورّخ کیلئے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔

دوماہی **سنگِ میل** پشاور

کے پتے سے ایک خط لکھ کر وی۔ پی سے منگائیے یا اپنے شہر کے ایجنٹ سے حاصل کیجئے

دوماہی **نیا دور** کراچی

نمبر ۱۸، ۱۹

آزادی نمبر

شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکا ہے

٭

۳۲۰ صفحات۔ کتابی سائز۔ قیمت سوا دو روپے

"آزادی نمبر" میں ہندوستان اور پاکستان کے ادباء و شعرا کی معیاری نگارشات شامل ہیں۔

مینیجر۔ **نیا دور، کراچی نمبر ۳**

کے پتے سے براہ راست طلب کیجئے یا مقامی ایجنٹ سے حاصل کیجئے

صدیقہ بیگم سیوہاروی

ممتاز حسین

بلونت سنگھ

دیوندر اسر

احتشام حسین

خواجہ احمد عباس

صلاح الدین اکبر

اعجاز بٹالوی

جگن ناتھ آزاد

قرۃالعین حیدر